نقوش شبلی

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
رفیق اعزازی دارالمصنفین، اعظم گڑھ

نقوش شبلی

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نقوش شبلی

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
رفیق اعزازی دارالمصنّفین، اعظم گڑھ

ادبی دائرہ، اعظم گڑھ

- کتاب : نقوش شبلی
- مصنف : ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی
- ناشر : مصنف
- باراول : ۲۰۲۰ء
- مطبع : اصیلہ پرنٹرس، دہلی

NOQOOSH-E-SHIBLI

Dr. Mohammad Ilyas Azmi
azmi408@gmail.com
+919838573645

Page 320 Rs : 400/-

ISBN

- ملنے کے پتے :
- دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ، ۲۷۶۰۰۱، موبائل: ۶۳۸۶۳۲۴۴۳۷
- مکتبہ جامعہ۔ اردو بازار جامع مسجد دہلی، ۱۱۰۰۰۶، فون: ۰۱۱۲۳۲۶۰۶۶۸
- اعظمی کتاب گھر پیراڈائز ٹریولس، تکیہ، اعظم گڑھ موبائل، ۹۶۹۵۱۷۴۷۹۹

○

مرحوم دوست

ادیب، نقاد، شاعر اور ماہر تعلیم

ڈاکٹر ایم نسیم اعظمیؒ

کی نذر

○○○

از بس کہ جادہ ہائے غلط شاہراہ گشت
بے راہ رفتنم زطریق خطا نہ بود
شبلی نعمانی

ترتیب

○○○

دیباچہ

مطالعاتِ شبلی کا دائرہ جس قدر وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے، اسی قدر علامہ شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کی سیرت و شخصیت، فضل و کمال اور عظیم الشان کارناموں کے نقوش و آثار نمایاں اور روشن تر ہو کر سامنے آتے جا رہے ہیں اور یہ احساس فزوں تر ہوتا جاتا ہے کہ وہ واقعی عبقری اور نادرہ عصر تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ نہ صرف اپنے عہد کے نامور ترین عالم و مصنف، ادیب و انشا پرداز، نقاد اور سیرت نگار تھے بلکہ وہ مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ کے علم بردار، ایک بڑے مفکر و دانشور تھے۔ انہوں نے اپنی بلند پایہ تصنیفات و تالیفات سے مسلمانوں کی ذہنی و فکری بیداری میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ اہل قلم میں مستشرقین سے مقابلہ کی روایت انہیں نے قائم کی اور اپنے زور علم و تحقیق سے ان سے مسلسل نبرد آزما رہے۔ یہی نہیں وہ ہر اس شخص سے مزاحم ہوئے جو اسلام یا شعائر اسلام یا شارع اسلام پر حرف گیری کا مرتکب ہوا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے تاریخ کی طرف خصوصی توجہ کی اور اپنے عہد میں مسلمانوں کو نئی شاہراہ پر جس میں قدیم صالح اور جدید نافع کے عناصر ترکیبی شامل تھے، گامزن کرنے کی ہر ممکن سعی کی۔ ان کی ۵۷ سالہ مختصر زندگی کے آخری دس سال خاص اسی فکر مندی اور جدوجہد میں بسر ہوئے۔ ندوۃ العلماء اور دارالمصنّفین ان کے اسی دور کے دو عظیم الشان کارنامے ہیں۔ ندوہ سے وہ روشن خیال علماء اور دارالمصنّفین سے ہوش منداہل قلم پیدا کرنا چاہتے تھے تاکہ اسلام کی صاف شفاف شبیہ پر بالقصد جو گرد جمائی جا رہی ہے یا تاریخ اسلام کی روشن جبیں کو جو داغدار کیا جا رہا ہے اسے آئینہ کیا جا سکے۔ چنانچہ ان دونوں اداروں نے اس نوع سے اسلام کی بے بہا خدمات انجام دیں۔ خاص طور پر دارالمصنّفین نے وہ کارنامہ انجام دیا جس کی مثال ہندوستان تو کیا عالم اسلام میں بھی مشکل ہی سے ملے گی۔

یہ اور اس طرح کے علامہ شبلی کے دیگر مہتم بالشان کارناموں کا مطالعہ و جائزہ مولانا سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] کے بعد اہل علم کا مستقل موضوع نہ بن سکا، بلکہ علامہ شبلی جس قدر عالی رتبہ شخص تھے اور ان کے کارناموں کا دائرہ جس قدر وسیع و ہمہ گیر ہے، اس لحاظ سے ان کی فکر و نظر کی قدر و قیمت کا تعین بھی نہیں کیا جا سکا۔ راقم الحروف نے اسی احساس کے تحت اپنی کم علمی اور کم مائیگی کے باوجود شبلیات کے تشنۂ تحقیق و تصنیف پہلوؤں پر مطالعہ و تحقیق کا ایک سلسلہ قائم کیا، جس کے تحت نہ صرف متعدد کتابیں لکھیں بلکہ ہند و پاک کے موقر رسائل و جرائد میں علمی، ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین و مقالات بھی شائع کئے۔ پیش نظر کتاب انہی مضامین کا ایک مجموعہ ہے۔

اس مجموعہ میں کل ۱۸ر مضامین و مقالات شامل ہیں اور ایک کے سوا تمام مقالات علامہ شبلی کی جامع کمال شخصیت کے کسی نئے پہلو یا نئے گوشے کے مطالعہ سے متعلق ہیں اور ان میں متعدد اور متنوع جدید مطالعات و تحقیقات بھی شامل ہیں۔

علامہ شبلی کے بچپن اور تعلیم و تربیت پر ''حیات شبلی'' میں مولانا سید سلیمان ندوی نے جو کچھ لکھا ہے اب اس میں جدید تحقیقات کی بدولت کسی قدر اضافہ ہو چکا ہے۔ ضرورت تھی کہ علامہ شبلی کے بچپن اور ان کی تعلیم کا ذکر نئی معلومات اور جدید اضافات کی روشنی میں کیا جائے اور دکھایا جائے کہ اس عبقری کا بچپن کیسا تھا اور اس نے حصول علم میں کیسی جانفشانی اٹھائی تھی اور کیسا کمال حاصل کیا۔ زیر نظر کتاب میں اس موضوع پر جو مقالہ شامل ہے، اس میں اس کا بہت کچھ خیال رکھا گیا ہے۔

علامہ شبلی نے علم و ادب کا بڑا گراں مایہ سرمایہ یادگار چھوڑا ہے۔ ایک مقالہ میں ان کے متنوع سرمایہ علمی و ادبی اور تنقیدی کا تعارف پیش کیا گیا ہے۔ اس میں خاص طور پر ان کے علمی اور فکری سرمایہ کی نشاندہی کے ساتھ اس کی اہمیت بھی اجاگر کی گئی ہے۔ یہ مقالہ دار المصنفین کے سمینار ''علامہ شبلی کا علمی و فکری ورثہ'' منعقدہ مورخہ ۱۱/۱۲ر دسمبر ۲۰۱۱ء میں پیش کیا گیا تھا اور راقم کے تنقیدی مضامین کے مجموعہ ''عکس و اثر'' میں شائع ہوا تھا۔ افادیت کے پیش نظر اسے بھی زیر نظر کتاب میں شامل کر لیا گیا ہے۔

شخصیات کے حوالہ سے علامہ شبلی نعمانی کے احباب و معاصرین کے بارے میں درجنوں مقالات اہل قلم نے لکھے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں اس حوالہ سے چند نئے مطالعات شامل ہیں۔

مثلاً علامہ شبلی اور غالب۔ علامہ شبلی اور نواب محسن الملک۔ علامہ شبلی ڈپٹی نذیر احمد اور اعظم گڑھ اور علامہ اقبال وغیرہ۔ ان شخصیات کے حوالہ سے علامہ شبلی کا مطالعہ و جائزہ اولین کوشش ہے اور بلاشبہ اس میں بڑی محنت، تلاش و تحقیق اور عرق ریزی کی گئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان مطالعات سے ایک نئے منظر نامہ کے ساتھ متعدد نئے مباحث بھی سامنے آ گئے ہیں۔

علامہ شبلی اور سرسید کے حوالہ سے متعدد مقالات لکھے گئے ہیں۔ کتابوں میں بھی ان کے تعلقات پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ محمد فاروق دیوانے ''سرسید اور شبلی'' کے نام سے ایک مستقل کتاب بھی لکھی ہے۔ اس سلسلہ کی تحریروں میں بیش تر اہل قلم نے افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ کسی نے علامہ شبلی کو سرسید کا مدمقابل قرار دیا ہے تو کسی نے شبلی کو سرسید کا پروردہ بتایا ہے۔ حالاں کہ واقعہ یہ ہے کہ سرسید اگر چہ محسن شبلی تھے، تاہم شبلی کی اپنی تابانیاں بھی کچھ کم حیرت خیز نہ تھیں۔ بہر حال اس موضوع کے بعض مقالہ نگاروں نے علامہ شبلی کو علی گڑھ کا مخالف قرار دے کر حاشیہ آرائی کی اور علامہ شبلی کی علی گڑھ تحریک سے متعلق اصلاحی فکر کو ان کی مخالفانہ سرگرمیوں سے تعبیر کیا، لیکن یہ واقعہ نہیں بلکہ حقیقت یہ ہے کہ علامہ شبلی علی گڑھ کالج کے ہمیشہ خیر خواہ رہے اور اخیر تک اس کی خیر خواہی میں علی گڑھ جاتے اور طلبہ و اساتذہ سے خطاب کرتے رہے۔ جس کی تفصیلات علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور بعض دوسرے معاصر رسائل میں شائع ہوئی ہیں۔ علامہ شبلی نعمانی کا خیال تھا کہ علی گڑھ کالج جس طرح طلبہ کو بی اے اور ایم اے بناتا ہے، اسی طرح اساتذہ کو شمس العلما کرتا ہے۔ ان کا یہ بھی خیال تھا کہ علی گڑھ میں خطاب کرنا ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں سے خطاب کرنے کے برابر ہے۔ یہی نہیں ان کے دور آخر میں علی گڑھ کالج کو یونیورسٹی کا درجہ دلانے کی جو جد و جہد شروع ہوئی تھی، اس میں بھی وہ شریک رہے۔ شملہ ڈیپوٹیشن کے ایک رکن وہ بھی نامزد ہوئے تھے اور جو وفد شملہ گیا تھا اس میں بھی شامل تھے۔

علامہ شبلی نے علی گڑھ کالج کی ملازمت سے سرسید احمد خاں کی وفات کے بعد سید محمود کے زمانہ میں استعفا دیا۔ ان کے بعد نواب محسن الملک سرسید کے جانشین ہوئے۔ جن کے علامہ شبلی سے نہایت گہرے مراسم تھے اور جو اخیر تک قائم رہے۔ اس کو آج تک کسی اہل قلم نے اپنا موضوع تحقیق نہیں بنایا۔ ایک مقالہ میں پہلی بار ان دونوں کے گہرے مراسم کا بالتفصیل جائزہ پیش کیا گیا

ہے، جس سے اور باتوں کے سوا کم از کم یہ واضح ہو جاتا ہے کہ علامہ شبلی کا مضبوط تعلق سرسید کی وفات کے بعد بھی علی گڑھ کالج اور علی گڑھ تحریک سے قائم رہا۔ نواب محسن الملک جہاں دیدہ اور دوراندیش تو تھے ہی، ایک بڑے پیارے انسان بھی تھے۔ علامہ شبلی کی محبت میں وہ اس حد تک گرفتار رہے کہ مدۃ العمر انہیں علی گڑھ واپس لانے کے لئے کوشاں رہے۔ ان سے متعلق انگریزوں کی بدگمانیاں دور کیں۔ ان سے ملنے اور عیادت کرنے کے لئے اعظم گڑھ اور لکھنؤ کے سفر کئے۔ نامساعد حالات میں بھی ان کا ساتھ دیا اور دلجوئی کی۔ یہ تمام تفصیلات اس طویل مقالہ ''علامہ شبلی اور نواب محسن الملک'' میں آ گئی ہیں۔ یہی نہیں دونوں کے بعض مشترک ذہنی اور فکری رشتوں کی بھی پہلی بار کسی قدر وضاحت کی گئی ہے۔ یہ مقالہ معارف دسمبر ۲۰۱۸ء میں شائع ہوا ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی [۱۸۳۶-۱۹۱۲ء] ۱۸۷۲ء سے ۱۸۷۶ء تک اعظم گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر تعینات رہے۔ اپنا مشہور ناول توبۃ النصوح انہوں نے یہیں اعظم گڑھ میں لکھا۔ یہ علامہ شبلی کی طالب علمی کا زمانہ تھا۔ اسی دور میں دونوں میں تعلقات قائم ہوئے جو اخیر تک باقی رہے۔ یہ ناشنیدہ داستان بھی ایک مقالہ میں سنائی گئی ہے۔

اس مجموعہ میں ترتیب کے لحاظ سے مرزا غالب کا ذکر پہلے ہے اور پہلے ہونا بھی چاہئے کہ غالب آج بھی غالب ہیں اور یقین ہے آئندہ بھی وہ غالب ہی رہیں گے۔ ایک مقالہ میں شبلی و غالب کی بعض مشترک اقدار کے ذکر کے ساتھ علامہ شبلی کی غالب فہمی اور غالب شناسی کا بھی ذکر ہے۔ دراصل یہ مقالہ ڈاکٹر شعیب اعظمی کے مقالہ ''شبلی ایک منکر غالب'' کے جواب میں لکھا گیا ہے اور ثابت کیا گیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب مرحوم کا نقطۂ نظر درست نہ تھا۔ علامہ شبلی غالب کی نہ صرف انفرادیت کے قائل تھے بلکہ ان کے ایک مداح بھی تھے۔ بعض مکاتیب میں دانستہ انہوں نے غالب کا تتبع اختیار کیا۔ اسی طرح شاعری میں ان کے بعض اشعار اور مصرعے بھی اپنی نظموں اور غزلوں میں استعمال کئے اور ان کے رنگ میں رنگ ملانے کی کوشش کی ہے۔ ہاں اگر کچھ معاملہ تھا تو بس اتنا کہ علامہ شبلی ان زمینوں میں طبع آزمائی کے قائل نہ تھے، جن کے بارے میں علم ہوتا کہ

اٹھا چکے ہیں زمیں دار ان زمینوں کو

علامہ اقبال علامہ شبلی سے بیس برس چھوٹے تھے۔ علامہ شبلی نے ابتدا ہی میں جب وہ

شہرت کے آسمان پر ابھی چمکے نہ تھے، ان کی شخصیت کی اٹھان محسوس کر لی تھی اور ان کے جوہر قابل ہونے کی پیشین گوئی دہلی کے ایک مجمع عام میں کی تھی۔ دونوں کے درمیان متنوع روابط تا حیات قائم رہے۔ علامہ شبلی نے اپنے متعدد علمی اور ملی منصوبوں میں انہیں شامل کرنا چاہا اور انہیں خطوط لکھے۔ جس کی تفصیل سے حیات اقبال کے صفحات بھی خالی ہیں۔ ایک مقالہ ''اقبال: شبلی کی انجمن میں'' اس داستان کے ساتھ دونوں کی پہلی ملاقات اور ربط و تعلق کے آغاز کے سنہ کی تعیین بھی کی گئی ہے۔ ان کی پہلی ملاقات کا سنہ اہل قلم نے ۱۹۱۱ء اور جائے ملاقات ایجوکیشنل کانفرنس دہلی قرار دیا ہے۔ مگر صحیح سنہ ملاقات ۱۹۰۳ء ہے۔ اس لئے کہ اسی سال انجمن حمایت اسلام لاہور کے سالانہ اجلاس میں دونوں شریک ہوئے۔ غالبًا اسی موقع پر علامہ اقبال نے اپنی پہلی کتاب ''علم الاقتصاد'' کی زبان و بیان کی ان سے اصلاح لی۔ یہ کتاب ۱۹۰۴ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔ اس کے دیباچہ میں خود علامہ اقبال نے صراحت کی ہے کہ اس کے ایک حصہ کی زبان و بیان کی اصلاح علامہ شبلی کے قلم سے ہے۔

اس مجموعہ کا ایک مقالہ علامہ شبلی اور عطیہ فیضی کے تعلقات کے جائزے پر مشتمل ہے۔ اس فرسودہ موضوع پر متعدد اہل قلم نے خامہ فرسائی کی ہے، مگر اس کتاب میں تاریخی حقائق کی روشنی میں غالبًا پہلی بار دونوں کے تعلقات اور خیالات کا محققانہ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جو داستان گھڑی گئی اور جسے بار بار دہرایا گیا اور جسے آج بھی بعض کم نظر دہرا دیتے ہیں، وہ ایک فرضی داستان ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں اور اس میں بعض اہل قلم اور خود عطیہ فیضی کی کسی قدر ملمع سازی شامل تھی۔ اس مقالہ سے بابائے اردو مولوی عبدالحق اور منشی امین زبیری کی پھیلائی بعض غلط فہمیوں کا بھی ازالہ ہو جاتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شبلی و عطیہ کے تعلقات کا معاملہ محض اس قدر تھا کہ عطیہ فیضی علامہ شبلی کے دوست حسن علی آفندی کی چھوٹی بیٹی ذہین اور تیز طرار خاتون تھیں۔ جدید تعلیم یافتہ خواتین میں اپنے عہد میں نہایت ممتاز تھیں۔ علامہ شبلی نے ملی مفاد کے پیش نظر ان کی تربیت کرنی چاہی اور ان کی صلاحیتوں سے ملت کو فائدہ پہنچانا چاہا۔ بس اسی ذرا سی بات کو کم نظر مخالفین نے افسانہ کر دیا، لیکن یہ افسانہ تاریخی حقائق کی میزان نقد پر کھرا نہیں اترتا، بلکہ اس کی حیثیت محض افسانہ ہی ثابت ہوتی ہے۔

عہد شبلی میں مشہور انشا پرداز مہدی افادی علامہ شبلی کے بڑے شیدائی اور ان کی ہر ادا پر فدا تھے۔ خاص طور پر وہ علامہ شبلی کے ادب و انشا کے بے حد مداح تھے، لیکن وہ جدید تعلیم یافتہ طبقہ سے تعلق رکھتے تھے۔ ہمارے عہد میں شیخ الحدیث مولانا محمد یونس جونپوریؒ [۱۹۳۷-۲۰۱۷ء] بھی علامہ شبلی کے بڑے مداح اور عقیدت کیش تھے بلکہ علمائے دیوبند میں اتنا بڑا شاید ہی کوئی اور مداح شبلی گذرا ہو۔ وہ علامہ شبلی کو عبقری اور انقلابی شخصیت قرار دیتے تھے۔ ان کی تصنیفات بالخصوص سیرۃ النبیؐ اور الفاروق کی بڑی تحسین وستائش فرماتے اور انہیں بے نظیر کتابیں قرار دیتے تھے۔ یہی نہیں وہ روایت و درایت پر علامہ شبلی کے رد وقدح کے بھی حامی تھے۔ ایک مقالہ میں ان کی شبلی شناسی کا حال، ان کے اقوال اور افکار وخیالات کی روشنی میں پیش کیا گیا ہے۔

علامہ شبلی تقریباً تین برس ۱۹۰۳-۱۹۰۵ء تک انجمن ترقی اردو کے سکریٹری رہے اور بڑی وقیع خدمات انجام دیں۔ چوں کہ ان کے بعد مختصر مدت کے لئے مولوی حبیب الرحمٰن شروانی اور مولوی عزیز مرزا انجمن کے سکریٹری ہوئے، بعد ازاں اس کی نظامت بابائے مولوی عبدالحق کے ہاتھوں میں آئی۔ انہوں نے قصداً علامہ شبلی کی کاوشوں سے صرف نظر کیا۔ حالاں کہ انجمن کے حوالہ سے علامہ شبلی کے اتنے کام ہیں کہ ان پر ایک مستقل کتاب لکھی جاسکتی ہے۔ ایک مقالہ میں ذکر اقبال کے ساتھ اس داستان کا کچھ حصہ بھی قلم بند ہوگیا ہے۔ ظاہر ہے اس سے تشنگی اور بڑھے گی، مگر اس کا مکمل احاطہ چوں کہ ایک کتاب ہی سے ہوسکتا ہے اس لئے اسے کسی اور وقت کے لئے اٹھا رکھا گیا ہے۔ ممکن ہے کوئی اور شخص مجھ سے بہتر طور پر اس کا حق ادا کر سکے۔

البتہ عہد شبلی کی ایک اور انجمن، انجمن حمایت اسلام لاہور سے بھی علامہ شبلی کا تعلق تھا۔ وہ اس کے کئی سالانہ اجلاسوں میں شریک ہوئے۔ اجلاس کی صدارت کی اور بڑے اہم موضوعات پر خطبات دیئے۔ اس کی تفصیل انجمن حمایت اسلام لاہور کی رودادوں میں جابجا موجود ہے۔ لیکن ان کی مفصل سوانح عمری ''حیات شبلی'' کے اوراق اس کی تفصیلات سے خالی ہیں۔ چنانچہ پہلی بار ایک مقالہ میں اس کی تفصیلات یکجا کی گئی ہیں۔ یقین ہے اس اچھوتے پہلو کے مطالعہ سے علامہ شبلی کی ایک اور ملی خدمت کا علم قدر دانان شبلی کو ہوگا۔

ملک کے مختلف اہم شہروں اور ان کے اہل علم، ادباء وشعراء اور وہاں کی علمی و ادبی

انجمنوں سے علامہ شبلی کے گہرے روابط تھے۔علی گڑھ، بمبئی، حیدرآباد، بھوپال، الہ آباد اور بعض دوسرے شہروں کے حوالہ سے ان پر اہل قلم نے متعدد مقالات لکھے ہیں۔البتہ کلکتہ سے ان کے گہرے مراسم کو نظر انداز کر دیا گیا اور اس سے متعلق کوئی تحریر شائع نہیں ہوئی۔حالاں کہ کلکتہ اور وہاں کے اہل علم، علمی اداروں، خاص طور پر ایشیا ٹک سوسائٹی کے تو وہ رکن رکین ہی تھے۔کلکتہ سے ان کے ربط وضبط، اس کے اسفار اور اس کے اسباب وغیرہ کی تفصیل ایک مقالہ ''علامہ شبلی اور کلکتہ'' میں سپرد قلم کی گئی ہے۔شبلی وآزاد کے تعلقات سے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔ان کے علاوہ بھی کلکتہ کی متعدد اہم شخصیات کا ذکر اس مقالہ میں آ گیا ہے۔ایشیا ٹک سوسائٹی کے حوالہ سے اس بات کا بھی ذکر ہے کہ علامہ شبلی نے اپنے دو خاص دوستوں حبیب الرحمٰن شروانی اور نواب سید علی حسن خاں کے نام ایشیا ٹک سوسائٹی کی رکنیت کے لئے پیش کئے اور دونوں منتخب ہوئے۔

علامہ شبلی نے تحریک ندوہ میں اس قدر سرگرم حصہ لیا کہ اس کے ایک بنیاد گذار قرار پائے اور پھر دارالعلوم ندوہ کے قیام واستحکام کے لئے نو برس[۱۹۰۴-۱۹۱۳ء] تک انہوں نے جو مثالی جدو جہد کی اور جس طرح اسے عالم گیر شہرت عطا کی، وہ بس انہیں کا کارنامہ ہے۔تاریخ ندوہ میں انہیں بالقصد فراموش کر دینے کے باوجود آج تک علامہ شبلی کے ندوہ سے پوری ملت واقف ہے۔اسی طرح کی جدو جہد انہوں نے اوائل زندگی میں نیشنل اسکول موجودہ شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ کے قیام واستحکام کے لئے بھی کی تھی۔علی گڑھ کالج سے وابستگی کے محض پانچ ماہ بعد جون ۱۸۸۳ء میں انہوں نے اعظم گڑھ میں نیشنل اسکول کی بنیاد رکھی اور ۱۹۰۱ء تک یعنی حیدرآباد جانے سے پہلے تک وہ اس کی ذمہ داری اپنے سر لئے اور نبھاتے رہے۔اس کے لئے انہوں نے اپنی اور اپنے اعزہ کی زمینیں وقف کیں۔اچھے اساتذہ کا انتخاب وانتظام کیا۔عمارتیں تعمیر کرائیں۔طلبہ کی نگرانی کی اور اسے معمولی اسکول سے ہائی اسکول تک پہنچا دیا۔اس وقت ضلع اعظم گڑھ میں ایک مشنری اسکول [ویسلی انٹر کالج] کے سوا کوئی اسکول نہیں تھا، جہاں مسلمان آزادانہ تعلیم حاصل کر سکتے۔علامہ شبلی کے نیشنل اسکول نے اس بڑی کمی کو پورا کیا اور آج بھی وہ مشرقی یوپی کے مسلمانوں کا سب سے بڑا تعلیمی ادارہ ہے اور نامساعد حالات کے باوجود وہ مسلمانوں کی علمی وتعلیمی تشنگی بجھا رہا ہے۔خطہ اعظم گڑھ کی تعلیمی بیداری میں اس کا بڑا اہم حصہ ہے۔افسوس اس کے عظیم الشان ماضی کی تابناک

تاریخ اب تک سپرد قلم نہ کی جاسکی اور نہ کوئی ایسا شخص نظر آرہا ہے جو اس کمی کو پورا کر سکے۔۱۸۹۴ء میں اس کے سالانہ اجلاس کے موقع پر طلبہ اور ذمہ داران کی موجودگی میں کسی ممتاز شخص کو سپاس نامہ پیش کیا گیا تھا۔ یہ سپاس نامہ روزنامہ الوقت گورکھپور [مدیر: احسان اللہ عباسی] میں شائع ہوا تھا جو مطالعہ کے دوران ماہر سرسید پروفیسر اصغر عباس صاحب کو ملا تھا۔ انہوں نے ازراہ محبت میرے حوالہ کیا۔ چنانچہ میں نے اسے ضروری نوٹ کے ساتھ ماہنامہ تہذیب الاخلاق میں شائع کرادیا تھا۔ افادیت کے پیش نظر اسے بھی زیرنظر مجموعہ میں شامل کرلیا گیا ہے۔

اس سپاس نامہ سے اندازہ ہوگا کہ ۱۸۹۴ء میں یعنی سوا سو سال پہلے نیشنل اسکول کے حوالہ سے علامہ شبلی کے کیا حوصلے اور کیا عزائم تھے۔ یہ روداد یا سپاس نامہ اگرچہ علامہ شبلی کے بھائی مولوی محمد اسحاق وکیل ہائی کورٹ الہ آباد کی طرف سے چھپا ہے، تاہم اسلوب نگارش صاف چغلی کھا رہا ہے کہ یہ علامہ شبلی ہی کے قلم کا پرتو ہے۔

۱۹۴۳ء میں ''حیات شبلی'' کی تکمیل کے بعد جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی اس کی دوسری جلد لکھنے کے بھی آرزومند تھے، مگر حالات کی ناسازگاری سے اس کا موقع نہ مل سکا۔ ۱۹۵۸ میں پروفیسر غلام مصطفیٰ خاں مرحوم سابق صدر شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی نے خواب دیکھا کہ مولانا سید سلیمان ندوی فرما رہے ہیں کہ ''حیات شبلی'' کی دوسری جلد تم مکمل کردو۔ چنانچہ انہوں نے اس خواب کی تعبیر کے طور پر اپنے شاگرد پروفیسر سید سخی احمد ہاشمیؒ استاد شعبہ اردو سے پی، ایچ ڈی۔ کا مقالہ ''شبلی کا ذہنی ارتقاء'' قلم بند کرایا۔ پروفیسر ہاشمی نے یہ مقالہ انتہائی محنت و تحقیق سے لکھا۔ اس کے لئے انہوں نے نہ صرف مصادر کھنگالے بلکہ ہندوستان کے مختلف شہروں کا سفر بھی کیا۔ علامہ شبلی کے بعض تلامذہ سے ملاقات کی۔ نیز ان اہل قلم اور ارباب کمال سے بھی ملے جن کی علامہ شبلی کی شخصیت اور فکر ونظر پر نگاہ تھی۔ سندھ واپس جانے کے بعد خط و کتابت کے ذریعہ وہ علامہ شبلی کی شخصیت اور ان کے کام کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش میں مصروف رہے۔ اس سلسلہ کے آٹھ خطوط انہوں نے وفات سے پہلے اپنے شاگرد اور معروف آزاد شناس ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری کے حوالہ کردیئے تھے۔ گذشتہ دنوں ہمارے کرم فرما، محبّ مکرم شبیر احمد میواتی صاحب نے ڈاکٹر ابو سلمان شاہ جہاں پوری کے مشورہ سے وہ خطوط مجھے بھیجے۔ یہ خطوط شبلیات کے نہایت وقیع

مباحث پر مشتمل ہیں۔ان کے مکتوب نگار بھی ہماری ادبی تاریخ میں بڑے بلند رتبہ ہیں۔اس لئے راقم نے ان غیر مطبوعہ خطوط کو ضروی تعلیقات وحواشی کے ساتھ ایک مقالہ میں جمع کر دیا ہے۔یہ مقالہ سہ ماہی فکر وتحقیق دہلی میں شائع ہوا تھا۔وہ بھی اس کتاب کی زینت ہے۔ان غیر مطبوعہ خطوط کے مکتوب نگاروں میں ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی (شبلی:ایک دبستان) ڈاکٹر ابن فرید (شبلی چوں بہ خلوت می رود) پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی (شبلی اور بمبئی۔شبلی اردو کے بہترین انشا پرداز) کے علاوہ خواجہ حمید الدین شاہد ایڈیٹر سب رس حیدرآباد، مولوی حسین احمد زبیری مارہروی اور پروفیسر ہارون خاں شروانی کے نام قابل ذکر ہیں۔راقم نے اس کے حواشی میں خاصی محنت وتحقیق کی ہے۔

علامہ شبلی کی وفات ۱۸؍نومبر۱۹۱۴ء کے بعد ان کی تحریروں کی جمع وتدوین کا لائق فخر کارنامہ ان کے قابل فخر جانشین مولانا سید سلیمان ندوی نے انجام دیا اور جہاں تک ممکن تھا ایک ایک حرف تلاش کر کے شائع کر دیا۔ان میں ’’مقالات شبلی‘‘ کی آٹھ جلدیں، ’’مکاتیب شبلی‘‘ کی دو جلدیں اور اردو و فارسی کلیات شامل ہیں۔’’شعر العجم‘‘ کا پانچواں حصہ بھی انہی نے شائع کیا۔ ’’خطبات شبلی‘‘ کی ایک جلد مولانا عبدالسلام ندوی نے مرتب کی تھی۔بعدازاں مشتاق حسین مرحوم مولانا آزاد لائبریری، علی گڑھ نے ’’باقیات شبلی‘‘ شائع کی۔سوسال بعد دریافت ہونے والی تحریروں کی جمع وتدوین واشاعت کی سعادت راقم الحروف کا مقدر بنی۔چنانچہ علامہ شبلی کی نادر تحریروں کا مجموعہ ’’نوادرات شبلی‘‘، نادر مکتوبات کا مجموعہ ’’مکتوبات شبلی‘‘، علمی وادبی مراسلات کا مجموعہ ’’مراسلات شبلی‘‘ اور ماہنامہ الندوہ کے شذرات کا مجموعہ ’’شذرات شبلی‘‘ راقم گذشتہ چند برسوں میں مرتب ومدون کر کے شائع کرا چکا ہے۔علاوہ ازیں ایک کتاب میں علامہ شبلی پر لکھی جانے والی منظومات کو ’’شبلی سخنوروں کی نظر میں‘‘ کے عنوان سے طبع کرایا ہے۔علامہ شبلی کی تمام تصنیفات و تالیفات اور تراجم کا مفصل تعارف وتجزیہ ’’آثار شبلی‘‘ میں پیش کر چکا ہے۔اس مفصل کتاب کو دارالمصنّفین نے ۲۰۱۳ء میں بڑے اہتمام سے شائع کیا۔بحمد اللہ اس نے بڑی مقبولیت پائی۔

راقم نے ’’کتابیات شبلی‘‘ کے علاوہ علامہ شبلی کے نام لکھے جانے والے مکاتیب کو بھی ایک کتاب ’’علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط‘‘ میں جمع کر چکا ہے۔نئے مطالعات وتحقیقات پر

مشتمل مقالات کے دو مجموعے ''متعلقاتِ شبلی'' اور ''شبلی اور جہانِ شبلی'' بھی پیش کر چکا ہے۔ گذشتہ دنوں علامہ شبلی کی تعزیتی تحریروں کا مجموعہ بھی راقم کی جمع و ترتیب کے بعد دارالمصنّفین نے قدر دانانِ شبلی کی خدمت میں پیش کر دیا ہے۔ یہ تمام تحقیقی کتابیں ذخیرہ شبلیات میں گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتی ہیں اور بلاشبہ ان سے مطالعہ شبلی کو وسعت و فروغ ملا ہے۔ تعجب ہے کہ اس قدر تلاش و تحقیق اور جمع و تدوین کے باوجود نوادرِ شبلی کی دریافت کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ چنانچہ گذشتہ چند مہینوں میں متعدد غیر مدون اور غیر مطبوعہ تحریریں دریافت ہوئیں اور بلاشبہ بڑی اہم اور وقیع تحریریں دریافت ہوئی ہیں۔ غیر مدون تحریروں پر مشتمل راقم کا ایک مقالہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ (مارچ: ۲۰۱۹ء) میں شائع ہو چکا ہے، جس میں آٹھ غیر مدون تحریریں شامل ہیں۔ اس میں علامہ شبلی کی چند متفرق تحریروں کے ساتھ دو اہم خطوط اور انجمن ترقی اردو کا دستور العمل بھی شامل ہے۔ جس کی دریافت اور اشاعت دارالمصنّفین کے ڈائرکٹر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب کا کارنامہ ہے۔ یہ معلومات افزا مقالہ بھی اس کتاب کی زینت میں اضافہ کا باعث ہے۔

غیر مطبوعہ تحریروں میں علامہ شبلی کے نو دریافت ۳۶ رخطوط کا ذکر ضروری ہے۔ اس میں ۲۹ رخطوط علامہ شبلی کے صاحبزادے حامد حسن نعمانی کے نام ہیں۔ تین خطوط مولوی محمد اسحاق وکیل ہائی کورٹ الہ آباد کے نام۔ ایک خط میر ولایت حسین کے نام اور تین خطوط پروفیسر زماں مہدی کے نام ہیں۔ ایک مقالہ میں ان خطوط کو ضروری تعلیقات و حواشی کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے۔ علامہ شبلی پر کسی کتاب میں اگر خود ان کے نقوش و آثار شامل ہو جائیں تو اس کی افادیت پر کون شبہ کر سکتا ہے۔ اس کتاب کو یہ شرف بھی حاصل ہے۔

محمد حامد حسن نعمانی علامہ شبلی نعمانی کے اکلوتے فرزند تھے۔ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ تحصیلداری کا امتحان پاس کر کے تحصیل دار مقرر ہوئے اور مختلف شہروں میں تعینات رہے۔ ان کے نام علامہ شبلی کے ۲۹ رخطوط کے عکس ان کے داماد کیپٹن سہیل سلطان سے ملے ہیں۔ افسوس خانوادہ شبلی کی یہ یادگار بھی دفعتاً مٹ گئی اور کیپٹن [ر] سہیل سلطان کراچی میں ۲۳ ردسمبر ۲۰۱۸ء کو راہی ملک عدم ہوئے۔ انا للہ و انا الیہ راجعون.

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے اور غریق رحمت کرے۔

غیر مطبوعہ مکتوبات کے علاوہ سہیل سلطان مرحوم نے علامہ شبلی کی ایک اور حامد حسن نعمانی کی دو نادر تصویریں بھی فراہم کیں۔ خانوادہ شبلی کے خانگی احوال وکوائف بھی وہ جمع کر کے فراہم کرنے والے تھے، لیکن ان کی وفات سے یہ سلسلہ اور ذریعہ ختم ہو گیا۔ تاہم انہوں نے جو کچھ فراہم کر دیا ہے وہ شبلی شناسی میں بے حد وقیع سرمایہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یقین ہے نو دریافت خطوط سے شبلی شناسی کے نئے پہلو سامنے آئیں گے اور نئے مطالعات کا آغاز ہوگا۔

حامد حسن نعمانی کے نام نو دریافت خطوط زیادہ تر ان کی تعلیمی اور طالب علمانہ زندگی سے متعلق ہیں۔ ان میں دیگر تفصیلات کے ساتھ ان کی تعلیم وتربیت کے لئے علامہ شبلی کی فکر مندی، نظم وانتظام، علاج ومعالجہ اور ذاتی احوال وکوائف کا زیادہ ذکر ہے۔ غالبًا اسی وجہ سے یہ خطوط ''مکاتیب شبلی'' میں شامل نہ ہو سکے تھے۔ بہر حال نج کے یہ خطوط بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ خطوط بھی اس کتاب کی زینت ہیں۔

اس کتاب میں تین مقالات قدرے نئے انداز کے شامل کئے گئے ہیں۔ پہلے مقالہ تصانیف شبلی کے دو دہلوی ناشرین میں سید ظہور الحسن موسوی مالک قومی پریس دہلی اور سید قربان علی بسمل دہلوی مالک شاہ جہانی پریس دہلی کا تعارف اور ان کی ادبی خدمات کا ذکر ہے۔ نیز تصانیف شبلی کی طبع واشاعت سے متعلق ان کی سرگرمیوں کا بیان ہے۔ تعجب ہے کہ یہ دونوں بزرگ اہل قلم تھے۔ ادیب تھے۔ شاعر تھے۔ مصنف تھے۔ ناشر تھے۔ اخبار ورسائل کے مدیر تھے۔ باوجود اس کے دونوں کے حالات کہیں دستیاب نہیں۔

دوسرے مقالہ ''جہان شبلی'' میں علامہ شبلی کی ان کتب ورسائل اور ان کی طباعتوں اور اشاعتوں کا ذکر ہے جو ''کتابیات شبلی'' [مطبوعہ: ۲۰۱۱ء] کی ترتیب واشاعت کے زمانہ میں نہیں مل سکے تھے اور حال میں دستیاب ہوئے ہیں۔ اس میں تصانیف شبلی کی بعض نئی تلخیصات اور نئے تراجم کا ذکر ہے۔ علاوہ ازیں مولانا ظفر علی خاں کی ایک نادر نظم بھی شامل ہے جو انہوں نے علامہ شبلی کو شمس العلماء کا خطاب ملنے پر علی گڑھ کالج کی ایک تہنیتی تقریب میں پیش کی تھی اور جو حال میں مظہر محمود شیرانی مرحوم کے اثاثہ سے نامور مصنف ومحقق جناب احمد سعید صاحب لاہور کو ملی تھی۔

تیسرے مقالہ میں دو مراسلات کو جو ماہنامہ معارف میں لکھے گئے تھے یکجا کیا گیا ہے۔

پہلے مراسلہ میں تصانیف شبلی کے نو دریافت تراجم کی تفصیل ہے، جبکہ دوسرے مراسلہ میں محمد امین زبیری سے متعلق ایک بنیادی غلط فہمی کی تصحیح کی گئی ہے۔

کتاب کا آخری مقالہ ''مطالعۂ شبلی کے چند زاویے'' ہے۔ اس میں قدرے تفصیل سے علامہ شبلی سے متعلق ان موضوعات کی نشاندہی کی گئی ہے، جن کا مطالعہ ہنوز تشنۂ تحقیق وتصنیف ہے۔ نیز شبلی شناسی سے متعلق جو علمی، ادبی، تعلیمی، تنقیدی اور سوانحی کام انجام پا چکے ہیں ان کی اہمیت اور حیثیت بھی زیر بحث آئی ہے اور واضح کیا گیا ہے کہ اس سلسلہ کا کون سا ایسا گوشہ اور پہلو ہے جس کا مطالعہ و جائزہ ابھی باقی ہے۔ اس سے شبلی شناسوں بالخصوص یونیورسٹیوں کے طلبائے تحقیق کو موضوعات کی تعیین و تحقیق میں بھی مدد ملے گی اور اس سے مطالعۂ شبلی کا دائرہ بھی وسیع ہوگا۔

بحیثیت مجموعی اس مجموعہ میں علامہ شبلی کی شخصیت کے متنوع اور گوناگوں نئے پہلوؤں کا ذکر آ گیا ہے۔ اس سے خاص طور پر نو دریافت اطراف و جہات شبلی کی وسعت اور اہمیت کے متنوع پہلو نگاہوں میں آتے ہیں۔ یقین ہے فکر شبلی کی تفہیم و ترسیل میں یہ مجموعہ نہ صرف معاون اور مفید ثابت ہوگا بلکہ دائرۂ شبلیات میں ایک اضافہ قرار پائے گا۔

یہاں مقطعے میں ایک سخن گسترانہ بات کہنے کو جی چاہتا ہے۔ جب میں ایم اے کا طالب علم تھا تو خصوصی مطالعہ کے لئے غالب کی بجائے حالی کا انتخاب کیا تھا، جسے احباب نے کور ذوقی سے تعبیر کیا تھا۔ ذرا شعور بالیدہ ہوا تو علامہ شبلی کا انتخاب کر بیٹھا اور پھر زندگی کی قیمتی ساعتیں ان کی نذر کر دیں۔ اور اب عہد حاضر میں نظر کہیں ٹھہرتی ہے تو وہ آبروئے اردو جناب شمس الرحمٰن فاروقی کی ذات گرامی ہے۔ ان کی گراں قدر اور عظیم الشان ادبی وتنقیدی کاوشیں ہماری ادبی وتنقیدی تاریخ کا قیمتی اور لازوال سرمایہ ہیں، جنھیں کبھی فراموش نہیں کیا جا سکے گا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالی فاروقی صاحب کا سایۂ شفقت تادیر قائم رکھے۔

میری گذشتہ کتاب ''شبلی: خودنوشتوں میں'' پر فاروقی صاحب نے بطور پیش لفظ جو چند سطریں قلم برداشتہ لکھ دی تھیں، اس نے شبلی کے قدردانوں کو خاصا متاثر کیا ہے اور بلاشبہ وہ بے حد اہم اور وقیع تحریر ہے۔ مکمل شبلی کی بازیافت میں محترم فاروقی صاحب کی یہ گراں مایہ تحریر اہل علم کو ہمیشہ مہمیز اور متحرک کرتی رہے گی۔ یہ ایک لافانی تحریر ہے۔

کتاب کی تکمیل پر میں اپنے رب کریم کا بے حد شکر بجالاتا ہوں کہ اس نے مجھے ایک اور کتاب پیش کرنے کی توفیق بخشی کہ اس کی مرضی کے بغیر ادنی پتے بھی جنبش نہیں کرتے۔

اس خوشی کے موقع پر اپنے احباب اور بزرگوں کا شکریہ ادا کرنا اخلاقی فرض ہے۔سب سے پہلے میں اپنے محسن اور دارالمصنّفین کے ڈائرکٹر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب اور استاذ گرامی ڈاکٹر فخرالاسلام اعظمی صاحب کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ یہ دونوں بزرگ زندگی کی ہر شاہراہ پر دلجوئی، دلنوازی اور حوصلہ افزائی کے لئے موجود رہتے ہیں۔اللہ تعالی ان کا سایہ شفقت تادیر قائم رکھے۔گرامی قدر پروفیسر خورشید نعمانی کا ذکر بھی ان اوراق میں انتہائی ضروری خیال کرتا ہوں۔میری علمی وادبی زندگی میں ان کے بڑے احسانات ہیں۔اللہ تعالی ان کو صحت و تندرستی اور لمبی عمر عطا فرمائے۔

میں اپنے دیرینہ کرم فرما، برادر گرامی حافظ عمیر الصدیق ندوی دریابادی رفیق دارالمصنّفین اعظم گڑھ کا بھی ممنون احسان ہوں کہ اس سلسلہ شبلیات کے وہ پہلے دن سے موئید و مددگار رہے ہیں۔متعلقات شبلی انہیں کی بدولت شائع ہوئی تھی۔انہوں نے اس سلسلہ کے کئی مقالات کو ماہنامہ معارف میں شائع کر کے میرا حوصلہ بڑھایا ہے۔اللہ تعالی انہیں صحت وتندرستی سے نوازے۔

علمی تعاون کے لئے میں اپنے تمام احباب بالخصوص حکیم وسیم احمد اعظمی صاحب [لکھنو]، ڈاکٹر سلمان سلطان صاحب [اعظم گڑھ]، ڈاکٹر مختار شمیم صاحب [بھوپال] ڈاکٹر عطا خورشید [علی گڑھ] ڈاکٹر سید مسعود حسن [پٹنہ]، پروفیسر احمد سعید [لاہور] جناب شبیر احمد میواتی [لاہور]، ڈاکٹر عمیر منظر [لکھنو] اور برادرم ڈاکٹر شاہنواز فیاض [دہلی] کا بے حد شکرگذار ہوں کہ انہوں نے علم دوستی کے ساتھ ہر موقع پر حق تعلق بھی نبھایا۔اللہ انہیں جزائے خیر دے۔

ہمارے دوست جاوید میاں صاحب مالک اصیلہ آفسیٹ پرنٹرس دہلی نے اس کتاب کی طباعت کا ذمہ لے کر مجھ پر بڑا احسان کیا ہے۔اللہ تعالی انہیں اجر جزیل عطا فرمائے اور صحت وتندرستی کی دولت سے نوازے۔اور کورونا کی وبا سے پورے خانوادے کو محفوظ رکھے۔

اس مجموعہ مضامین کا انتساب عزیز دوست،ادیب،نقاد،شاعر اور ماہر تعلیم ڈاکٹر ایم نسیم اعظمی مرحوم کی یادوں کے نام ہے۔نسیم اعظمی کے انتقال سے مجھے ذاتی طور پر بہت دکھ ہوا،مگر مرضی

مولیٰ ہمہ اولیٰ۔ اللہ تعالی ان کی مغفرت فرمائے اور جنت نعیم سے سرفراز کرے۔

میں اپنی اہلیہ شائستہ ریاض فلاحی، بیٹی عفت جہاں (M.Sc. Math) عشرت جہاں [عالمہ] اور بیٹے محمد عثمان الیاس [بی ٹیک]، محمد علی عادل اور حافظ محمد حسن الیاس کے لئے خاص طور پر دعا گو ہوں۔ اللہ تعالی میرے بچوں کو صحت وتندرستی اور دینی و دنیوی برکات وترقیات سے نوازے۔ انہوں نے بہت سی سہولتیں فراہم کیں اور مجھے راحت وآرام پہنچانے کی ہر ممکن سعی کی ہے۔ کمپوزنگ کے لئے حافظ قمر عباسی کا بھی شکر گذار ہوں۔

محمد الیاس الاعظمی

ادبی دائرہ اعظم گڑھ

مورخہ ۲؍جولائی ۲۰۲۰ء

○○○

[۱]

علامہ شبلی کا بچپن اور تعلیم

علامہ شبلی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کا شمار عالم اسلام کے ممتاز ترین اہل علم اور ارباب کمال میں ہوتا ہے۔ وہ زندگی بھر علم و ادب اور دین وملت کی خدمت کرتے رہے۔ اسلام کی اشاعت اور اس کی ترقی کے لئے بہت سی کتابیں لکھیں۔ ان میں الفاروق، شعرالعجم اور سیرۃ النبی دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ وہ ایم.اے.او.کالج علی گڑھ [مسلم یونیورسٹی] میں سولہ برس [۱۸۸۳-۱۸۹۸ء] تک استاد رہے۔ وہاں عربی و فارسی کے ساتھ قرآن مجید بھی پڑھاتے رہے۔ ان سے بہت سے طلبہ نے قرآن مجید ترجمہ کے ساتھ پڑھا۔ ان میں امام حریت مولانا محمد علی جوہر [۱۸۷۸-۱۹۳۱ء] کا نام بہت مشہور ہے اور وہ اس کا برملا اعتراف بھی کیا کرتے تھے۔

علامہ شبلی تعلیم اور اصول تعلیم کے بھی بڑے ماہر تھے۔ ندوۃ العلماء اور جامعہ عثمانیہ کا نصاب تعلیم انہیں نے بنایا تھا۔ ریاست بھوپال کے مدارس کی تنظیم نو انہیں نے کی تھی۔ ان کی اسی مہارت کی بنا پر انہیں ندوہ کا معتمد تعلیم مقرر کیا گیا تھا۔ ندوہ میں وہ درسی کتابیں تو پڑھاتے ہی تھے، قرآن و حدیث کا درس بھی وقتاً فوقتاً دیتے تھے۔ یہاں ان سے بہت سے طلبہ نے دین کی تعلیم حاصل کی اور اس میں بڑی مہارت پیدا کی اور پھر اسلام کے خدمت گذار بنے۔ ان میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا عبدالباری ندوی فلسفی، مولانا عبدالرحمٰن نگرامی اور مولانا شبلی متکلم وغیرہ کے نام خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

علامہ شبلی نعمانی بہت بڑے ادیب اور انشاپرداز تھے۔ ان کا شمار اردو کے معماروں میں کیا جاتا ہے۔ وہ اردو، عربی اور فارسی تینوں زبانوں پر عبور رکھتے تھے اور ان میں شاعری بھی کرتے تھے۔ ان کا اردو و فارسی کا کلیات شائع ہو چکا ہے۔ ان کی دو ادبی اور تنقیدی کتابیں موازنہ انیس و

دبیر اور شعرالعجم بہت مشہور ہیں۔شعرالعجم کا فارسی زبان میں ترجمہ ایران اور افغانستان میں چھپا ہے۔ان کتابوں کو پڑھ کر نہ صرف مذاق سخن پیدا ہوا بلکہ بہت سے لوگ ادیب اور انشا پرداز بنے۔

علامہ شبلی جدید تحقیق کے مطابق ۴ر جون ۱۸۵۷ء کو ضلع اعظم گڑھ کے ایک گاؤں بندول میں پیدا ہوئے۔ان کے والد شیخ حبیب اللہ اعظم گڑھ کے مشہور وممتاز وکیل اور زمیندار تھے۔وہ ایک بزرگ الٰہی شاہ کے مرید بھی تھے۔نماز وروزہ کے بڑے پابند تھے۔رفاہ عام کے کاموں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔سب کے کام آتے تھے۔غریبوں کی مدد کرتے۔علامہ شبلی کی والدہ قائمہ بی بی بھی بہت نیک دین دار اور تہجد گذار خاتون تھیں۔تہجد کے لئے اٹھتیں تو اپنے لاڈلے کو بھی جگا دیتیں اور وہ اٹھ کر نماز پڑھتے اور تلاوت کرتے۔قائمہ بی بی نے علامہ شبلی کو بچپن میں سویرے اٹھنے کی جو عادت ڈالی اس سے انہیں سویرے اٹھنے کی ایسی عادت پڑی کہ پھر کبھی نہیں چھوٹی۔وہ ہمیشہ سویرے اٹھتے، نماز پڑھتے، تلاوت کرتے اور پھر لکھنے پڑھنے میں مشغول ہو جاتے اور دو گھنٹہ تک مسلسل لکھتے پڑھتے رہتے تھے۔

ان کے گھر میں تعلیم کا ماحول تھا۔دادا حسن علی، والد شیخ حبیب اللہ اور چچا شیخ عجیب اللہ وغیرہ سب اپنے زمانہ کے تعلیم یافتہ تھے۔علامہ شبلی نے خود لکھا ہے کہ ''خاندان میں علم کا چرچا تھا اور تمام بزرگ مصروف علم تھے۔'' ان کے والد فارسی زبان وادب پر درک رکھتے تھے اور ان کا ادبی ذوق بہت بلند تھا۔علامہ شبلی نے شعرالعجم میں ایک جگہ ان کے ادبی مذاق کا ذکر کیا ہے۔اسی ماحول کا اثر تھا کہ علامہ شبلی میں بھی علمی مذاق پیدا ہوا اور جو ہمیشہ باقی رہا۔ان کی ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ذرا بڑے ہوئے تو انہیں حکیم مولوی عبداللہ جیراج پور کے پاس پڑھنے کے لئے بھیجا گیا۔حکیم صاحب بندول کے پڑوسی گاؤں جیراج پور کے رہنے والے تھے۔علامہ شبلی بلا ناغہ ان سے پڑھنے جاتے۔خوب محنت سے پڑھتے تھے۔ابتدائی کتابیں انہیں سے پڑھیں۔ان میں بچپن سے آثار کمال پائے جاتے تھے۔ایک بار رات میں ایک بجے وہ مکان کے ایک گوشے میں بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔ان کے استاد نے پوچھا کہ اتنی رات کو کیا کر رہے ہو۔؟ بتایا کہ قطعۂ تاریخ لکھ رہا ہوں۔حالاں کہ یہ ان کا بچپن تھا۔

مولانا شبلی بچپن ہی سے بڑے محنتی اور ذہین تھے۔ایک بار وہ آنگن میں سو رہے تھے اور

گھر کے لوگ انہیں سائبان میں لے جانا چاہتے تھے اور وہ نہیں جاتے تھے۔ کسی نے کہا اٹھو اٹھو پانی برسے گا۔شبلی نے فوراً جواب دیا کہ چاند تو نکلا ہے پانی کیسے برسے گا۔اس پر لوگ ہنس پڑے۔

کچھ اور بڑے ہوئے تو وہ درسی کتابوں کے علاوہ غیر درسی کتابیں بھی پڑھنے لگے۔ فرصت کے اوقات میں شہر اعظم گڑھ کے ایک کتب فروش کی دوکان پر چلے جاتے اور وہاں شعرا کے دواوین پڑھتے۔حافظہ بہت اچھا تھا، اس لئے اچھے اشعار ان کو زبانی یاد ہو جاتے تھے۔حکیم عبداللہ جیراج پوری سے پڑھنے کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور گئے اور مولانا محمد فاروق چریا کوٹی سے درس نظامی کی تمام اہم کتابیں پڑھیں اور دینی علوم میں بڑی مہارت پیدا کی اور ایک بڑے عالم بنے۔خود مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ ''میں نے معقولات کی تمام کتابیں مثلاً میر زاہد، ملا جلال مع میر زاہد، حمد اللہ، شرح مطالع، صدرا، شمس بازغہ انہیں سے پڑھیں اور میری تمام تر کائنات ان ہی کے افادات ہیں۔فارسی کا مذاق بھی انہیں کا فیض ہے۔''

[الندوہ اکتوبر ۱۹۰۹ء، ص۲]

مولانا فاروق چریا کوٹی شاعر بھی تھے۔ان ہی کی صحبت میں علامہ شبلی کی ذات میں شاعری کا ذوق پروان چڑھا اور شعر کہنے لگے۔ایک دن وہ ننگے سر بیٹھے تھے۔اتفاق سے مولانا فاروق چریا کوٹی ادھر سے گذرے تو ان کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی اور کہا کہ

ہے گا چپت گاہ خلائق یہ سر

مولانا شبلی نے اسی وقت مصرعہ لگا دیا

جتنے ہیں سر ان پہ ہے فائق یہ سر

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس وقت تک ان کی فہم وفراست کے ساتھ موزونی طبع اور شعری وادبی مذاق کس درجہ پختہ ہو گیا تھا۔

اس کے بعد ان کے والد شیخ حبیب اللہ وکیل نے شہر اعظم گڑھ میں بچوں کی دینی تعلیم و تربیت کے لئے ایک مدرسہ عربیہ قائم کیا اور اس میں اچھے اچھے مدرس رکھے۔مولانا محمد فاروق چریا کوٹی کو بھی استاذ مقرر کیا۔دیگر طلبہ کے ساتھ علامہ شبلی کو بھی اس مدرسہ میں داخل کیا گیا۔ چنانچہ یہیں ان کی تعلیم کی تکمیل ہوئی۔

اس کے بعد علامہ شبلی کو یہ خیال پیدا ہوا کہ اب مجھے اسلامی علوم وفنون کے ماہرین سے تعلیم حاصل کرنی چاہئے تا کہ دینی علوم وفنون میں مکمل مہارت اور دست رس حاصل ہو جائے۔مگر ان کے والد شیخ حبیب اللہ اسے غیر ضروری خیال کرتے تھے اور اس کے لئے راضی نہ تھے۔البتہ ان کی والدہ قائمہ بی بی نے ہمت افزائی کی اور حوصلہ بڑھایا، چنانچہ وہ فقہ پڑھنے کے لئے رام پور گئے اور وہاں کے مشہور عالم اور فقیہ مولانا ارشاد حسین رام پوری سے شرف تلمذ حاصل کیا اور تقریباً ایک سال تک ان سے کسب فیض کرتے رہے۔

اب ان کے والد مزید تعلیم کے لئے بالکل تیار نہیں تھے۔ان کی خواہش تھی کہ اب وہ وکالت پاس کر کے وکالت کریں،مگر علامہ شبلی ادب میں مہارت حاصل کرنے کے لئے مولانا فیض الحسن سہارنپوری کی خدمت میں لاہور جانا چاہتے تھے۔ان کے والد تیار نہیں ہوئے تو وہ چپکے سے بغیر بتائے لاہور چلے گئے۔اعظم گڑھ سے جون پور تک یکہ میں بیٹھ کر گئے۔پھر وہاں سے ٹرین سے سہارنپور اور سہارنپور سے لاہور گئے اور وہاں جا کر اپنے وقت کے عربی زبان وادب کے سب سے بڑے ادیب مولانا فیض الحسن سہارنپوری سے ملے اور اپنا مدعا بیان کیا،مگر انہوں نے صاف منع کر دیا کہ میرے پاس وقت نہیں ہے اور واقعی ان کے پاس وقت کی کمی تھی۔انہیں ہر وقت طلبہ گھیرے رہتے تھے۔مولانا شبلی سخت حیران ہوئے مگر ہمت نہیں ہارے۔دوبارہ ملے تو مولانا فیض الحسن صاحب نے طلب صادق دیکھ کر کہا کہ میرے پاس صرف اتنا وقت ہے کہ گھر سے کالج جاتے ہوئے تم راستے میں جو پوچھنا چاہو پوچھ لو اور پڑھ لو۔مولانا شبلی تیار ہو گئے اور اس طرح راستہ میں آتے جاتے ان سے ادب کی تعلیم حاصل کی اور اس میں بھی بڑی مہارت اور لیاقت پیدا کی اور اس فن میں نام پیدا کیا۔عربی زبان میں ان کی تین کتابیں اسکات المعتدی علی انصات المقتدی،الجزیہ اور الانتقاد علی تاریخ التمدن الاسلامی شائع ہوئی ہیں۔

مولانا شبلی جب گھر سے لاہور کے لئے نکلے تھے اس وقت ان کے پاس ۲۵/روپئے تھے۔تین روپئے میں یکہ سے جون پور پہنچے۔وہاں سے سات روپیہ میں سہارنپور۔پھر وہاں سے پانچ روپئے میں ٹرین سے لاہور پہنچے۔اس طرح ۱۵/روپئے کرایہ میں خرچ ہو گئے۔دس روپئے باقی بچے۔اس سے لاہور میں ایک روپیہ ماہوار کرایہ کا مکان لیا اور اسی بقیہ دس روپیہ میں دو ماہ

لاہور میں مقیم رہے۔ کھانے اور کپڑے کا بھی اسی میں انتظام کیا۔ اندازہ کیجئے کہ تعلیم کے حصول کے لئے انہوں نے کس قدر صعوبت اور زحمت اٹھائی ہوگی، مگر اس کا فائدہ یہ ہوا کہ انہیں عربی زبان وادب میں کمال حاصل ہوا۔ حماسہ کا درس یہیں لیا تھا اور اس کے اشعار انہیں زبانی یاد ہو گئے تھے، جسے وہ اکثر گنگنایا کرتے تھے۔ اخیر عمر میں جب وہ ندوہ سے وابستہ تھے عربی زبان وادب میں ان کی مہارت بہت کام آئی۔

مولانا فیض الحسن سہارنپوری قرآن پاک کی فصاحت و بلاغت دل نشیں کرانے کے لئے قرآن مجید کا بامحاورہ اردو ترجمہ پڑھاتے تھے اور فصاحت و بلاغت کے نکتے سمجھاتے تھے۔ انہیں کی تعلیم سے مولانا شبلی میں یہ خوبی پیدا ہوئی۔ اس کے بعد مولانا شبلی حدیث کی تعلیم کے لئے سہارن پور گئے اور اپنے وقت کے بڑے جلیل القدر محدث مولانا احمد علی محدث سہارنپوری کے درس میں شامل ہو کر حدیث کی تعلیم حاصل کی اور اس میں بھی بڑی صلاحیت پیدا کی۔ وہ اپنے استاذ کی خدمت کے لئے بھی ہمیشہ تیار رہتے تھے۔ ایک بار ان کے استاذ بازار میں سودا لیتے ہوئے مل گئے تو ان کا سامان پہنچانے کے لئے بضد رہے، مگر ان کے استاذ مولانا احمد علی محدث سہارنپوری جن کو تعلیم دیتے تھے ان سے کسی طرح کی خدمت نہیں لیتے تھے، وہ بھی نہ مانے اور بالآخر سودا لے کر خود ہی واپس گھر گئے۔

سہارن پور میں ابھی وہ پڑھ ہی رہے تھے اور ان کی عمر محض ۱۹؍سال ہی کی تھی کہ والد اور دیگر اعزہ حج پہ جانے لگے تو مولانا شبلی بھی ان کے ساتھ فریضہ حج ادا کرنے چلے گئے۔ ڈاکٹر شعیب اعظمی نے اپنے سفرنامہ حج ''بطواف کعبہ رفتم'' میں لکھا ہے کہ انہوں نے حج نہیں کیا تھا۔ یہ بات درست نہیں۔ تعلیم سے فراغت کے بعد سب سے پہلے انہوں نے فریضہ حج ہی ادا کیا تھا۔ اس سفر میں بھی ان کا ذوق علم و مطالعہ غالب رہا۔ چنانچہ مدینہ منورہ کے کتب خانوں میں مطالعہ کرتے رہے اور متعدد نادر و نایاب کتابوں کا مطالعہ کیا۔ مولانا شبلی کو مطالعہ کی عادت بچپن ہی میں پڑ گئی تھی اور وہ کثرت سے کتابوں کا مطالعہ کرتے تھے۔ ان کی یہ اچھی عادت پوری زندگی قائم رہی اور انہوں نے بے شمار کتابوں کا مطالعہ کیا بلکہ اس معاملہ میں وہ اپنے معاصرین میں سب پر فائق تھے۔

حج بیت اللہ کے بعد انہوں نے اپنے والد کی شدید خواہش پر وکالت کا امتحان دیا اور پہلی

بار امتحان میں نا کام ہو گئے۔ دوبارہ بیٹھے تو کامیابی ملی۔ دراصل وہ وکالت بلکہ غیر علمی مشغلوں کے حق میں نہ تھے اور یہی وجہ تھی کہ وہ وکالت کے امتحان میں فیل ہوئے۔ یہی نہیں اس زمانہ میں انہوں نے جو بھی کام انجام دیے مثلاً محرری، قرق امینی، وکالت، تجارت وغیرہ سب میں تقریباً نا کامیاب ہی ہوئے۔ البتہ ان کا علمی ذوق بہت بلند تھا۔ اس کی متعدد مثالیں دی جاسکتی ہیں، مگر طوالت کی وجہ سے انہیں نظر انداز کیا جاتا ہے۔ بہر حال علامہ شبلی نے دور طالب علمی میں اپنی محنت وریاضت اور ذوق وشوق سے مختلف علوم وفنون میں کمال حاصل کیا اور اپنے وقت کے بہت بڑے عالم، فاضل، ادیب، شاعر، نقاد، فلسفی، متکلم اور ماہر تعلیم بنے اور اسی مہارت سے کام لے کر انہوں نے بڑے بڑے علمی وعملی اور قومی وملی کارنامے انجام دیئے۔ ندوہ کی تعمیر وترقی، شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ کا قیام ان کی قومی ہمدردی کے مظاہر ہیں تو انجمن ترقی اردو کی خدمت اور دار المصنّفین کا قیام ان کی علمی وادبی خدمات کا نمونہ ہیں۔ اشاعت اسلام کے لئے انہوں نے ایک بڑا وسیع منصوبہ بنایا۔ علاوہ ازیں کتابیں لکھیں اور پوری زندگی اسلام کی ترقی اور سربلندی کے لئے کوشاں رہے اور بڑی جد وجہد کی۔ ان کا ایک بڑا کارنامہ تحریک وقف علی الاولاد بھی ہے، جسے انہوں نے پانچ برس تک جاری رکھا اور بالآخر کامیابی ملی۔ اس زمانہ میں جمعہ کی تعطیل نہیں ہوتی تھی، اس کے لئے بھی انہوں نے کوشش کی۔

ان کا دل بڑا دردمند تھا۔ اسلام کے خلاف کوئی کچھ لکھتا یا کہتا تو وہ تڑپ جاتے تھے اور جب تک اس کا جواب نہ دیدیتے یا اسلام پر لگے داغ، دھبہ کو نہ دھو دیتے انہیں چین نہیں آتا تھا۔ الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ، حقوق الذمیین اور مضامین عالم گیر جیسے محققانہ رسالے انہوں نے مستشرقین اور مخالفین اسلام کے الزامات کے جواب ہی میں لکھے۔ اس طرح انہوں نے اسلام کی بہت خدمات انجام دیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے۔

○○○

[۲]

علامہ شبلیؒ کا علمی، ادبی اور فکری سرمایہ

علامہ شبلی جیسے جامع کمال مدتوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ ۵۷؍سال کی عمر میں انہوں نے علم وتحقیق اور تصنیف وتالیف کے میدان میں جو کچھ کر دکھایا اسے ایک معجزے سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔ انہوں نے یگانہ روزگار علماء کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ ۱۹؍سال کی عمر میں حج بیت اللہ سے مشرف ہوئے اور پھر اپنی بقیہ ۳۵؍سال کی زندگی کے ایک ایک لمحے کو درس وتدریس، تصنیف وتالیف اور قوم وملت کی فلاح وکامرانی میں صرف کیا۔ اس کے لئے انہوں نے متعدد علمی، تعلیمی اور تصنیفی منصوبے بنائے اور چھوٹی بڑی ۴۱؍کتابیں سپرد قلم کیں۔ جس میں اردو کی ۳۱، عربی کی ۴، اور فارسی کی ۷؍کتابیں شامل ہیں۔ اس میں ان کے اردو و فارسی کے مجموعہ ہائے کلام بھی شامل ہیں۔ انہوں نے مختلف النوع موضوعات پر ۲۱۸؍مقالے لکھے۔ ان کے مقالات اور کتابوں کے اقتباسات سے اب تک ۶۴؍کتابیں مدون کی جاچکی ہیں جو اپنے مشمولات کے لحاظ سے خود تصنیف کا درجہ رکھتی ہیں۔ ان کی کتابوں کے دنیا کی بارہ زبانوں میں ۶۳؍ترجمے ہوچکے ہیں۔ گویا ایک کتاب کے کئی کئی ترجمے ہوئے اور یہ تراجم ہندوستان، پاکستان، بنگلہ دیش، افغانستان، ایران، تاجکستان، ترکی اور سعودی عرب کے اہم مکتبات سے شائع ہوئے۔ اور ان ممالک کے ممتاز اہل قلم نے ان کے ترجمے کئے۔ حواشی، تعلیقات اور تحسین آمیز دیباچے لکھے گئے۔ افادیت کے پیش نظر چند اہم کتابوں کی ۱۰؍تلخیصات بھی مختلف زبانوں اور مختلف خطوں میں شائع ہوئیں۔ ہندوستان کے اردو مصنّفین میں شاید ہی کسی اہل قلم کی تصنیفات کو یہ شرف حاصل ہوا ہو۔

علامہ شبلی کا مذکورہ علمی وتحقیقی سرمایہ متنوع موضوعات پر مشتمل ہے۔ قرآن وحدیث، فقہ وفلسفہ، کلام وعقائد، تاریخ وتذکرہ، سیرت وسوانح، تعلیم وتربیت، اردو، عربی اور فارسی شعروادب،

شاعری، سیاسیات، املااورصحت زبان، تحقیق وتنقیدغرض مشرقی علوم وادبیات کا شاید ہی کوئی ایسا گوشہ اور پہلو قابل ذکر ہو جو ان کے نوک قلم سے نظر انداز ہو گیا ہو۔ علامہ شبلی کی ان کاوشوں کی بنیاد پر اگر یہ نتیجہ اخذ کیا جائے کہ ہندوستان میں ان کے عہد میں اوران کے بعد اب تک علماء میں ان کے برابر کا کوئی اسکالر پیدا نہیں ہوا تو شاید مبالغہ نہ ہو۔

علامہ شبلی فروری ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ کالج سے وابستہ ہوئے۔ پانچ ماہ بعد ۳۰رجون ۱۸۸۳ء کو اعظم گڑھ میں نیشنل اسکول کی بنیاد رکھی جس کا بنیادی مقصد قوم میں انگریزی علوم کی تعلیم تھی۔ اسے ہم تحریک علی گڑھ کا ثمرہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ انہوں نے اپنے وطن بندول میں ایک مدرسہ بھی قائم کیا۔ گویا قدیم صالح اور جدید نافع کا تصوران کے ذہن میں اول روز سے راسخ تھا اور وہ اخیر تک اسی نظریہ تعلیم کے علم بردار رہے۔

وہ ۱۶ربرس علی گڑھ کالج سے وابستہ اور سرسید علیہ الرحمہ کے ساتھ رہے اوران کی وفات کے بعد علی گڑھ سے علاحدہ ہوئے۔ علی گڑھ تحریک میں ان کا نمایاں حصہ ہے۔ بلاشبہ سرسید علیہ الرحمہ نے انہیں جوہر قابل بنایا لیکن خودان کی ذات میں جوہر قابل بننے کی صلاحیت فطرت نے ودیعت کی تھی۔ سرسید علیہ الرحمہ کی ذات اخلاص وعمل کا ایسا مجموعہ تھی جس کی نظیر مشکل ہے۔ ان کی اور آرنلڈ کی صحبت اور علی گڑھ کے علمی ماحول میں علامہ شبلی جدید علوم اور جدید فلسفہ تاریخ سے آشنا ہوئے اور انہیں مستشرقین کے عزائم ،اندازفکر اورطریقہ کار سے آگاہی ہوئی۔ یہیں انہیں مستشرقین کی تدلیسات اورملمع کاریوں کا علم ہوا اوران کی پردہ دری کا آغاز کیا۔ جو بلاشبہ ان کا بڑا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

ا۔ علامہ شبلی نے اس نئی دنیا یعنی علی گڑھ میں جو پہلا کارنامہ انجام دیا وہ ان کی تاریخی تحقیقات ہیں ۔ انہوں نے مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، کتب خانہ اسکندریہ، حقوق الذمیین وغیرہ معرکتہ الآراء مقالات لکھ کر یورپ کی بعض غلط فہمیوں اور غلط بیانیوں کی تردید کی۔ ان تحقیقات میں انہوں نے جوطریقہ کار اختیار کیا اور جس طرح انہوں نے دلائل وبراہین فراہم کئے وہ اردو میں میدان تحقیق کے اگرچہ ابتدائی نقوش ہیں تاہم بعد کے محققین کے لئے وہی مشعل راہ بنے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ تحقیقی مقالہ نگاری کو شبلی نے اس وقت جو معیار عطا کیا تھا ہمارا قدم شاید ہی اس

سے آگے بڑھا ہو۔ ملک میں اس اسلوب تحقیق کا عام تتبع ہوا اور یہ سلسلہ اب تک قائم ہے۔

اردو نثر کو ذرہ سے آفتاب بنانے والے سرسید احمد خاں کا ایک کارنامہ اردو میں مقالہ نگاری کی ابتداء بھی ہے۔ علامہ شبلی نے اسے مزید ترقی دی اور اسے ایک نیا اسلوب و انداز عطا کیا۔ البتہ خالص تاریخی اور تحقیقی مقالہ نگاری کی ابتداء کا سہرا علامہ شبلی کے سر ہے۔ ان مقالات کے متعدد مجموعے شائع ہوئے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کو آٹھ جلدوں میں موضوعاتی اعتبار سے جمع کر دیا ہے۔ یہ مذہبی، ادبی، تعلیمی، تنقیدی، سوانحی، تاریخی اور فلسفیانہ اور اخباری ناموں سے شائع ہوئے اور گذشتہ ایک صدی سے مسلسل شایع ہو رہے ہیں۔ جلد ہفتم کا فارسی زبان میں ایران میں ترجمہ بھی ہو چکا ہے جو مشہور ایرانی شبلی شناس سید محمد تقی فخر داعی گیلانی کے قلم سے ہے۔

ان مجموعہ مقالات کا رتبہ اپنے اپنے موضوعات پر کسی بلند پایہ تصنیف سے کم نہیں مثلاً جلد اول مذہبی علوم بالخصوص قرآنیات پر ان کی گہری نظر کا نمونہ ہے تو دوسری جلد ان کے ادبی و تنقیدی شعور کی غماز، اسی طرح تیسری جلد کے مضامین ماہر تعلیم ہونے کا ثبوت ہیں، ان کی تنقیدی بصیرت کے جلوے چوتھی جلد میں دیکھے جا سکتے ہیں، پانچویں اور چھٹی جلدیں تاریخی تحقیقات کا نمونہ ہیں تو ساتویں جلد فلسفہ و کلام کے نادر معلومات کا خزانہ۔ آخری جلد ان کے بعض افکار و خیالات بالخصوص قوم و ملت کی دردمندی میں بنائے گئے منصوبوں اور خاکوں پر مشتمل ہے، جس سے ملت کی ہمدردی اور اسلام کی سربلندی کے جذبات ابھرتے ہیں۔ غرض کمیت اور کیفیت دونوں لحاظ سے علامہ شبلی کے یہ مجموعہ مقالات بلاشبہ ذخیرہ اردو میں گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔

سوانح نگاری

علی گڑھ میں شبلی کا دوسرا بڑا کارنامہ تاریخی سوانح عمریوں کی تصنیف ہے۔ اردو میں سوانح نگاری کا آغاز مولانا الطاف حسین حالی کی حیات سعدی سے ہوا۔ (۱) علامہ شبلی اس عہد کے دوسرے بڑے سوانح نگار ہیں، جنھوں نے المامون، الفاروق اور سیرۃ النعمان لکھیں اور سوانح نگاری کے سرمائے میں بیش بہا اضافہ کیا۔ الطاف فاطمہ نے اپنے تحقیقی مقالے میں لکھا ہے کہ:

''مولانا شبلی نعمانی کی روشن اور پرجلال شخصیت اس دور کی سوانح نگاری پر

کچھ اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ ان کے معاصرین کی نوشتہ سوانح عمریوں کی حیثیت ضمنی ہو کر رہ گئی ہے۔''(۲)

علامہ شبلی کی سوانح عمریاں دو قسم کی ؛ تاریخی اور غیر تاریخی ہیں۔ اردو میں تاریخی سوانح نگاری علامہ شبلی کا کارنامہ ہے۔ المامون اور الفاروق ان کی ایسی ہی عظیم الشان کاوشیں ہیں جو ذخیرہ ادب میں ان کا گراں قدر عطیہ ہیں۔ اردو کے سوانحی ادب کو پیش نظر رکھ کر یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ ہماری ادبی تاریخ اس کی دوسری مثال اب تک نہ پیش کر سکی۔

یہی وجہ ہے کہ ان کی سوانح عمریاں بے حد مقبول ہوئیں اور ان کے بے شمار ایڈیشن ملک و بیرون ملک سے شائع ہوئے۔ دوسری زبانوں میں ان کے ترجمے ہوئے۔ الفاروق کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ وہ دنیا کی ۹ رزبانوں میں منتقل کی جا چکی ہے۔

تاریخ نگاری

مہدی حسن افادی نے علامہ شبلی کو ملک میں تاریخ کا معلم اول قرار دیا ہے۔ (۳) خود علامہ شبلی نے ابتدائے تصنیف و تالیف سے اپنی تصنیفات کا میدان تاریخ کو قرار دیا تھا۔ (۴) چنانچہ وہ مدۃ العمر تاریخ کی خدمت کرتے رہے اور اردو کو چند لازوال تاریخی کتابوں سے بہرہ ور کیا۔ المامون، الفاروق، سیرۃ النبیؐ اور اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر اور متعدد تاریخی مقالات ان کے قلم سے نکلے جو ان کے گہرے تاریخی شعور اور مورخانہ بصیرت کے نمونے ہیں جو نہ صرف ان کے لئے بلکہ تمام علمی دنیا کے لئے قابل فخر کاوشیں ہیں۔

علامہ شبلی اردو کے پہلے ایسے مورخ ہیں جنھوں نے ابن خلدون کے بعد اصول تاریخ نگاری کی طرف توجہ دی اور اس کے اصول وضوابط وضع کئے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے لکھا ہے کہ:

> ''وہ صرف مورخ ہی نہ تھے بلکہ ایک خاص فلسفہ تاریخ کے واضع ونقاد بھی تھے۔ انھوں نے مغرب اور مشرق کے تاریخی سرمائے پر جو تنقید کی ہے وہ بلاشائبہ مبالغہ اصول تاریخ کے لئے ایک فاضلانہ اور عالمانہ دستور اساسی کا حکم رکھتی ہے۔''(۵)

راقم نے ایک مقالہ میں جو ماہنامہ معارف اعظم گڑھ [نومبر ۱۹۹۸ء] میں شایع ہوا ہے، علامہ شبلی کے نظریہ تاریخ کے چودہ اصولوں کی نشاندہی کی ہے۔

علامہ شبلی نعمانی نے نہ صرف اصول وضع کئے بلکہ عملی طور پر ان کو برتنے کی بھی کوشش کی۔ بے شبہ اردو کے تاریخی ادب میں علامہ شبلی کی یہ کوشش سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

تنقید نگاری

اردو شعراء کے قدیم تذکروں میں اگرچہ تنقید کے ابتدائی عناصر ملتے ہیں، تاہم اردو میں فن تنقید کا باقاعدہ آغاز مولانا حالی کے مقدمہ شعروشاعری سے ہوا۔(۶) علامہ شبلی کا شمار مولانا حالی کے ساتھ ان اولین نقادوں میں ہوتا ہے، جنھوں نے فن تنقید کو آبروبخشی۔ عربی و فارسی تنقید پر بھرپور اور کسی قدر مغربی تنقید نگاری پر بھی ان کی نگاہ تھی۔ اس سرمائے کا جائزہ لے کر انھوں نے ادبی اور عملی تنقید کے متعدد نمونے پیش کئے۔ موازنہ انیس و دبیر اور شعرالعجم کی پانچ جلدیں ان کی تنقید نگاری کا بہترین نمونہ ہیں۔ تنقید میں ان کے مقام و مرتبہ کی تعیین کرتے ہوئے ڈاکٹر عبادت بریلوی نے لکھا ہے کہ:

> ''شبلی کا مرتبہ نقاد کی حیثیت سے مسلم ہے۔ ان کی نظر میں وسعت اور گہرائی ہے۔ جدت اور اپج ہے اور ان کے اثرات ان کی تنقید میں بھی نظر آتے ہیں۔ تنقید اور ادبی تجزیے کے میدان میں وہ کسی سے کم اہمیت نہیں رکھتے تھے۔ ان کے جمالیاتی ذوق کی بلندی ہر شکل میں حسن احساس کی صلاحیت اور فارسی ادبیات کے گہرے مطالعے نے ان کو اس مرتبے پر پہنچا دیا ہے جس پر ان کے زمانے میں کوئی نہیں پہنچ سکا۔''(۷)

ان کی تنقیدی کاوشوں خاص طور سے موازنۂ انیس و دبیر پر بڑے اعتراضات ہوئے تاہم حقیقت یہ ہے کہ ان کے معترضین اپنی تمام تر کوششوں کے باوجود ان کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکے اور آج بھی موازنہ اور شعرالعجم کی تب و تاب میں کسی طرح کی کمی نہیں آئی، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اردو میں شعرالعجم جیسی کتاب آج تک لکھی ہی نہیں گئی۔

علم الکلام

علم الکلام، الکلام، الغزالی اور سوانح مولانا روم علامہ شبلی کے سلسلہ کلامیہ کی تصنیفات اور ان کی متکلمانہ بصیرت کے نمونے ہیں۔ یہاں ان کی قدر و قیمت سے قطع نظر محض یہ عرض کرنا ہے کہ شبلی پہلے شخص ہیں جنھوں نے اردو میں کلامی ادب کا آغاز کیا۔ (۸) صحیح یہ ہے کہ شبلی سے پہلے اور شبلی کے بعد اردو میں کوئی ایسا مصنف اور اہل قلم نظر نہیں آتا جس نے اس قدر دقیق اور خشک موضوع پر اپنی تمام تر ادبی رعنائیوں کے ساتھ علم الکلام پر چار اہم کتابیں لکھیں۔

فلسفہ و کلام پر اردو کے متعدد اہل علم نے قلم اٹھایا اور بے شبہ انھوں نے بڑی کاوشیں کیں۔ خاص طور سے سرسید احمد خاں اور مولوی چراغ علی کی کوششیں کم اہم نہیں لیکن ان کی تحریروں میں محض علم کلام ہے، کلامی ادب نہیں۔ یہ خوبی بھی شبلی کی قسمت کا حصہ ہے۔

علامہ شبلی نے سلسلہ کلامیہ ایک خاص مقصد کے لئے شروع کیا تھا۔ وہ علماء کو ایک خاص سطح پر لانا چاہتے تھے۔ اپنے موقف کی حمایت میں انہوں نے عہد عباسیہ کے حالات اور علماء کو پیش کیا تھا۔ گو وہ اپنے اس مقصد میں پورے طور پر کامیاب نہیں ہو سکے بلکہ اس پر علماء کا ایک گروہ چیں بہ جبیں ہوا اور بعد میں کفر کا فتوی جاری کر دیا، لیکن یہ حقیقت آج بھی واضح ہے کہ کلام وعقائد پر پھر کبھی اس طرح گفتگو نہ ہو سکی اور جن ضروریات اور حالات کے پیش نظر علامہ شبلی نے یہ خاکہ تیار کیا تھا وہ عہد شبلی ہی کی طرح آج بھی رنگ بھرنے کا منتظر ہے۔

فارسی شعر و ادب

فارسی شعر و ادب پر جس قدر باریک اور گہری نظر علامہ شبلی کی ہے، ان کے معاصرین اس سے محروم ہیں۔ آزاد اور براؤن نے بھی اس میدان میں قدم رکھا اور اپنی اپنی بیش بہا کاوشیں پیش کیں تاہم وہ شبلی کے صحیفہ حسن و عشق شعر العجم کے ہم پلہ بھی نہیں قرار دی جا سکتیں۔ حافظ محمد اسلم جیراج پوری اور حافظ محمود شیرانی کی سخت تنقید کے باوجود شعر العجم نہ صرف اپنے عہد میں بلکہ ایک صدی بعد بھی اپنا جواب نہیں رکھتی اور آج تک خود ایران میں بھی اس پائے کی

کتاب نہ لکھی جاسکی۔اس کا اعتراف بعض ایرانی اہل قلم نے کیا ہے۔یہی وجہ ہے کہ ایران و افغانستان سے اس کے کئی فارسی ترجمے ہوئے۔اردو کی یہ کتاب نہ صرف ہندوستان بلکہ ایران و افغانستان کے اہل علم وادب کی آنکھوں کا اب تک نور بنی ہوئی ہے۔

مکتوباتی ادب

اردو کے مکتوباتی ادب میں بھی علامہ شبلی نے بڑا اضافہ کیا۔انھوں نے اپنی ۳۵ سالہ علمی زندگی میں احباب ومعاصرین کو بے شمار خطوط لکھے،جنھیں مولانا سید سلیمان ندوی نے دوحصوں میں مرتب کر کے شائع کیا۔بمبئی کی دوخواتین کے نام علامہ شبلی نے جو خطوط لکھے تھے انہیں منشی امین زبیری نے شائع کیا۔ان کے علاوہ ان کے متعدد مکاتیب جو بعد میں دریافت ہوئے ماہنامہ معارف اعظم گڑھ،نقوش لاہور اور ادیب علی گڑھ اور بعض دوسرے رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ان کا ایک مجموعہ راقم نے ۲۰۱۳ء میں مکتوبات شبلی کے نام سے شایع کیا۔

غالب کے مکتوبات نے اصلاً اس صنف ادب کو دوام بخشا۔ان کے بعد مکتوباتی ادب میں علامہ شبلی ہی کے خطوط ادب و انشاء کا اعلیٰ نمونہ ہیں۔خطوط غالب کے امتیازات اور خصوصیات کے پس منظر میں اگر علامہ شبلی کے مکاتیب کا جائزہ لیا جائے تو وہ مرزا غالب سے کم رتبہ نہیں بلکہ بعض حیثیتوں سے ان کی اہمیت دو چند ہو جاتی ہے۔مثلاً غالب کے مکاتیب میں ان کی زندگی،ان کا عہد اور بعض سیاسی حالات و واقعات کے علاوہ اور کوئی منظر نظر نہیں آتا،جبکہ مکاتیب شبلی میں شبلی کی زندگی اور ان کے عہد کے علمی،ادبی،تاریخی،تعلیمی،تہذیبی اور سیاسی حالات کے ساتھ عالم اسلام کے مسائل،یورپ کی چیرہ دستیاں،مستشرقین کی اسلام دشمنی،غرض ان کے عہد کا پورا منظر نامہ سامنے آجاتا ہے۔پروفیسر خورشید الاسلام نے اسی بنیاد پر مکاتیب شبلی کو قومی اعمال نامہ قرار دیا ہے۔(۹)

اس قومی اعمال نامے کا اب تک بھر پور جائزہ نہیں لیا گیا،ضرورت ہے کہ ان کی قدر و قیمت کے تعین کے ساتھ اسے جدید اسلوب و انداز میں مرتب کیا جائے اور دکھایا جائے کہ ان خطوط میں کیا کچھ پوشیدہ ہے۔

اشاعت اسلام

آریوں کی ریشہ دوانیوں سے ۱۹۰۸ء میں ارتداد کا فتنہ اٹھا اور کئی مقامات پر نومسلم دوبارہ غیر مسلم ہو گئے۔ اس فتنے کے مقابلے کے لئے جو لوگ میدان میں آئے ان میں ایک بہت نمایاں نام علامہ شبلی کا ہے۔ وہ ان واقعات سے تڑپ اٹھے اور اس کے سدباب کے لئے پیہم کوششیں کیں۔ بریلی، شاہجہاں پور اور بعض دیگر مقامات کا دورہ کیا۔ راج پوتانہ وغیرہ میں معتمد اشخاص بھیجے۔ آریوں کے مقابلہ کے لئے ندوہ میں ہندی و سنسکرت کی تعلیم کا نظم کیا اور اس کے قطعی سدباب کے لئے صیغہ حفاظت و اشاعت اسلام کے قیام کا اعلان کیا اور اس بات پر زور دیا کہ ایک کمیٹی بنائی جائے جس میں ملک کے تمام صوبوں کے نمائندے ہوں۔ ایک سکریٹری ہو جو تمام کارروائی پر نظر رکھے۔ واعظ مقرر کئے جائیں جو دو، دو۔ چار، چار مہینے ایک، ایک گاؤں میں رہ کر لوگوں کو اسلامی تعلیمات اور احکام سکھائیں۔ واعظوں کے تیار کرنے کا بھی انتظام کیا جائے۔ جابجا مکاتب قائم کئے جائیں جن میں قرآن اور اردو کی تعلیم دی جائے۔ دیہاتوں میں جو مکاتب قائم ہیں ان میں مسلمان اساتذہ مقرر کرائے جائیں۔ دینیات کا ایک ایسا نصاب تیار کیا جائے جو انگریزی خواں طلبہ کے لئے مفید ہو اور ایک ایسی جماعت تیار کی جائے جو آریوں سے مناظرہ کرے اور وہ جماعت بھاشا اور سنسکرت سے بھی واقف ہو۔ آریوں کے مہمات عقائد کے رد میں رسالے لکھے جائیں۔

حفاظت و اشاعت اسلام کے سلسلے میں علامہ کے اس نقطہ نظر اور بعد کے ہندوستان میں مسلمانوں کو جو مذہبی اور ملی تنظیمیں اور جماعتیں مثلاً جمعیۃ علماء، جماعت اسلامی اور تبلیغی جماعت وغیرہ وجود میں آئیں ان کے کام کے اصول وضوابط، طریقہ کار اور اہداف پر نظر کی جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ سب علامہ شبلی کے نظریہ اشاعت اسلام سے ماخوذ ہیں۔

سیاسیات

ملکی اور بین الاقوامی سیاسیات پر علامہ شبلی کی بڑی گہری نظر تھی۔ انگریزوں کا ظلم و جبر، ان

کے عزائم اور استعماری کوششیں جس سے ملک وملت کو شدید نقصان پہنچ رہا تھا، اس سے وہ بہت دل برداشتہ تھے۔ ان کی سیاسی نظموں میں اسی کرب کا اظہار ہے:

مراکش جاچکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض خستہ جاں کب تک

ملی حالات اس سے بھی زیادہ ابتر اور دگرگوں تھے۔ انگریزوں کے تمام ظلم و جبر کے باوجود مسلمان مختلف الخیال اور مختلف الرائے تھے۔ چنانچہ علامہ شبلی نے قومی سیاست کو قابل اصلاح قرار دیا اور متعدد مضامین لکھے، اس سلسلے کا اہم مضمون مسلمانوں کی پولیٹکل کروٹ ہے۔ جس میں مسلمانوں کی سیاست، حکومت نواز پالیسی، مسلمانوں کو سیاست سے دور رکھنے کی کوشش کے مضر اثرات، سیاست کی صحیح اسکیم، مسلمانوں کی سیاسی خامیاں، ہندو مسلم اتحاد اور مسلم لیگ کی سیاست جیسے اہم نکات کا ذکر ہے۔ یہ مضمون بقول مولانا سید سلیمان ندوی ''اس قدر مدلل اور پرجوش تھا کہ اس نے مسلمانوں کی سیاست کا رخ شملہ سے قبلہ کی طرف پھیر دیا۔''(۱۰)

سیرت نگاری

سب سے آخر میں علامہ شبلی آستانہ نبوت پر پہنچے اور شہنشاہ کونین کے دربار میں اخلاص و عقیدت کی نذر پیش کی۔ سیرۃ النبی، سیرت نگاری کی طویل تاریخ میں علامہ شبلی کو جو اعجاز عطا کر گئی ہندوستان کی تاریخ میں اس کی نظیر مفقود ہے۔ شاہ معین الدین احمد ندوی نے سچ لکھا ہے کہ یہ اپنی خصوصیات میں سیرت کے سارے ذخیرہ کتب میں خواہ وہ کسی زبان میں لکھی گئی ہوں، منفرد حیثیت رکھتی ہے، حتی کہ عربی میں بھی اس نوعیت کی ایسی جامع کوئی سیرت نہیں لکھی گئی۔(۱۱)

اس دعوے پر بعض اہل قلم نے اعتراض وارد کیا ہے اور اس کی تردید میں خود سیرۃ النبیؐ پر متعدد اعتراضات کئے ہیں تاہم معترضین کو بھی اس کی انفرادیت کا اعتراف ہے۔(۱۲) اور کم از کم اتنا تو طے ہے کہ اردو کے سارے ذخیرہ کتب سیرت میں سب سے زیادہ بلند پایہ کاوش علامہ شبلی ہی کی ہے۔ اس کا انہوں نے جو طویل اور مبسوط مقدمہ سپرد قلم کیا ہے وہ سیرت نگاری کے اصول وآئین اور دستور اساسی کا حکم رکھتا ہے۔ کم از کم اس پر اب تک کوئی اضافہ نہیں ہوسکا ہے۔

اسلوب نگارش

اردو کے عناصر خمسہ میں انشا پرداز کی حیثیت سے مولوی محمد حسین آزاد سب سے بلند مقام پر فائز ہیں۔علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ وہ گپیں بھی ہانک دیتا ہے تو وحی معلوم ہوتی ہے۔اسی طرح دوسرے عناصر کی نثر بھی اپنی اپنی خصوصیات کے لحاظ سے کم رتبہ نہیں، تاہم علامہ شبلی کا اسلوب نگارش سب سے منفرد، جداگانہ بلکہ عناصر اربعہ کے اسلوب کی تمام خصوصیات کا مجموعہ ہے۔(۱۳) یہی وجہ ہے کہ ان کے اسلوب نے بڑی مقبولیت پائی اور اس کی تقلید کی گئی۔

قوت، جوش، تکرار، ایجاز واختصار، طنز وتعریض، شعریت، نغمگی علامہ شبلی کے اسلوب کی نمایاں خوبیاں ہیں۔(۱۴) لیکن ان کے اسلوب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ علمی وادبی اور تحقیقی وتنقیدی موضوعات میں بھی اس کی دلکشی اور ادبی رعنائی وزیبائی قائم رہتی ہے، جبکہ دوسرے اسالیب میں یہ خوبی نہیں۔ بہر حال علامہ شبلی کے اسلوب نے بھی اردو کو ایک قابل فخر زبان بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔

شاعری

علامہ شبلی اردو وفارسی کے خوش فکر اور قادرالکلام شاعر تھے۔مختلف اصناف مثلاً مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، قطعہ، رباعی، ترکیب بند، مخمس اور غزل وغیرہ میں دادِ سخن دی۔جس کے کئی مجموعے شایع ہوئے۔آخر میں سید صاحب نے اردو وفارسی دونوں کلیات بھی شائع کئے۔

اردو شاعری میں علامہ شبلی کا وہ مقام نہیں جو نثری ادب میں ہے۔تاہم ان کا شعری سرمایہ بہت اہم اور وقیع ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ میں وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے مذہبی، اخلاقی، تاریخی اور سیاسی نظموں کا آغاز کیا(۱۵) اور مورخانہ شعور وآگہی اور سیاسی بصیرت سے کام لے کر سیاسی نظموں کو بانگ درا اور ضرب کلیم بنا دیا، یہی وجہ ہے کہ ہمارے نقادوں نے علامہ شبلی کی نظموں کو اردو شاعری میں ایک نئی چیز سے تعبیر کیا ہے۔(۱۶)

فارسی شاعری میں تو شاید ہی کوئی ان کا ہم عصر ہم پلہ رہا ہو۔اسی بنیاد پر مولانا ابوالکلام

آزاد نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کا خاتمہ مرزا غالب پر نہیں بلکہ مولانا شبلی پر ہوا۔ (۱۷) فارسی غزلیں حافظ کے رنگ کی وجہ سے مقبول ہوئیں۔ اہل نظر کا خیال ہے کہ فارسی منظومات وقصاید کو نیا اور قومی رنگ آہنگ شبلی ہی نے دیا۔

بحیثیت مدیر

علامہ شبلی دو رسائل؛ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین علی گڑھ اور ماہنامہ الندوہ لکھنؤ کے مدیر رہے۔ ان رسائل کے ذریعہ بھی انھوں نے اردو ادب کی بڑی خدمات انجام دیں۔ ان کے مشمولات سے ان کی متنوع خدمات کا اندازہ ہوتا ہے۔ خاص طور سے ماہنامہ الندوہ لکھنؤ کے جو ہمہ گیر اثرات مرتب ہوئے وہ بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ اس میں علامہ شبلی نے نہ صرف مختلف موضوعات پر مضامین لکھے بلکہ اردو کے چند نامورترین اہل قلم کی تصنیف وتالیف کے لئے تربیت بھی کی۔ ان میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا عبدالسلام ندوی کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں اگر بنظر غائر دیکھا جائے تو ابوالکلام کی نثر، سید سلیمان ندوی کی تحقیقات علمیہ اور مولانا عبدالسلام ندوی کی ادبی وتنقیدی کاوشیں علامہ شبلی ہی کی بدولت اردو کا حصہ بنیں۔

انجمن ترقی اردو

۱۹۰۳ء میں علامہ شبلی انجمن ترقی اردو کے پہلے سکریٹری مقرر ہوئے۔ چنانچہ اسے ایک باقاعدہ ادارہ کی شکل دینے کی بھرپور کوشش کی۔ متعدد منصوبے بنائے، اہل قلم کو اس کی طرف متوجہ کیا۔ اشاعتی منصوبہ بنایا اور اس وقت کے ماحول میں اسے ایک فعال ادارہ بنا دیا۔ ۱۹۰۵ء میں اپنی دوسری مصروفیات کی وجہ سے وہ اس سے علاحدہ ہوئے۔ (۱۸) تاہم قلیل مدت میں انھوں نے انجمن ترقی اردو کی جو خدمت انجام دی اسے فراموش نہیں کیا جاسکتا۔

انجمن کے علاوہ شبلی کالج اور دارالمصنّفین کا قیام اور انتظام وانصرام دراصل ان کے نظریہ ترقی قوم وملت کے نمونے ہیں۔ دارالمصنّفین کا تخیل ان کی فکر ونظر کی انفرادیت کا معجزہ ہے۔ ایک ایسے ادارے کا خیال جس میں مصنّفین اور اہل علم کی تصنیفی تربیت کی جائے اور ایسے اہل قلم تیار کئے

جائیں جو اسلام پر ہونے والے ناروا حملوں اور اعتراضات کا سنجیدگی ومتانت سے جواب دے سکیں اور اسلامی تہذیب وتمدن کو بلند اسلوب میں پیش کر سکیں اور خود ان کو ذاتی مسائل سے آزاد کر کے محض تصنیف وتالیف کے لئے ہر طرح کی سہولت فراہم کی جائے۔شبلی کی فکر رسا کا ایک نمونہ ہے اور اس معاملہ میں وہ اعلانیہ سب سے ممتاز ہیں۔ایسا ادارہ آج بھی شاید ہی کہیں قائم ہوا ہو۔ شیخ محمد الغزالی نے اسے علم کی مملکت قرار دیا ہے۔[معارف نومبر ۱۹۹۰ء ص ۳۶۴-۳۶۵]

یہ علامہ شبلی کے علمی وفکری سرمائے کا ایک اجمالی تعارف ہے۔اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ علامہ شبلی کی علمی کاوشیں اور ان کی فکر ونظر کا دائرہ کس قدر وسیع اور متنوع ہے۔اس کے جائزے سے یہ بات ابھر کر سامنے آتی ہے کہ علامہ شبلی کے علمی وادبی سرمائے کا محور بنیادی طور پر اسلام کی سربلندی پر محیط ہے اور اس کے لئے وہ آخری سانس تک سرگرم عمل رہے۔

حوالے

(۱) نیر جہاں، مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ ص ۵۷، دہلی، ۱۹۹۸ء

(۲) الطاف فاطمہ، اردو ادب میں فن سوانح نگاری ص ۱۱۳۔ دہلی

(۳) مہدی افادی، افادات مہدی ص ۱۹۲ علی گڑھ، ۱۹۸۵ء

(۴) علامہ شبلی۔علم الکلام ص ۴۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۳ء

(۵) سرسید اوران کے نامور رفقا ص ۱۷۲-علی گڑھ، ۱۹۹۴ء

(۶) کلیم الدین احمد، اردو تنقید پر ایک نظر ص ۸۹- پٹنہ، ۱۹۸۳ء

(۷) اردو تنقید کا ارتقا ص ۱۸۷-علی گڑھ، ۱۹۸۸ء

(۸) شبلی ایک دبستاں ص ۱۱۳- ڈھاکہ

(۹) خورشید الاسلام۔تنقیدیں ص ۵۲، دہلی، ۱۹۶۴ء

(۱۰) حیات شبلی ص ۶۱۴، اعظم گڈھ، ۱۹۸۳ء

(۱۱) معارف سلیمان نمبر ص ۱۷۸، اعظم گڈھ، ۱۹۵۵ء

(۱۲) ترجمان الاسلام بنارس، جنوری تا مارچ ۱۹۹۵ء ص ۱۳

(۱۳) سعید انصاری۔ شبلی اردو کے بہترین انشاپرداز ص ۸، لکھنؤ
(۱۴) سرسید اوران کے نامور رفقاء ص ۶۷، علی گڑھ، ۱۹۹۴ء
(۱۵) مقدمہ کلیات شبلی ص ۱۸، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، طبع ششم، ۱۹۸۷ء
(۱۶) مولانا شبلی کا مرتبہ اردوادب میں ص ۱۸۲
(۱۷) کاروان خیال ص ۹۳، مدینہ بجنور [ب ت]
(۱۸) ڈاکٹر خلیق انجم۔ شبلی کی علمی وادبی خدمات ص ۳۰۵-۳۰۹- دہلی، ۱۹۹۶ء

[یہ مقالہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ کے سمینار ''علامہ شبلی کا علمی وفکری ورثہ'' منعقدہ مورخہ ۱۱/۱۲ر دسمبر ۲۰۱۱ء میں پیش کیا گیا۔]

[۳]

علامہ شبلی اور غالب

غالب اور شبلی ہماری ادبی تاریخ کے دو ایسے نمایاں اور ممتاز نام ہیں جن کے ذکر کے بغیر نہ ہماری تاریخ مکمل ہوسکتی ہے اور نہ ہماری تہذیبی قدروں کی بلندی کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ در حقیقت یہ دونوں ہماری آبرو ہیں اور ان ہی کے دم سے ہماری علمی، ادبی اور شاعرانہ قدر ومنزلت کی بھی آبرو قائم ہے اور یقین ہے آئندہ بھی قائم رہے گی۔

غالب کی عظمت اور شاعرانہ انفرادیت کا سارا زمانہ معترف ہے۔اس میں اردو، عربی، فارسی، ہندی، پنجابی، بنگالی زبانوں کے ادیب وشاعر تو شامل ہی ہیں، پشتو، روسی اور انگریزی کے بعض نامور ادیب اور دانشور بھی معترف ہیں۔ یہ اعتراف ان کی زندگی میں بھی تھا، آج بھی ہے اور یقین ہے کل بھی رہے گا۔ غالب کی خوش نصیبی تھی کہ انہیں ہر دور میں اچھے نقاد ملے جو ان کی شعری وادبی کاوشوں کی قدر و قیمت اجاگر کرتے رہے، لیکن شبلی کے شاعرانہ کمالات کے اعتراف میں ہمارے نقادوں نے کوتاہی برتی اور عرصہ تک انہیں شعراء کی صف میں جگہ نہیں مل سکی۔ حالانکہ شبلی کی زندگی ہی میں ڈپٹی نذیر احمد نے کہا تھا:

تم اپنی نثر کو لو نظم کو چھوڑو نذیر احمد
کہ اس کے واسطے موزوں ہیں حالی اور نعمانی (۱)

باوجود اس کے جب انہیں وہ مقام نہیں دیا گیا جس کے وہ مستحق تھے تو بعض نقادوں نے اس ناانصافی کے خلاف احتجاج کیا۔ ڈاکٹر سلام سندیلوی نے لکھا کہ:

''تمام نثر نگاروں میں آزاد اور حالی کا ذکر بحیثیت شاعر کے بھی کیا جاتا ہے لیکن شبلی کو اس محفل میں جگہ نہیں دی جاتی ہے۔ یہ شبلی کے ساتھ بے انصافی ہے۔

جہاں تک شاعرانہ صلاحیت کا تعلق ہے شبلی آزاد اور حالی سے کم نہیں۔اس لیے شبلی کو مورخ اور نقاد کے ساتھ ساتھ شاعر بھی تسلیم کرنا ہمارا فرض ہے۔''(۲)

ممکن ہے یہ ناانصافی قصداً سرزد نہ ہوئی ہو اور نظیرا کبرآبادی کی طرح یہ بے اعتنائی ان کا بھی مقدر رہی ہو، تاہم واقعہ یہ ہے کہ وہ اردو کے ایک بڑے قادرالکلام اور خوش فکر شاعر تھے۔ان کا اردو و فارسی دیوان موجود ہے جس میں مثنوی، مرثیہ، قصیدہ، قطعات، رباعیات، مخمس اور ترکیب بند وغیرہ سب کچھ موجود ہے۔ان کی یہ تخلیقات معیار و وقار کے لحاظ سے بھی کم رتبہ نہیں۔ اردو میں تاریخی اور اخلاقی نظم نگاری ان ہی کے ذہن رسا کی ایجاد و اختراع ہے اور اس میدان میں ان کے عہد میں کوئی ان کا ثانی نہیں تھا۔(۳) البتہ ان کا دائرہ شعر و شاعری کسی قدر محدود تھا اور غالب کا لامحدود۔مرزا غالب کو بھی ان کی اردوئے خاصہ کی داد برسوں بعد ملی اور شبلی کو بھی انتظار کرنا پڑا۔اگر غالب کو اردو میں لکھنا پڑھنا عار تھا تو شبلی کا بھی یہ شیوہ نہ تھا:

گرچہ مرا شیوہ فن ایں نہ بود حرف بہ اردو زدن آئین نہ بود (۲)

لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ دونوں کو شہرت و مقبولیت اور بقائے دوام کی دولت اردو ہی کے ذریعہ ملی۔

غالب اور شبلی دونوں کو عظمت رفتہ بے حد عزیز تھی۔یہی وجہ ہے کہ دونوں کے یہاں شعر عجم اور قند پارسی کی لطف و لذت عرصہ تک اردو میں اظہار خیال کے لیے مانع رہی لیکن بالآخر گردش ایام نے اردو اور اردوئے معلیٰ کو وہی عظمت عطا کی جو اس کی پیش رو یعنی فارسی کو حاصل تھی۔

دونوں فارسی کے زبردست قادرالکلام شاعر تھے۔ہندی الاصل ہونے کے باوجود دونوں نے ایسی داد سخن دی کہ نقادوں کو ان کے کلام پر اہل زبان کا دھوکہ ہوا۔غالب و شبلی کو اپنی فارسی دانی پر ناز تھا۔غالب اگر خود کو عرفی اور نظیری کے ہم پلہ سمجھتے تھے تو شبلی خود کو علی حزیں سے کم رتبہ نہ سمجھتے تھے۔اس میں شبہ نہیں کہ دونوں کا فارسی کلام واقعی اس لائق ہے کہ فخر کے ساتھ ایرانی شعرا کے بالمقابل پیش کیا جائے۔علامہ شبلی کی فارسی شاعری کے بارے میں مرزا احسان احمد لکھتے ہیں۔

''ہمارے نزدیک بہ حیثیت فارسی شاعر ان کا اصلی کمال ان کی خالص ایرانی طرز ادا ہے، جو بہت کم ہندی نژاد فارسی شعرا کے کلام میں نظر آتی ہے۔علامہ نے

تقریباً ہرصنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے لیکن ہر جگہ زبان کے لحاظ سے اپنے صحیح ذوق فارسیت کا ثبوت دیا ہے ،یعنی ہندوستان میں بیٹھ کر انہوں نے وہ زبان استعمال کی ہے،جس پر اہل زبان کو بھی حرف گیری کی جرأت نہیں ہوسکتی۔''(۵)

غالب کی فارسی شاعری کی عظمت کا اعتراف نقادوں نے یہ لکھ کر کیا کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کا خاتمہ مرزا غالب پر ہوا،لیکن مولانا ابوالکلام آزاد کا خیال ہے کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کا خاتمہ غالب پر نہیں شبلی پر ہوا۔(۶) اس میں شبہ نہیں کہ ان کے کلام پر اہل زبان کا گمان ہوتا ہے۔اس کا اعتراف غالب کے ایک شاگرد نیر دہلوی نے بھی کیا ہے۔اس اعتراف کی دلچسپ روداد ملاحظہ ہو۔علامہ شبلی ایک خط میں لکھتے ہیں:

''چہ کنم کی ردیف والی غزل پر یہاں ایک لطیفہ ہوا چند لڑکوں نے کہا کہ استاد کی غزل پر غزل لکھنے سے کیا حاصل:

ہمتائے فلک نہ ہوگا بادل

میں نے کہا:

دریا نہیں کاربند ساقی

غرض میری اور علی حزیں کی غزل خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز مصنف ''قیصر نامہ'' اور نیر دہلوی کے پاس بہ غرض محاکمہ ارسال کی گئی۔یہ وہی نیر ہیں جن کو غالب نے لکھا ہے:

مجھ سے تمہیں نفرت سہی نیر سے لڑائی

فارسی نہایت عمدہ کہتے ہیں اور غالب کے تلمیذ ارشد ہیں۔دونوں نے تسلیم کیا کہ اہل زبان کا کلام ہے۔نیر نے تو بہت تعریف لکھی اور لکھا کہ سلف کے کلام کے ہم پلہ ہے۔''(۷)

غالب کے ایک اور شاگرد خواجہ الطاف حسین حالؔی [۱۸۳۷-۱۹۱۴ء] نے شبلی کے مجموعہ کلام ''دستۂ گل'' کے بارے میں لکھا کہ:

''غزلیں کاہے کو ہیں شراب دوآتشہ ہے،جس کے نشہ میں خمار چشم ساقی بھی

ملا ہوا ہے۔غزلیات حافظ کا جو حصہ محض رندی و بے باکی پر مشتمل ہے ممکن ہے اس کے الفاظ میں زیادہ دل ربائی ہو، مگر خیالات کے لحاظ سے تو یہ غزلیں اس سے بھی زیادہ گرم ہیں۔'' (۸)

اس گرمی کلام کا اندازہ بعض دوسرے نقادوں کو بھی ہوا ہے۔تاہم واقعہ یہ ہے کہ شبلی کا فارسی کلام بعض فنی خوبیوں اور فنکارانہ ترکیبوں اور بعض دوسری خصوصیات میں غالب سے کم رتبہ نہیں، لیکن شبلی کو شعرالعجم فی الہند میں وہی مقام حاصل ہے جو ترتیب شمار کی رو سے ان کو ملا ہوا ہے، یعنی ان کا نمبر مرزا نوشہ کے بعد آتا ہے۔

غالب بھی مورخ تھے۔انہوں نے بہادر شاہ ظفر کے حکم پر درباری مورخین کی طرح بزم تیموریہ سجائی، لیکن ان کی شاعری کے آگے کون انہیں مورخ قرار دیتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ مورخ تھے اور انہوں نے مہر نیم روز لکھی۔ان کی یہ کاوش صرف نظر کے لائق بھی نہیں، تاہم ان کی شاعری کے سائے میں ان کی مورخانہ حیثیت دب کر رہ گئی۔شبلی بھی مورخ تھے بلکہ اصلاً مورخ تھے اور اس قدر بلند رتبہ مورخ تھے کہ انہوں نے تاریخ نویسی کے اصول وآئین کا تجزیہ کیا اور بعض اصول بھی وضع کیے۔ابن خلدون کے بعد وہ پہلے ایسے مسلمان مورخ کہے جاتے ہیں، جنہوں نے تاریخ نویسی کے نہ صرف اصول وآئین منضبط کیے بلکہ انہیں عملی جامہ پہنانے کی بھی کوشش کی۔ (۹) غالب کی شاعری نے اگر ان کی مورخانہ حیثیت کو نظروں سے اوجھل کیا تو شبلی کی مورخانہ عظمت و بلند پائیگی نے ان کی شاعرانہ حیثیت پر گرد جما دی۔

شبلی اپنے عہد میں عظمت رفتہ کی بازیافت کے سب سے بڑے نقیب تھے اور اس کے لیے انہوں نے اپنی سب صلاحیتیں لگا دیں۔المامون ہو یا الفاروق، سیرۃ النعمان ہو یا الغزالی، علم الکلام ہو یا سوانح مولانا روم، سیرۃ النبی ﷺ ہو یا تاریخی مقالات، سب کا بنیادی مقصد ایک تھا، یعنی عظمت رفتہ کی بازیافت۔غالب نے تیموریوں کی عظمت بیان کی مگر اس سے آگے نہ بڑھ سکے بلکہ اسے پایہ تکمیل تک نہ پہنچا سکے، لیکن بہرحال دونوں کا رخ ایک اور دونوں کی لے ایک تھی۔ غالب نے اپنی آنکھوں سے مغلوں کی بربادی اور ۱۸۵۷ء کی قیامت دیکھی تھی اور شبلی اسی قیامت میں پیدا ہوئے تھے۔کافر فرنگیوں کا عہد شباب شبلی نے دیکھا، غالب اس سے پہلے ہی آخرت کو

سدھارے۔ وہ کچھ دن اور زندہ رہتے تو ان کی ذہانت، طباعی اور حسی شعور کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کا بھی وہی نقطہ نظر ہوتا جو شبلی کا تھا، لیکن شبلی عالم تھے بلکہ اول و آخر عالم تھے۔ اسلام اور اسلامی اقدار و روایات انہیں بہت عزیز تھیں۔ ان پر وہ کسی قسم کی حرف گیری برداشت نہیں کر سکتے تھے، جب کہ غالب مست الست، سرشار لم یزل اور آدھے مسلمان تھے، لیکن بہر حال تہذیبی اور تمدنی نقطہ نظر قدر مشترک تھا۔ یہ فطری اور غیر طبعی اشتراک اپنی جگہ، شبلی کی شخصیت ہمہ جہت بلکہ جامع کمالات تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کا دائرہ کار بھی بہت وسیع ہے اور اس دائرے میں ان کی غالب شناسی بھی شامل ہے۔

شبلی دیوان غالب کو دل سے پسند کرتے تھے۔ (۱۰) ان کے قصائد، غزلیات اور خاص طور سے ان کی مکتوب نگاری کے نہ صرف مداح تھے بلکہ متبع بھی، لیکن ایک نقاد کی حیثیت سے شبلی نے بعض تنقیدیں بھی کی ہیں۔ جن پر بحث و تحقیق ہو سکتی ہے، تاہم شبلی کو منکر غالب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ انہوں نے خواجہ حالی کی طرح ''یادگار غالب'' نہیں لکھی بلکہ ایک موقع پر ان کے ماموں زاد بھائی شیخ رشید الدین انصاری نے اس کی طرف متوجہ کیا تو انہوں نے لکھا کہ:

> ''مرزا غالب کے حالات و ریویو مولوی حالی صاحب نے جس تفصیل سے لکھے ہیں، اس کے بعد کسی اور کتاب کی کیا ضرورت ہے۔'' (۱۱)

مولانا حالی اور ''یادگار غالب'' کی اس سے بڑھ کر تحسین و ستائش اور کیا ہو سکتی ہے۔؟ بلا شائبہ مبالغہ حالی کی ''یادگار غالب'' ایک بھرپور اور معرکہ آرا تصنیف ہے۔ مرزا غالب پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور آئندہ بھی لکھا جاتا رہے گا، مگر واقعہ یہ ہے کہ خواجہ حالی کی اس تصنیف سے کوئی اہل قلم بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ اسے ہم ایک شاگرد کا نذرانہ عقیدت بھی قرار دے سکتے ہیں، اس کے باوجود اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے۔

علامہ شبلی نے غالب کا متعدد مقامات پر ذکر کیا ہے۔ شعر العجم، موازنہ انیس و دبیر، بعض مقالات اور متعدد مکاتیب میں غالب کا ذکر آیا ہے۔ ان کی عظمت کا اعتراف ہے۔ ان کی شاعرانہ انفرادیت کا بیان ہے۔ حیرت ہوتی ہے اس کے باوجود ڈاکٹر شعیب اعظمی نے انہیں منکر غالب کیونکر قرار دیا ہے۔ یہ شبلی کے ساتھ انصاف نہیں بلکہ مولوی عبدالحق کی پیروی ہے۔

علامہ شبلی کی غالب شناسی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ انہوں نے خطوط نگاری میں ان کا تتبع کیا بلکہ ان کے رنگ میں رنگ ملا دیا۔ یہ ان کی شعوری کوشش کا نتیجہ ہے۔ غالب کے مقبول عام اشعار اور ان کے مصرعوں کا استعمال شبلی کے مطالعہ غالبیات کا ایک اہم پہلو ہے۔ دراصل مکتوب نگاری میں شبلی نے غالب کی مکتوب نگاری کے رویے اور روایت کو فروغ دیا ہے۔ یہاں اس کا ایک اجمالی تجزیہ پیش کیا جاتا ہے۔

ا۔ شعر العجم جلد دوم میں علامہ شبلی نے امیر خسرو کے حالات اور کمالات شاعری پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔ خاص طور سے ان کی غزلوں کی انفرادیت اور ان کے جدت اسلوب کو بیان کیا ہے۔ اس وصف خاص میں شبلی نے امیر خسرو کا سعدی شیرازی کے ایک شعر سے موازنہ کر کے امیر خسرو کی برتری دکھلائی ہے اور پھر امیر خسرو کی اس برتری پر غالب کی برتری ثابت کی ہے اور غالب کا یہ شعر:

نظر کہیں نہ لگے ان کے دست و بازو کو
یہ لوگ کیوں مرے زخم جگر کو دیکھتے ہیں

نقل کر کے لکھا ہے کہ غالب نے اسے اور زیادہ بدیع اور شوخ کر دیا ہے۔ (۱۲)

۲۔ غالب نے نثر و نظم دونوں میں انفرادیت قائم کی۔ ان کی اس خصوصیت کا اعتراف تمام نقادوں نے کیا ہے، حتیٰ کے غالب شکن یگانہ بھی اس کے معترف تھے۔ شبلی بھی اس کے معترف ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ مرزا غالب جس طرف متوجہ ہوتے اپنا کوچہ الگ نکال لیتے تھے۔ (۱۳) شبلی کا یہ بھی خیال تھا کہ جس طرح میر تقی میر کی غزلیت اور درد کا تصوف، شاعری کی جان ہیں۔ اسی طرح مرزا غالب کا فلسفہ بھی شاعری کی جان ہے۔ (۱۴)

۳۔ شبلی انیس کی شاعری کے بڑے دلدادہ تھے اور اس کا بڑی باریک بینی اور گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ موازنہ انیس و دبیر کے علاوہ شعر العجم اور اپنے بعض مقالات میں بھی میر انیس کا ذکر کیا ہے۔ اکثر ان کے اشعار اور مصرعے بہ طور نمونہ اپنی تحریروں میں نقل کر جاتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ وہ میر انیس کی سادگی، شگفتگی اور برجستگی کے بڑے قائل تھے۔ اس سے یہ خیال کرنا کہ وہ انیس کو غالب پر ترجیح دیتے تھے۔ دیانت داری نہیں۔ اکثر نقادوں کی طرح شبلی بھی

غالب کی ایک بڑی خوبی یعنی ان کے فلسفہ شاعری کے قائل اور قدرداں تھے۔(۱۵)

علامہ شبلی خود ایک بڑے فلسفی تھے۔منطق وفلسفہ انہوں نے بڑی محنت سے پڑھا تھا۔اس پر ان کی گہری نگاہ تھی۔ان کے فلسفیانہ مضامین [مقالات جلد ششم] سے واضح ہوتا ہے کہ وہ دور آخر کے ایک بڑے ماہر فلسفہ تھے۔غالب پر لکھتے ہوئے نقادوں نے ان کے فلسفہ شاعری پر جو بحث کی ہے، شبلی کا تصور اس سے قدرے مختلف ہے۔ان کا خیال تھا کہ عالم میں جو کچھ موجود ہے اور کاروبار زندگی کی روزمرہ باتیں اگر نگاہ حقیقت سے دیکھی جائیں تو یہ سب فلسفہ ہیں۔(۱۶) علامہ شبلی کے اس فلسفیانہ نقطۂ نظر سے اگر دیکھا جائے تو مرزا غالب کے فلسفہ شاعری کی عظمت دو چند ہو جاتی ہے۔

۴۔شبلی نے شعرالعجم میں فارسی قصیدہ گوئی کی تاریخ پر طویل تبصرہ کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ تکلف اور عیش پرستی بڑھی تو قصائد غزل بن کر رہ گئے، لیکن قاآنی کا دور آیا تو قدما کا دور واپس آ گیا۔ایران کے اس انقلاب کی خبر ہندوستان میں فارسی شعرا کو نہ ہوئی لیکن یہاں خود بہ خود ایک انقلاب برپا ہو گیا اور اس انقلاب کا سہرا مرزا غالب کے سر ہے۔غالب کے اس انقلاب انگیز پہلو کے بارے میں شبلی لکھتے ہیں:

> ''شاعری کا مذاق جو ناصر علی کی بہ دولت سیکڑوں برس سے چلا آتا تھا درست ہو چلا۔مرزا غالب نے شاعری کا انداز بالکل بدل دیا۔ابتدا میں وہ بھی بیدل کی پیروی کی وجہ سے غلط راستے پر پڑ گئے تھے، لیکن عرفی، طالب آملی، کلیم کی پیروی نے ان کو سنبھالا۔چنانچہ دیوان فارسی کے خاتمہ میں اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔'' (۱۷)

علامہ شبلی کا یہ بھی خیال ہے کہ

> ''مرزا غالب نے قصیدہ میں متوسطین اور قدما کی روش اختیار کی، اگرچہ قصائد میں متاخرین کی بدعتیں بلکہ خامیاں بھی پائی جاتی ہیں، لیکن اخیر اخیر میں کج پیچ نکل گئی اور بالکل اساتذہ کا رنگ آ گیا۔مثلاً یہ قصیدہ:
>
> منم کہ بر دل و دیں خود اعتمادم ہست

بہ نیم غمزہ ہم ایں را ربائی ہم آں را
ترا کہ ابر مطیع است و باد فرماں بر
بزن بہ باغ سرا پردہ سلیماں را

بقول شبلی بہار آرائی کے بعد مدح کی طرف کس خوبی سے گریز کیا ہے۔

تو باغ و راغ بیار آئی خواجہ من ضامن
کہ آورم بہ تماشا خدیو گیہاں را

غالب کے اجتہادات اور جدت طبع کا بھی علامہ شبلی نے برملا اظہار واعتراف کیا ہے۔ قصیدہ نگاری ہی کے ضمن میں لکھتے ہیں:

''مرزا غالب کی طبیعت میں نہایت شدت کے ساتھ اجتہاد اور جدت کا مادہ تھا، اس لیے اگر چہ قدما کی پیروی کی وجہ سے نہایت احتیاط کرتے ہیں، تاہم اپنا خاص انداز بھی نہیں چھوڑتے۔ مثلاً ایک قصیدہ میں لکھتے ہیں:

خاک کوشِ خود پسند افتادہ در جذب سجود
سجدہ از بہر حرم نگذاشت در سیمائے من

اصل مضمون صرف اس قدر ہے کہ میں حرم کے بجائے ممدوح کی خاک پر سجدہ کرتا ہوں۔ اس کو یوں ادا کرتے ہیں کہ خاک کوکی شکایت کرتے ہیں کہ نہایت مغرور اور خود پسند ہے۔ چنانچہ میری پیشانی میں ایک سجدہ حرم کے لیے نہیں چھوڑا۔

عاجز چوں در ثنائے دوست بار شکم چہ کار
می روم از خویش تا گیرد عطارد جائے من

یعنی مجھ سے ممدوح کی تعریف ادا نہیں ہوسکتی تو رشک سے کیا فائدہ، میں اس کام سے دست بردار ہو جاتا ہوں کہ عطارد آ کر اس کام کو انجام دے۔'' (۱۸)

۵۔علامہ شبلی نے مداح ہونے کے باوجود غالب کو اہل زبان تسلیم نہیں کیا۔ ایک بار مولانا حبیب الرحمٰن شروانی نے اپنی غزل میں ''انداز'' کا لفظ استعمال کیا تو علامہ شبلی نے اسے پسند نہیں کیا۔ شروانی صاحب نے غالب کا حوالہ دیا تو انہوں نے لکھا کہ ''انداز'' کا لفظ مرزا غالب کے

اشعار میں یاد تھا، لیکن چوں کہ وہ اہل زبان نہیں اس لیے شبہ تھا۔ (۱۹) یہ غالب کی تحقیر نہیں بلکہ حقیقت بیانی تھی کہ مرزا غالب اہل زبان نہ تھے۔ جن کی نظر علامہ شبلی کے بلند ادبی وتنقیدی شعور پر نہیں ہے وہ یقیناً اسے غالب کی عظمت پر حرف گیری تصور کریں گے لیکن یہ کون دعوی کر سکتا ہے کہ مرزا غالب اہل زبان تھے۔

۶۔ غالب اور شبلی دونوں اردو کے بڑے مکتوب نگار ہیں اور دونوں نے مکتوباتی ادب کا ایک بڑا قیمتی ذخیرہ یادگار چھوڑا ہے۔ عود ہندی اور اردوئے معلیٰ اگر غالب کی یادگار ہیں تو مکاتیب شبلی، خطوط شبلی اور مکتوبات شبلی شبلی کی یادگار ہیں۔ زبان کے لحاظ سے، ادبی لطافت کے اعتبار سے، اپنے عہد کی مصوری ومنظر کشی کے لحاظ سے، علمی، تہذیبی اور تمدنی لحاظ سے، مکاتیب کا یہ سرمایہ بڑا قیمتی ذخیرہ ادب ہے۔ غالب کے خطوط سے شبلی کے خطوط تک نثری ادب نے ارتقا کی جو منزلیں طے کی ہیں، ان کی آواز بازگشت بھی علامہ شبلی کے خطوط میں سنائی دیتی ہے۔ دراصل علامہ شبلی کے خطوط غالب کی مکتوب نگاری کی ترقی یافتہ شکل ہیں۔ غالب کی مکتوب نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے مکاتبہ کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ اس میں ان کا کوئی حریف نہیں۔ ان کی اس خوبی اور جدت طبع کا ذکر کرتے ہوئے علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ:

> ''آثار الصنادید جس زمانہ میں نکلی، اس کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد دلی کے مشہور شاعر مرزا غالب نے اردو کی طرف توجہ کی یعنی مکاتیب وغیرہ اردو میں لکھنے شروع کیے اور چوں کہ وہ جس طرف متوجہ ہوتے تھے اپنا کوچہ الگ نکال کر رہتے تھے، اس لیے انہوں نے تمام ہم عصروں کے برخلاف مکاتبہ کو مکالمہ کر دیا۔ مکاتیب میں وہ بالکل اس طرح ادائے مطلب کرتے تھے جیسے دو آدمی سامنے بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ بہت سے خطوط میں انسانی جذبات مثلاً رنج وغم، مسرت و خوشی، حسرت و بے کسی کو نہایت خوبی سے ادا کیا ہے۔ اکثر جگہ واقعات کو اس بے ساختگی سے ظاہر کیا ہے کہ واقعہ کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کہنا بیجا نہیں کہ اردو انشا پردازوں کا آج جو انداز ہے اور جس کے مجدد اور امام سرسید مرحوم تھے، اس کا سنگ بنیاد دراصل مرزا غالب نے رکھا تھا۔'' (۲۰)

مرزا غالب کی مکتوب نگاری پر ہماری زبان میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ کئی کتابیں اور تحقیقی مقالات شائع ہو چکے ہیں۔ سیکڑوں مضامین میں غالب کی مکتوب نگاری پر مفصل نقد و تبصرہ لکھا گیا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ سب علامہ شبلی کے اسی متن کی دراصل تشریح و تعبیر ہیں۔ اس سے بڑھ کر مرزا صاحب کی اور کیا تعریف و تحسین ہو سکتی ہے۔ یہ دراصل اپنے عہد کے سب سے بڑے مکتوب نگار کے احساسات ہیں، جس نے ماضی کے سب سے بڑے مکتوب نگار اور موجد فن کا تجزیہ کیا ہے۔

اگر فراخ دلی سے کام لیں اور ایک قدم اور آگے بڑھ کر دیکھیں تو محسوس ہوگا کہ علامہ شبلی نے غالب کی مکتوب نگاری کی جن خصوصیات کا ذکر کیا، تقریباً وہ تمام خوبیاں خود ان کے مکتوباتی ادب کا حصہ ہیں اور اگر انصاف کیا جائے تو یہ حقیقی تصویر سامنے آجائے گی کہ شبلی کے خطوط غالب کے خطوط سے زیادہ زندگی کے ترجمان ہیں اور ان سے انسانی زندگی کی عکاسی زیادہ بہتر طور پر ہوتی ہے لیکن اس تجزیے میں عہد و ماحول کا بڑا دخل ہے۔ غالب اپنے دور کے نمائندہ تھے اور شبلی اپنے عہد کے علم بردار ہیں۔ غالباً اسی بنیاد پر پروفیسر خورشید الاسلام نے مکاتیب شبلی کو ''قومی اعمال نامہ'' سے تعبیر کیا ہے۔

علامہ شبلی کے خطوط میں اثرات غالب صاف اور نمایاں طور پر نظر آتے ہیں بلکہ کہیں کہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالب کے خطوط سامنے رکھ کر شبلی نے خط لکھا ہے۔ مولوی محمد سمیع کے نام ایک خط میں غالب کا تتبع صاف ظاہر ہو رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''بھئی کچھ سنا ہے۔ (محمد سمیع) خیر تو ہے۔ ہاں ایک تازہ واقعہ ہے، میاں شبلی کا انتقال ہو گیا۔ (محمد سمیع) ارے سچ نہیں جھوٹ ہوگا۔ ابھی ہفتہ بھی نہیں ہوا ان کا ایک خط میرے نام آیا تھا۔ (مولوی محمد عمر صاحب) لو تم نے آج سنا ہے۔ اجی اس کو تو کئی دن ہوئے۔ انہوں نے جو کتابیں بھیجی تھیں، اس کی رسید بھی تو میں نے اسی وجہ سے نہیں دی۔ (محمد سمیع) انا للہ، افسوس ابھی مرنے کے کوئی دن نہ تھے۔ (حمید) ہاں واقعی سخت رنج ہے مگر تقدیر سے کس کا زور چلتا ہے۔ (اور دبی زبان سے) ارے میاں چلو قصہ پاک ہوا۔ آئے دن کی حکومتوں سے ناک میں دم آگیا۔ بھلا روئداد

خیر ایک بار کا کام تھا لکھ بھی لیا اب روز روز مدرسہ میں لڑکوں کو مسودہ لکھاتے پھرو۔ اس پر طرہ یہ کہ ہفتہ وار مدرسہ کی رپورٹ لکھ کر ان کے پاس بھیجتے رہو۔ اچھی خاصی بیگاری بھگتا کرو۔ (عبدالغفور) ارے میاں خیر مرنا تو سب کے لیے ہے۔ ہاں ان کے خط کا جواب رہ گیا مگر یہ بھی کوئی زبردستی ہے، جی نہ چاہے تو مفت کی محنت کون گوارا کرے۔ (حافظ علی حسن) لو اب کی ان کو خط لکھتے لکھتے رہ گیا۔ امتحان کا حال لکھنا تھا اور جو کچھ ہو آدمی تو مزے کا تھا۔ دو گھڑی کیفیت رہتی تھی۔ (مولوی محمد عمر صاحب) بھئی کیا کہیئے دل لگی ہی جاتی رہی اور تو کس کام کا آدمی تھا مگر ہاں ذرا جی بہل جایا کرتا تھا۔ (مولوی احمد اللہ) اجی جی کیا بہلتا تھا، دنیا بھر کی شکایتیں ہوا کرتی تھیں۔ کبھی ان کی نقل کی، کبھی ان کا خاکہ اڑایا اور اس کے سوا ان کا کام ہی کیا تھا۔ چلو اچھا ہوا۔'' (۲۱)

غالب کے مکاتبہ کو مکالمہ بنانے کی جس خوبی کا شبلی نے اعتراف کیا ہے اور جسے انہوں نے غالب کی انفرادیت قرار دیا ہے کیا یہ اس کا صریح تتبع نہیں۔؟

خطوط نگاری سے جس قدر دلچسپی غالب کو تھی اور جس قدر وہ خطوط اور کے جوابات لکھنے کا اہتمام کرتے تھے اور جس طرح اپنے احباب، معاصرین بالخصوص شاگردوں کے خطوط کے وہ منتظر رہتے تھے، علامہ شبلی بھی اسی قدر خطوط کے دلدادہ تھے۔ اسی اہتمام سے خطوط اور اس کے جوابات لکھتے، بلکہ ایک قدم اور آگے بڑھ کر اپنے شاگردوں کے خطوط تحریر نہ کرنے پر رنجیدہ ہوتے۔ سید سلیمان ندوی اور عبدالسلام ندوی کے نام کئی خطوط میں اس کا برملا اظہار ملتا ہے اور کئی خطوط میں اس ناگواری کا ذکر ہے۔

خطوط کا جواب وہ بروقت دیدیتے تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ ہم لوگ اندازہ کر کے ان کو خط لکھتے کہ فلاں دن جواب آجائے گا اور اسی دن جواب آجاتا۔

ابتداء میں مرزا غالب اپنے خطوط کی اشاعت کے حق میں نہ تھے اور علامہ شبلی بھی اسے ناپسند کرتے تھے۔ مرزا غالب ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اردو کے جو خطوط آپ چھاپا چاہتے ہیں، یہ بھی زائد بات ہے۔ کوئی رقعہ

ایسا ہوگا جو میں نے قلم سنبھال کر اور دل لگا کر لکھا ہوگا، ورنہ تحریر سرسری ہے۔ اس کی شہرت میری سخنوری کے شکوہ کے منافی ہے۔ اس سے قطع نظر کیا ضرور ہے کہ آپس کے معاملات اوروں پر ظاہر ہوں۔ خلاصہ یہ کہ ان رقعات کا چھاپہ مرے خلاف طبع ہے۔'' (۲۲)

بالکل یہی خیال علامہ شبلی نعمانی کا ہے۔ وہ اپنے ماموں زاد بھائی شیخ رشید الدین انصاری کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میرے خطوط بالکل بدمزہ ہوتے ہیں۔ ان کو کیا جمع کرتے ہو۔ مجھ کو خود مزہ نہیں آتا تو اوروں کو کیا آئے گا۔'' (۲۳)

لیکن پھر دونوں اپنے اپنے خطوط کی اشاعت پر راضی ہو گئے۔ مرزا غالب لکھتے ہیں:

''اجی منشی ممتاز علی کیا کر رہے ہیں۔ رقعے جمع کیے نے چھپوائے۔ فی الحال پنجاب احاطہ میں ان کی بڑی خواہش ہے۔ میرے خطوط آپ کو پہنچے ہیں، وہ سب یا ان سب کی نقل بہ طریق پارسل آپ مجھ کو بھیج دیں۔'' (۲۴)

اسی طرح علامہ شبلی مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''سید سلیمان میرے کچھ خطوط جمع کر رہے۔ کیا آپ کے پاس بھی میرے کچھ ہفوات غلطی سے محفوظ ہوں گے۔'' (۲۵)

غالب تو احباب و معاصرین کے آگے سرِ تسلیم خم کرنے پر مجبور ہو گئے اور ان کے خطوط کے دونوں مجموعے ان کی زندگی ہی میں شائع ہو کر ان کی شہرت و ناموری کا باعث ہوئے، مگر شبلی اپنے شاگرد خاص سید سلیمان ندوی کے اصرار سے کسی طرح اس کی طرف متوجہ ہوئے مگر ان کے خطوط کی اشاعت کا موقع بہر حال ان کی وفات کے بعد آیا۔ مکاتیب کی دونوں جلدیں اور عطیہ فیضی و زہرا بیگم کے نام کے خطوط شبلی سب کے سب شبلی کی وفات کے بعد شائع ہوئے۔ تاہم یہ خطوط بہر حال شبلی کی جامع کمالات شخصیت اور ادبی کمالات کا ایک نمونہ ہیں۔

غالب کو ہندوستانی شہروں میں کلکتہ سے عشق ہوا۔ اس کی تمام تفصیلات ڈاکٹر خلیق انجم نے اپنی کتاب ''غالب کا سفر کلکتہ اور کلکتے کا ادبی معرکہ'' میں قلم بند کر دی ہیں۔ مرزا غالب کے یہ

اشعار کلکتہ کی تاریخ میں ہمیشہ یادر کھے جائیں گے:

کلکتے کا جو ذکر کیا تونے ہم نشیں   اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے
وہ سبزہ زار ہائے مطرا کہ ہے غضب   وہ نازنیں بتان خود آرا کہ ہائے ہائے
صبر آزما وہ ان کی نگاہیں کہ حف نظر   طاقت ربا وہ ان کا اشارہ کہ ہائے ہائے

شبلی بھی کلکتہ کے کچھ کم شیدائی نہیں تھے، متعدد سفر کیا۔ ایک نامعلوم شی برج خا کی پر فدا ہوئے۔ تاہم ان کا سب سے محبوب شہر بمبئی ہی تھا۔ وہ بمبئی پر ہر متاع کہنہ ونو کو نثار کرتے ہیں:

نثار بمبئی کن ہر متاع کہنہ و نورا   طراز مسند جمشید و فرتاج خسرو را
بہ ہر سو از ہجوم دلبران شوخ و بے پروا   گذشتن از سر رہ مشکل افتاد است رہرو را
بدہ ساقی مے باقی کہ در جنت نہ خواہی یافت   کنار آب چو پاٹی و گلگشت اپالو را

جس طرح غالب کلکتے کا مختلف پیرائے میں ذکر کرتے ہیں، اسی طرح علامہ شبلی بھی بمبئی پر سو سو جان سے مرتے ہیں۔ ایک مرتبہ وہ بمبئی حاضر ہوئے۔ ابھی سیری بھی نہیں ہوئی تھی کہ ندوہ کے کسی کام سے انہیں بمبئی کو خیر باد کہنا پڑا۔ اس وقت کی کیفیت ملاحظہ ہو:

> ''بمبئی سے اس طرح نکلا جس طرح مرحوم شداد نے بہشت عدن کو خیر باد کہا تھا۔ بمبئی میں عجیب رنگین صحبتیں رہیں۔ آنکھوں میں اب تک وہ تماشا پھر رہا ہے۔ ترسا زادے بمبئی کے ایوان جمال کے جھوٹے طلسم ہیں۔ سچی تصویریں الگ ہیں۔ عراقی بھی، ایرانی بھی اور خال خال ہندی بھی۔'' (۲۶)

غالب اور شبلی کے خطوط میں طرز ادا اور اسلوب نگارش میں بھی بڑی مماثلت اور یکسانیت پائی جاتی ہے۔ زندگی اور اس کے نشیب وفراز میں بھی دونوں بڑی حد تک مماثل نظر آتے ہیں۔ اس کی تفصیل طوالت کے سبب قلم انداز کی جاتی ہے۔ البتہ یہاں اس بات کا ذکر ضروری ہے کہ شبلی کے خطوط غالب کے مقابلہ میں بہت سی باتوں میں انفرادیت کے حامل ہیں۔ مثلاً علامہ شبلی محض ادیب وشاعر اور انشا پرداز نہ تھے بلکہ ایک محقق، مصنف، مورخ اور ادیب ونقاد بھی تھے۔ عالم اسلام کی بیداری کے خواہاں اور نشاۃ ثانیہ کے علم بردار بھی تھے۔ محبّ وطن اور انگریز دشمن تھے۔ ہندو مسلم اتحاد اور جذباتی ہم آہنگی کے علم بردار تھے۔ ماہر تعلیم تھے۔ علوم اسلامیہ پر مجتہدانہ نگاہ

رکھتے تھے۔اردو میں علم الکلام اور تاریخ ادبیات ایران کے زبردست پارکھ تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سیرت نگار رسول اعظم تھے،ان کی یہ تمام جہتیں ان کے خطوط میں موجود ہیں،اسی بنیاد پر پرفیسر خورشید الاسلام نے ان کے خطوط کو قومی اعمال نامہ قرار دیا ہے۔(۴۷) ان تمام امور سے خطوط غالب نہ صرف خالی ہیں بلکہ ان کا شائبہ بھی نہیں۔اس کے باوجود خطوط غالب زندہ اور جاوداں ادب کا حصہ ہیں۔واقعہ یہ ہے کہ جس طرح غالب و شبلی کے ذکر کے بغیر ہماری ادبی تاریخ نامکمل ہوگی،اسی طرح غالب و شبلی کے خطوط کے ذکر کے بغیر مکتوباتی ادب کی تاریخ لکھی ہی نہیں جاسکتی۔

مرزا غالب کی طرح علامہ شبلی کی فارسی شاعری بھی اعلی پایہ کی ہے۔حتی کہ ایرانی انداز میں، ایرانی محاوروں کے ساتھ دادسخن دی ہے۔حرف عشق کے بیان کرنے میں دونوں کو کمال مہارت حاصل ہے۔شبلی کی اردو شاعری کی طرح ان کی فارسی شاعری کی طرف بھی نقادوں نے کم ہی توجہ کی، تاہم چند بڑے نقادوں نے دونوں کی شاعرانہ عظمت ، بلندی اور سخن سنجی کی داددی ہے۔یہ عام خیال ہے کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کا خاتمہ مرزا غالب کی شاعری پر ہوا،مگر مولانا ابوالکلام آزاد جیسے سخن فہم نے اس سے انکار کیا ہے اور لکھا ہے کہ ہندوستان میں فارسی شاعری کا خاتمہ غالب پر نہیں شبلی پر ہوتا ہے۔

اس حوالہ سے قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ شبلی نے نہ صرف واردات حسن وعشق بیان کرنے میں غالب کا تتبع کیا ہے بلکہ ان زمینوں میں بھی دادسخن دی ہے جو خالص غالب کی زمینیں خیال کی جاتی ہیں۔

علامہ شبلی نے اپنی اردو شاعری کو ذریعہ افتخار تصور نہیں کیا۔حالانکہ وہ کسی نوعیت سے کم مایہ نہ تھی۔یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ علامہ شبلی کی اردو شاعری کی فضا بھی آہنگ غالب سے معمور ہے۔وہ جابجا نظموں اور غزلوں میں حتی کہ قطعات میں بھی غالب کے اشعار اور مصرعے شامل کردیتے ہیں۔مثلاً

جناب لیگ نے سب کچھ یہ سن کے فرمایا
مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو بجا کہئے

یہی نہیں مضامین اور معنی و مفہوم تک سے غالب کی مضبوط گرفت عیاں ہوتی ہے اور

بقول پروفیسر خالد محمود:

> ''شبلی غالب سے اس درجہ متاثر ہیں کہ وہ جب بھی غزل کہتے ہیں انہیں غالب یاد آجاتے ہیں۔ بلحاظ فن تو نہیں فکری اعتبار سے وہ ضرور غالب کے زیر اثر ہیں۔''(۲۸)

پروفیسر خالد محمود نے اس موضوع یعنی شبلی کی اردو شاعری اور غالب پر اپنی تازہ کتاب ''تفہیم و تعبیر'' میں بہت اچھا تجزیہ کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ شبلی کی اردو شاعری کی فضا بھی غالب کے رنگ و آہنگ سے معمور ہے۔ ○

حوالے

(۱) سید سلیمان ندوی، مقدمہ کلیات شبلی، ص ۷، دارالمصنّفین اعظم گڑھ

(۲) سلام سندیلوی، شبلی کی اردو شاعری، مشمولہ ادیب علی گڑھ، ص ۱۵۴، ۱۹۶۰ء

(۳) مقدمہ، کلیات شبلی، ص ۳ مطبوعہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ

(۴) سیرۃ النعمان، ص ۲ مطبوعہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ

(۵) مقالات احسان، ص ۶۳ معارف پریس اعظم گڑھ ۱۹۶۸ء

(۶) کاروان خیال، ص ۹۳

(۷) مکاتیب شبلی، جلد اول، ص ۷۰-۷۱ مطبوعہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ

(۸) بحوالہ حیات شبلی ص ۸۰۶

(۹) دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات، محمد الیاس الاعظمی، ص ۹۷-۹۰، خدابخش لائبریری پٹنہ، ۲۰۰۲ء

(۱۰) مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۲۳۵

(۱۱) مکاتیب شبلی، جلد اول، ص ۳۲۴

(۱۲) شعر العجم، جلد دوم، ص ۱۵۶

(۱۳) مقالات شبلی جلد دوم ص ۵۹

(۱۴) موازنہ انیس و دبیر، ص ۱

(۱۵) حیات شبلی، ص۲۸۲

(۱۶) شعر العجم، جلد پنجم، ص۲۰۵

(۱۷) ایضاً، ص۲۱

(۱۸) ایضاً، ص۲۱۔۲۲

(۱۹) مکاتیب شبلی، جلد اول، ص۱۳۰

(۲۰) مقالات شبلی، جلد دوم، ص۵۹۔۶۰

(۲۱) مکاتیب شبلی، جلد اول، ص۶۲۔۶۳

(۲۲) اردوئے معلیٰ، ص۳۷۵

(۲۳) مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص۳۲۴

(۲۴) ذکر غالب، از مالک رام، ص۱۶۹

(۲۵) مکاتیب شبلی، جلد اول، ص۱۷۹

(۲۶) ایضاً، ص۱۷۱

(۲۷) پروفیسر خورشید الاسلام، تنقیدیں، ص۱۶، علی گڑھ

(۲۸) پروفیسر خالد محمود، تفہیم و تعبیر ص۸۶، مکتبہ جامعہ دہلی، ۲۰۱۷ء

○○○

[۴]

علامہ شبلی، ڈپٹی نذیر احمد اور اعظم گڑھ

ڈپٹی نذیر احمد دہلوی[۱۸۳۶-۱۹۱۲ء]اردو کے بنیاد گذاروں میں ہیں۔انہوں نے اردو زبان وادب کی بے انتہا خدمات انجام دیں۔اردو میں ناول نگاری کی طرح انھیں نے ڈالی اور ایسے شاہ کار ناول قلم بند کئے کہ زمانہ گذرنے کے باوجود ان کی افادیت میں اب تک کمی واقع نہیں ہوئی۔مرأۃ العروس،توبتہ النصوح، بنات النعش ،ابن الوقت،رویائے صادقہ اور فسانہ مبتلا وغیرہ ان کے مشہور ناولوں کے نام ہیں۔

ان کو عربی، فارسی اور انگریز زبانوں پر عبور حاصل تھا۔وہ ایک بڑے مترجم بھی تھے۔ان کے قلم سے متعدد ترجمے شائع ہوئے۔ترجمہ قرآن مجید،تعزیرات ہند،قانون انکم ٹیکس، قانون شہادت وغیرہ ان کے تراجم سے ذخیرہ اردو میں گراں قدر اضافہ ہوا۔یہی نہیں ان کے ناولوں سے معاشرتی لحاظ سے بھی بڑا فائدہ پہنچا۔

ڈپٹی نذیر احمد ایک بڑے مقرر اور خطیب بھی تھے۔انجمن حمایت اسلام لاہور، ایجوکیشنل کانفرنس اور طبیہ کالج دہلی وغیرہ کے جلسوں میں وہ خاص طور پر مدعو کئے جاتے۔ بڑے اہتمام سے شریک ہوتے اور خطاب کرتے۔ان کے خطبات میں بڑا تنوع ہوتا تھا۔موضوع کا حق ادا کردیتے۔ان کے خطبات کی ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ بڑے معلومات افزا اور پُر اثر ہوتے تھے، جن سے مجمع پر سحر طاری ہوجاتا تھا۔ان کے خطبات دو جلدوں میں شائع ہوچکے ہیں۔ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے بیانات کو قرآن واحادیث اور تاریخی واقعات سے مدلل کرتے تھے اور چونکہ وہ دہلوی تھے اور دہلی کی ٹکسالی زبان بولتے اور لکھتے تھے،اس لئے ان کی تحریر وتقریر میں ایک خاص قسم کی فضا پیدا ہوجاتی تھی اور یہی وجہ ہے کہ ان کے خطبات بعض اوقات روکھے پھیکے

ہوجاتے تھے۔

وہ اگرچہ بجنور اتر پردیش میں پیدا ہوئے، لیکن ان کی تعلیم و تربیت دہلی کالج میں ہوئی، بعدازاں انھوں نے اپنی محنت سے انگریزی زبان میں بڑی مہارت پیدا کی۔اور اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر پہلے تحصیلدار، پھر ڈپٹی کلکٹر مقرر ہوئے۔گورکھپور، کان پور، جالون اور اعظم گڑھ وغیرہ اضلاع میں وہ مختلف وقتوں میں تعینات رہے۔استاذ گرامی ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی [۱۹۳۶-۲۰۰۵ء] نے ''ڈپٹی نذیر احمد شخصیت اور کارنامے'' کے عنوان سے تحقیقی مقالہ لکھ کر پی، ایچ، ڈی کی سند لی تھی۔ان کی تحقیق کے مطابق ڈپٹی نذیر احمد ۱۸۷۲ء سے ۱۸۷۶ء تک ضلع اعظم گڑھ میں ڈپٹی کلکٹر کے عہدہ پر تعینات رہے۔(۱)

یہ وہ زمانہ تھا جب علامہ شبلی نعمانی ابھی زیر تعلیم تھے۔البتہ اس وقت ان کے والد شیخ حبیب اللہ اعظم گڑھ کے نامور وکیل اور میونسپلٹی کے آنریری سکریٹری تھے اور رفاہ عام کے کاموں کی وجہ سے عوام وخواص میں مقبول تھے۔ان کی سوانح پر راقم نے ایک مفصل مضمون لکھا ہے جو پہلے بعض رسائل میں شائع ہوا۔ بعدازاں راقم کی کتاب ''علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط'' میں بطور ضمیمہ شامل کیا گیا ہے۔

شیخ حبیب اللہ [۱۲/نومبر ۱۹۰۰ء] تصوف آشنا اور ایک بزرگ الٰہی شاہ کے مرید تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اپنے بچوں کے نام شبلی وجنید رکھے، مگر جب علی گڑھ تحریک کی باد بہاری چلی تو شیخ صاحب نہ صرف اس سے متاثر ہوئے بلکہ اس کے ایک رکن بن گئے۔سرسید کی ایک بڑی خوبی یہ بھی تھی کہ ان سے ایک بار جو ملا وہ ان کا گرویدہ بلکہ انہی کا ہوکر رہ جاتا تھا۔یہی وجہ ہے کہ ان کے اردگرد مہ ونجوم کی ایک کہکشاں آباد رہی۔چنانچہ سرسید کے غازی پور کے زمانہ قیام میں شیخ حبیب اللہ ان سے بار ہا ملے اور پھر انھیں کے ہوکر رہ گئے۔یہ تعلقات اس قدر گہرے ہوئے کہ اخیر تک باقی رہے۔شیخ صاحب نے علی گڑھ تحریک کو اخلاقی تعاون کے ساتھ مالی تعاون بھی دیا اور سرسید نے بھی انھیں اپنی پیٹریاٹک سوسائٹی کا اعظم گڑھ میں کرسپانڈنگ رکن مقرر کیا۔

شیخ حبیب اللہ نے ابتداً اپنے بچوں کو دینی تعلیم دلائی۔شبلی کو عالم بنایا اور مہدی حسن کو حافظ قرآن۔لیکن جب سرسید کے ہورہے تو انہوں نے اپنے دوسرے بچوں کو انگریزی تعلیم

دلائی۔ شیخ صاحب کے دوسرے بیٹے مہدی حسن علی گڑھ کالج کے ابتدائی طالب علموں میں تھے، پھر لندن جا کر بیرسٹرایٹ لا ہوئے، بعدازاں شیخ صاحب نے اپنے تیسرے بیٹے محمد اسحاق نعمانی، چوتھے بیٹے محمد جنید نعمانی، بھتیجے محمد عثمان اور پوتے حامد حسن نعمانی سب کو علی گڑھ کالج میں داخل کرایا اور سب نے اعلیٰ تعلیم حاصل کر کے بڑے بڑے عہدے حاصل کئے۔تاہم یہ کس قدر عبرت کی بات ہے کہ آج شیخ صاحب کا نام ان کے عالم بیٹے علامہ شبلی ہی کی وجہ سے روشن ہے۔

علی گڑھ کالج کے قیام سے پہلے جب سرسید احمد خاں نے متعدد اضلاع کا دورہ کیا تو وہ اعظم گڑھ بھی آئے۔اعظم گڑھ میں ان کے جلسے کا انتظام ڈپٹی نذیر احمد نے شہر میں ویسلی اسکول میں کیا تھا۔اس تقریب میں اعظم گڑھ کے امراو رؤسا اور ممتاز اشخاص شریک ہوئے، جس میں علامہ شبلی کے والد شیخ حبیب اللہ، ماموں مولوی محمد سلیم وکیل، راجہ سلامت علی خاں وغیرہ کا نام شامل ہے۔اس سے یہ واضح ہے کہ اعظم گڑھ کے ممتاز افراد سے ڈپٹی نذیر احمد کے تعلقات گہرے تھے۔

علامہ شبلی نعمانی کے ایک عزیز شاگرد مولانا ضیاء الحسن علوی ندوی [۱۸۹۱-۱۹۴۵ء] نے اپنی خودنوشت یادایام میں لکھا ہے کہ علامہ شبلی جب لاہور سے مولانا فیض الحسن سہارن پوری [۱۸۱۶-۱۸۸۷ء] سے شرف تلمذ حاصل کر کے اعظم گڑھ لوٹے تو ڈپٹی نذیر احمد نے ان سے کہا کہ ''اجی تم تو بڑے تگڑے نکلے، میرے استاذ سے بھی پڑھ آئے''۔(۲)

علامہ شبلی کے ڈپٹی نذیر احمد سے اس عہد میں جو تعلقات قائم ہوئے وہ مدۃ العمر باقی رہے۔ دونوں کا ایجوکیشنل کانفرنس، انجمن حمایت اسلام لاہور اور بعض دوسرے جلسوں اور کانفرنسوں میں متعدد بار ساتھ رہا۔چونکہ علامہ شبلی ڈپٹی نذیر احمد سے بیس سال چھوٹے تھے، اس لئے وہ ان کی حوصلہ افزائی کرتے رہتے تھے۔اکثر اپنے خطبات میں ان کا نام لے لیتے۔چنانچہ ڈپٹی نذیر احمد کے کئی خطبات میں ان کا ذکر ملتا ہے۔علی گڑھ کے ایک جلسہ کے آغاز میں انھوں نے یہ شعر پڑھا:

تم اپنی نثر کو لو ، نظم کو چھوڑو نذیر احمد
کہ اس کے واسطے موزوں ہیں حالی اور نعمانی(۳)

ایک دوسرے خطبہ میں کہا کہ علامہ شبلی کی یہ خوبی ہے کہ وہ جس موضوع کو اُٹھاتے ہیں اس کو اس کی اصل تک پہنچا دیتے ہیں''۔(۴) اسی طرح ایک جلسہ میں کہا کہ جدید تعلیم یافتہ اشخاص جدید تحقیقات کو علی العموم انگریز سائنس دانوں نیوٹن وغیرہ سے جوڑ دیتے ہیں اور ہمارے مولانا شبلی ثابت کرتے ہیں کہ یہ ایجاد واختراع تو عہد عباسیہ میں ہو چکی تھی۔(۵)

ایک بار علی گڑھ کے اسٹریچی ہال میں ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں کہا کہ''میں نے کسی زمانہ میں عربی اچھی پڑھی تھی، اب تو ایسا ذہول ہو گیا ہے کہ کہ مولوی شبلی ایک صیغہ پوچھ دیں تو بغلیں جھانکنی پڑیں۔'' (۶)

۱۹۰۳ء میں ایجوکیشنل کانفرنس نے اصلاح وترقی کے لئے متعدد شعبے قائم کئے۔صیغہ علمی کا ذمہ دار علامہ شبلی کو بنایا گیا۔ چنانچہ انھوں نے ۴؍جنوری ۱۹۰۳ء کو انجمن ترقی اردو کی ایک کمیٹی تشکیل کی گئی۔جس کے صدر پروفیسر آرنلڈ، نائب صدر ڈپٹی نذیر احمد، مولوی ذکاء اللہ اور خواجہ الطاف حسین حالی قرار پائے۔اس سے خوش ہو کر ڈپٹی نذیر احمد نے علامہ شبلی کو لکھا کہ

> آپ کی جماعت میرے حق میں گمان نیک رکھتی ہے اور اسی وجہ سے آپ نے مہربانی فرما کر کانفرنس کی شاخ ترقی اردو کا وائس پریسیڈنٹ بنا دیا ہے۔ میں اس مہربانی کی جہد المقل تلافی کرنا چاہتا ہوں کہ ترقی اردو میں کچھ مدد دوں۔(۷)

علمی تعاون کے ساتھ انھوں نے مالی تعاون کی بھی پیش کش کی۔(ایضاً) اور نہ صرف پیش کش کی بلکہ عملی طور پر اس میں حصہ لیا۔علمی مشوروں کے ساتھ انھوں نے انجمن کے سلسلہ تراجم کی جانچ پرکھ میں بھی حصہ لیا۔اس کی تفصیل انجمن کی رودادوں میں موجود ہے۔اس کے علاوہ مالی تعاون بھی پیش کیا۔ پہلے پچاس روپیہ دیا، پھر سو روپیہ کا چیک بھیجا۔علامہ شبلی نے انجمن کی روداد ماہ اگست ستمبر ۱۹۰۳ء میں لکھا ہے کہ

> ''جناب شمس العلما مولوی نذیر احمد صاحب ایل،ایل،ڈی نے سو روپیہ کا چیک بنگال بینک شاخ حیدرآباد کے نام انجمن میں بھیج دیا ہے۔مولانا ممدوح کا عطیہ اس لحاظ سے زیادہ شکرگذاری کے قابل ہے کہ انجمن پہلے سے ان کے علمی مشوروں اور رایوں کی ممنون ہے''۔(۸)

ندوۃ قائم ہوا تو ڈپٹی نذیر احمد نے بھی سید محمود اور نواب محسن الملک کی طرح اس کی تائید و حمایت کی۔ تحریک علی گڑھ کے یہ دوسرے ممتاز شخص تھے جنہوں نے تحریک ندوہ کی تائید کی۔ اسی طرح علامہ شبلی کی ادارت میں ماہنامہ الندوہ جاری ہوا تو اس کی تحسین میں عربی میں چند اشعار کہے اور علامہ شبلی کو بھیجا، جس کا مفہوم یہ ہے کہ لوگوں کا خیال ہے کہ فضل و کمال اگلوں کا حصہ تھا، مگر میں نے الندوہ کے صفحے دیکھے تو پایا کہ نہیں فضل و کمال تو پچھلوں کا حصہ ہے۔(۹)

۱۸۷۲ء میں ڈپٹی نذیر احمد کا اعظم گڑھ میں تبادلہ ہوا۔ اس تبادلہ سے وہ بہت خوش تھے۔ ان کا خیال تھا کہ یہاں تصنیف و تالیف کے زیادہ مواقع ملیں گے۔ ایسا کیوں تھا؟ اس کی انھوں نے کوئی صراحت نہیں کی ہے۔ البتہ قیاس ہے کہ دوسرے اضلاع میں ان کی منصبی ذمہ داریاں زیادہ تھیں اور یہاں نسبتاً کم مصروفیات تھیں۔ علاوہ ازیں اور کوئی وجہ تو نہیں ہوسکتی اس لئے کہ اس وقت اعظم گڑھ علم وادب کے لحاظ سے ایسا کوئی قابل ذکر مقام نہیں تھا۔

۱۸۷۲ سے ۱۸۷۶ء تک ڈپٹی نذیر احمد کی مصروفیات کیا تھیں، اس پر پردہ پڑا ہوا ہے، البتہ ان کے ضخیم مجموعہ خطبات کے مطالعہ سے بعض واقعات کی وضاحت ہوتی ہے۔ ایک خطبہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں انھوں نے متعدد علمی وادبی کارنامے انجام دیئے۔ باشندگان اعظم گڑھ اور اس کے ادبا کے لئے یہ کسی بڑی خوشخبری سے کم نہیں کہ ڈپٹی نذیر احمد کا مشہور اور مقبول ترین ناول ''توبتہ النصوح'' یہیں اعظم گڑھ میں لکھا گیا۔ اس کے علاوہ بعض دوسری علمی وادبی کاوشیں بھی اعظم گڑھ کا فیضان ہیں۔

اعظم گڑھ سے پہلے ڈپٹی نذیر احمد گورکھپور میں تعینات تھے۔ گورکھپور سے وہ اعظم گڑھ کس طرح آئے انہیں کی زبانی ملاحظہ ہو :

> میری (گورکھپور میں) تعیناتی اس غرض سے تھی کہ ضلع بستی کے کاغذات بندوبست الگ کردوں۔ جیسا سرکاری کام تھوڑا تھا، ویسا ہی ایک چھوٹا سا کام تصنیف وتالیف کا بھی مل گیا کہ میری پہلی آمد میں ایک مہتمم بندوبست مسٹر لپورون بھی تھے۔ میں ان کا ماتحت تو نہ تھا مگر وہ آدمی تھے علم دوست۔ دو چار ملاقاتوں میں مہربانی فرمانے لگے۔ انھوں نے قانون شہادت پر انگریزی میں ایک عالمانہ متن لکھا اور مجھ

سے اس کے ترجمے کی فرمائش کی۔ رسالہ تو چھوٹا تھا مگر بڑا ہی ادق-ون صاحب نے ترجمہ پسند کیا اور منشی نول کشور کے مطبع میں اس کو چھپوایا بھی۔ پھر مجھ کو نہیں معلوم ہوا کہ اس کا کیا حشر ہوا۔ میں تو اس کا بھی ذکر نہ کرتا مگر آگے چل کر ان ہی لیوروِن صاحب کے ایک فرمائشی ترجمے کا حال بیان کروں گا، جس کی وجہ سے میرے حق میں ایک بڑا مفید نتیجہ مرتب ہوا۔ تفریق کا غذات کا کام پورا ہو گیا تو مجھ کو اعظم گڑھ بھیج دیا۔ کتاب بینی اور تصنیف و تالیف کی لذت تو فرصت ڈھونڈھتی تھی:

جی چاہتا ہے پھر وہی فرصت کے رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کئے ہوئے (۱۰)

مذکورہ بالا اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد اعظم گڑھ کی تعیناتی سے بہت خوش ہوئے۔ انہیں یہ بھی خیال پیدا ہوا کہ یہاں کام کرنے کی آزادی ملے گی۔ اعظم گڑھ کے قیام اور ''توبۃ النصوح'' کی تصنیف کے بارے میں وہ فرماتے ہیں :

''اعظم گڑھ کے قیام کا زمانہ تصنیف و تالیف کے اعتبار سے اچھا کامیاب زمانہ تھا۔ میں نے اعظم گڑھ میں ایک تو توبۃ النصوح لکھی، جو میری تصنیفات میں سب سے زیادہ مقبول ہوئی۔ وہ مذہبی رنگ میں ڈوبی ہوئی تھی اور لاٹ صاحب کو گورنمنٹ کی نیوٹریلٹی کے لحاظ سے تامل تھا کہ وہ اس کو انعامی کتابوں کے شمول میں لے سکتے ہیں یا نہیں؟ مگر کتاب کا پلاٹ کچھ ایسا بن پڑا تھا کہ لاٹ صاحب کو لیتے ہی بن آئی اور کتاب باوجودیکہ اسلام کے سانچے میں ڈھالی گئی تھی مگر اس میں کہیں بھی کوئی ایسی بات نہ تھی جس کو کوئی دوسرے مذہب کا آدمی دیکھ کر بُرا مانے۔ اس پر بھی گورنمنٹ نے ایک ہزار روپیہ اول درجے کا انعام دیا اور انعام سے بڑھ کر یہ ہوا کہ سول سروس کے کورس میں داخل کی گئی۔'' (۱۱)

اس زمانہ میں اعظم گڑھ کی علمی، ادبی، تعلیمی اور معاشرتی حیثیت کیا تھی؟ اس کے بارے میں کوئی عام رائے نہیں ملتی۔ اس لئے توبۃ النصوح پر اعظم گڑھ کا کسی قسم کا کوئی اثر مرتب ہوا یا نہیں؟ اس کے بارے میں رائے قائم نہیں جا سکتی۔ توبۃ النصوح کے تجزیہ نگاروں نے بھی اس

سلسلہ میں کوئی رائے نہیں دی ہے، لیکن اعظم گڑھ کی فضا میں اس قدر عمدہ ناول کی تخلیق خود اس سرزمین کے لئے قابل فخر ہے۔

ڈپٹی نذیر احمد نے اعظم گڑھ میں اس کے علاوہ بھی بعض علمی وادبی کام انجام دیئے۔ یہیں علم ہیئت پر ایک کتاب کا ترجمہ بھی کیا تھا۔اس کی تفصیل پیش کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں:

''قیام اعظم گڈھ کی برکات میں سے ''دی لاسٹ دوناٹ دی بسٹ'' علم ہیاۃ کی مشہور ومقبول کتاب گول منز ہونز کا ترجمہ ہے۔ یہ کتاب ایک فرانسیسی عالم نے لکھی، مضمون تو روکھا پھیکا ہے مگر مصنف نے ایسے دلچسپ پیرائے میں لکھا ہے کہ قصہ معلوم ہوتا ہے۔ پھر وہ جرمن میں ترجمہ ہوئی۔ جرمنی سے انگریزی میں۔اب لیورون صاحب کو خیال آیا کہ اس کو اردو میں کیا جائے، گزٹ میں ایک ہزار روپیہ کے انعام کا اشتہار دیا۔اور مجھ کو چٹھی لکھی کہ میں نے اشتہار تو دیا ہے مگر میری نگاہ تم پر ہی ہے۔ میں نے عذر کیا کہ میں نے تعلیم نسواں کا سلسلہ لے رکھا ہے اور اس میں مجھ کو ابھی کچھ کرنا ہے۔ جب تک بندوبست میں ہوں اس سے زیادہ فرصت نہیں پا سکتا۔مرد بزرگ نے یہ تو نہ کیا کہ کہہ سن کر مجھ کو ضلع میں بدلوا دیتے۔الٹا سر ولیم میور کا دباؤ ڈلوا دیا۔ناچار مجھے ترجمہ کرنا پڑا۔سب ملا کر گیارہ ترجمے ہوئے۔ان میں محاکمہ کرنے کو لیورون صاحب نے نقادانِ فن کی کمیٹی بیٹھائی۔کمیٹی نے میرے ترجمے کو بہتر مانا''۔(۱۲)

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ڈپٹی نذیر احمد اعظم گڑھ کے زمانہ قیام میں تعلیم نسواں کے لئے بھی فکر مند تھے اور انھوں نے اس سلسلہ میں کوئی کام بھی شروع کر رکھا تھا، جس کی تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

اعظم گڑھ کے زمانہ قیام میں انھوں نے نصاب خسرو معروف بہ خالق باری کی تصنیف کا کام بھی انجام دیا تھا۔ یہ کتاب ۱۸۷۷ء میں اعظم گڑھ سے جانے کے بعد شائع ہوئی۔

اعظم گڑھ کا قیام ڈپٹی نذیر احمد کے لئے اس لحاظ سے بھی مفید ثابت ہوا کہ ان کی بعض کتابیں اور تراجم اور ان کی شخصیت کا شہرہ حیدرآباد حکومت آصفیہ تک پہنچا اور ایک بڑی تنخواہ پر

حیدرآباد بلالئے گئے ۔ جہاں وہ ۱۸۸۵ء تک اپنے عہدہ پر فائز رہے اور پھر پنشن لے کر دہلی واپس آئے اور بقیہ زندگی ادبی کاموں میں بسر کی ۔ ابن الوقت ، محصنات اور رویائے صادقہ جیسے اہم ناول اسی دور فراغ دہلی کی یادگاریں ہیں ۔

اس دور میں بعض مسائل کے سلسلے میں علامہ شبلی سے وہ استفسار کرتے تھے ۔ جن کے جوابات علامہ شبلی انھیں لکھ کر بھیجا کرتے تھے ۔ (۱۳) علامہ شبلی کی علالت کے زمانہ میں یہ فریضہ ان کے شاگرد عزیز مولانا ضیاء الحسن علوی [۱۸۹۱-۱۹۴۵ء] نے انجام دیا ۔ (۱۴)

جب علامہ شبلی اور ان کی تصنیفات کی عظمت کا ڈنکا بجا اور وہ اعظم گڑھ میں مقیم رہے تو ان کے متعدد اہل علم احباب اعظم گڑھ تشریف لائے ، لیکن سرسید کی اعظم گڑھ آمد اور ڈپٹی نذیر احمد کا قیام یہ سب علامہ شبلی کے سن شہرت سے پہلے کے واقعات ہیں ۔ بہرحال ابھی یہ تحقیق باقی ہے کہ اعظم گڑھ کے زمانہ قیام میں ڈپٹی نذیر احمد کی اور کیا کیا سرگرمیاں رہیں ؟ یہاں ان کے احباب کون لوگ تھے ؟ اور اعظم گڑھ میں ان کا قیام کہاں پر تھا ۔ ؟

ڈپٹی نذیر احمد اور علامہ شبلی کے حوالہ سے ایک اور واقعہ کا ذکر ضروری ہے ۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق نے علامہ شبلی کا شاگرد ہونے کے باوجود ان کی منقصت کا ایک سلسلہ مدۃ العمر جاری رکھا ۔ سرسید ، حالی ، محسن الملک اور بعض دوسرے ارباب کمال کے متعلق علامہ شبلی کے حوالہ سے ان کے آراء و خیالات راقم کی مختلف تحریروں میں آچکے ہیں ۔ ڈپٹی نذیر احمد دہلوی کے متعلق بھی انھوں نے ایک واقعہ گھڑ کے ان کی تنقیص کی ۔ ڈپٹی نذیر احمد نے آخر عمر میں ایک کتاب ''امہات الامہ'' لکھی ، جس کی بعض عبارتیں واقعی قابل اعتراض تھیں ۔ اس پر علماء نے ہنگامہ کیا ۔ چنانچہ ۱۹۱۰ء کے ندوۃ العلماء کے اجلاس دہلی میں اسے نذر آتش کیا گیا ۔ اس واقعہ پر مولوی عبدالحق نے ''حیات النذیر'' کے دیباچہ میں پہلے علماء پر بڑا سخت تبصرہ کیا ، پھر علامہ شبلی پر اس طرح تان توڑی :

> ''طالب علمی کے زمانہ میں جب میں انگریزی تاریخوں اور دوسری کتابوں میں یورپین مورخوں کا یہ الزام پڑھتا تھا کہ مسلمانوں نے حضرت عمرؓ کے حکم سے اسکندریہ کے بے نظیر کتب خانے کو جلا کر خاک کر دیا تو بے حد رنج اور صدمہ ہوتا تھا ،

لیکن جب شمس العلماء مولانا شبلی نے ایک محققانہ رسالہ لکھ کر محکم دلائل اور پُر زور شہادتوں سے اس کی تردید کی تو اس بے نظیر رسالے کو پڑھ کر پوری تسکین ہوگئی اور یقین ہوگیا کہ یہ محض افسانہ اور یورپین مورخوں کا مسلمانوں پر افترا اور بہتان ہے، مگر جب مجھے اس واقعہ (امہات الامہ کے نذر آتش کرنے) کی خبر لگی اور خصوصاً جب میں نے یہ سنا کہ علامہ موصوف بھی (بالواسطہ یا بلاواسطہ) اس کار خیر میں شریک تھے تو میرا خیال بدل گیا اور اب تک میرا خیال ہے کہ کچھ تعجب نہیں کہ مسلمانوں نے کتب خانہ اسکندریہ جلایا ہو''۔(۱۵)

حقیقت واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی اس واقعہ میں سرے سے شریک ہی نہیں تھے۔ مولانا سید سلیمان ندوی اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس واقعہ کو مولوی عبدالحق صاحب سکریٹری ترقی اردو نے اپنے مقدمہ حیات النذیر میں مولانا شبلی کی طرف بالواسطہ یا بلا واسطہ، بے وجہ اور بلاتحقیق منسوب کر کے ایک تاریخی جرم کیا ہے، حالانکہ مولانا اس مجمع میں سرے سے موجود نہ تھے''۔(۱۶)

مولانا حبیب الرحمٰن خان شروانی جو شریک جلسہ تھے اور جنہوں نے امہات الامہ کو آگ لگائی تھی انھوں نے لکھا ہے کہ علمائے ندوہ اسے جلانے کے لئے تیار نہ تھے بلکہ ڈپٹی نذیر احمد ہی کی رائے پر یہ کتاب جلائی گئی۔(۱۷)

اب بابائے اردو کی اس شبلی شکنی کو سوائے شبلی دشمنی کے اور کیا نام دیا جاسکتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ''امہات الامہ'' کی اشاعت سے پہلے ندوۃ العلماء کے اجلاس کا جب حکیم اجمل خاں کے مشورہ سے اعلان ہوا تو علامہ شبلی کی خواہش تھی کہ مولانا حالی اور ڈپٹی نذیر احمد بھی اس اجلاس میں شریک ہوں۔ اس کا ذکر انھوں نے ماہنامہ الندوہ میں بھی کیا۔ وہ خود مولانا حالی اور ڈپٹی نذیر احمد کے ساتھ ایجوکیشنل کانفرنس اور انجمن حمایت الاسلام لاہور وغیرہ کے اجلاسوں میں شریک ہوتے تھے۔ ان کے مؤثر خطابات اور ملت کے لئے ان کی دردمندی سے وہ پوری طرح واقف تھے۔ اب سوائے مولوی عبدالحق کے اور کون سوچ سکتا ہے کہ وہ ڈپٹی نذیر احمد کی کتاب جلانے اور ان کی

تحقیر میں شامل ہوں گے۔ واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں بزرگوں میں خیالات کی بڑی حد تک ہم آہنگی اور قومی وملی خدمات کے اشتراک کے سبب گہرے مراسم مدۃ العمر قائم رہے۔ حالانکہ دونوں کی عمروں میں تفاوت خورد و بزرگ کا تھا۔

حوالے

(۱) نذیر احمد شخصیت اور کارنامے ص ۳۷
(۲) یادایام ص ۷۸
(۳) لکچرز کا مجموعہ حصہ دوم ص ۴۰۱
(۴) ایضاً ص ۷۷)
(۵) ایضاً ص ۹۷
(۶) حیات شبلی ۶۱۵
(۷) باقیات شبلی ص ۹۴
(۸) باقیات شبلی ص ۱۰۸
(۹) حیات شبلی ص ۶۱۶
(۱۰) لکچرز کا مجموعہ حصہ دوم ص ۴۳۹
(۱۱) ایضاً ص ۴۴۰
(۱۲) ایضاً ص ۴۴۱
(۱۳) یادایام ص ۷۰
(۱۴) ایضاً
(۱۵) حیات النذیر مقدمہ ص ۷
(۱۶) حیات شبلی ص ۴۷۸
(۱۷) مقدمہ مقدمات عبدالحق ص ۶۰

ooo

[۵]

علامہ شبلی اور نواب محسن الملک

جانشین سرسید نواب محسن الملک مولوی سید مہدی علی خاں [۱۸۳۷ - ۱۹۰۷ء] قوم کے ان محسنوں میں تھے جنہوں نے ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات میں قوم کو پستی اور زبوں حالی سے نکالنے کے لئے اپنا سب کچھ نچھاور کر دیا۔ وہ تحریک علی گڑھ کے کاروان اول کے رکن اعظم اور سرسید احمد خاں [۱۸۱۷ - ۱۸۹۸ء] کے جانثار اوران کے دست و بازو تھے۔ انہوں نے سرسید کا ہر طرح سے تعاون کیا اوران کے بیشتر کاموں میں عملاً شریک رہے۔ یہی وجہ ہے کہ سرسید کی وفات [۲۷/ مارچ ۱۸۹۸ء] کے محض چند ماہ بعد انہیں ایم اے او کالج علی گڑھ کا سکریٹری منتخب کیا گیا اور انہوں نے انتہائی نامساعد حالات میں اسے بخوبی نبھایا اور کالج کو بڑی ترقی دی۔ علامہ شبلی کے الفاظ میں:

> ''لوگوں کو ڈر تھا کہ سرسید مرحوم کے بعد ان کے منصوبوں کو کون انجام دے گا ؟ لیکن خدا نے ان ہی کے ہم نشینوں میں سے ایک ایسا شخص پیدا کر دیا جو اور امور میں گو سرسید کا ہم سر نہ تھا لیکن کالج کی ترقی ، وسعت اور مقبول عام بنانے میں سرسید سے کسی طرح کم رتبہ نہ تھا۔ اس نے تھوڑی مدت میں سات آٹھ لاکھ روپیہ جمع کر دیا۔ کالج کی ہر شاخ اس قدر ترقی کر گئی کہ اگر کوئی شخص جس نے سرسید مرحوم کی زندگی میں کالج کو دیکھا تھا آج جا کر دیکھے تو کالج کو پہچاننا مشکل ہوگا۔ کانفرنس جو روز بروز پژمردہ ہوتی جاتی تھی۔ نواب محسن الملک مرحوم نے اس کو دوبارہ زندہ کیا اور لاہور سے ڈھاکہ تک اس کے ڈانڈے ملا دیئے۔''(۱)

نواب محسن الملک بڑے عالم فاضل شخص تھے۔ ان کی تعلیم قدیم طرز پر ہوئی تھی۔ یہی وجہ

ہے کہ اسلامی علوم بالخصوص قرآن، حدیث اور تاریخ پر ان کی گہری نظر تھی۔ وہ اچھے اہل قلم اور مصنف بھی تھے۔ ان کا شمار تہذیب الاخلاق کے دور اول کے بڑے مضمون نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے قلم سے کئی کتابیں اور رسالے نکلے اور مقبول ہوئے۔ جن کے نام یہ ہیں:

آیات بینات [چار حصے، مطبوعہ ۱۸۷۰۔۱۸۷۶ء]، کتاب المحبت والشوق، مولود شریف مطبوعہ ۱۸۶۰ء، تقلید اور عمل بالحدیث، اشاعت اسلام مطبوعہ ۱۸۹۲ء امرتسر، فطرت اور قانون فطرت غیر مورخہ، مکاتبات الخلان، مضامین تہذیب الاخلاق وغیرہ۔

وہ اپنے عہد کے بہت مشہور خطیب تھے اور نہایت عالمانہ تقریریں کرتے تھے۔ ان کے متعدد خطبات کتابی صورت میں شائع ہو کر مقبول ہوئے۔ ۸۴ر خطبات کا ایک مجموعہ ''مجموعہ لکچرز و اسپیچز'' ۱۹۰۵ء میں ملک فضل الدین تاجر کتب قومی کتب خانہ لاہور نے شائع کیا۔

ان کے خطبات بڑے اہم قومی وملی مسائل پر مشتمل ہیں۔ ان میں اشاعت اسلام کو خاص طور سے بڑی مقبولیت ملی۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں تعلیمی وملی معاملات اور جدید تعلیم کی حمایت میں انہوں نے جو خطبات دیئے ہیں وہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ان کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے بڑے باخبر اور ایک بڑے دانشور تھے۔ ان کی نظر نہ صرف ہندوستان کے مسلمانوں کے معاملات ومسائل پر تھی بلکہ وہ عالم اسلام پر بھی گہری نظر رکھتے تھے۔ افسوس وہ جس پایہ کے شخص تھے ان کے شایان شان انہیں خراج عقیدت نہیں پیش کیا گیا۔ منشی امین زبیری [۱۸۷۰۔۱۹۵۸ء] کی ''حیات محسن'' مطبوعہ ۱۹۳۴ء ان کے تمام کارناموں کا احاطہ نہیں کرتی ہے۔ اسی طرح سید امجد علی اشہری کی کتاب ''حیات جاودانی'' بھی ان کی مکمل سوانح عمری نہیں۔ اہل قلم بالخصوص علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے فرزندوں پر یہ قرض بہرحال باقی ہے۔

نواب محسن الملک، سرسید احمد خاں کے بعد علی گڑھ تحریک کی دوسری بڑی اور نمائندہ شخصیت تھے، جن سے علامہ شبلی کے گہرے روابط اور محبت آمیز تعلقات اخیر تک قائم رہے۔ سرسید اور شبلی کے باہمی تعلقات، افادہ واستفادہ اور اختلاف فکر ونظر پر متعدد مضامین ومقالات لکھے گئے ہیں۔ متعدد کتابوں میں بھی اس پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ محمد فاروق دیوا صاحب نے تو ایک مستقل کتاب ''سرسید اور شبلی'' بھی لکھی ہے، مگر نواب محسن الملک اور علامہ شبلی کے باہمی

تعلقات پر غالباً اب تک ایک بھی مقالہ نہیں لکھا گیا۔ یہی کمی اس تحریر کا باعث ہے۔

علامہ شبلی فروری ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ کالج سے بطور اسسٹنٹ پروفیسر فارسی وعربی وابستہ ہوئے اور ۱۶؍سال [۱۸۸۳ - ۱۸۹۸ء] تک وابستہ رہے۔ نواب محسن الملک علی گڑھ تحریک اور سرسید سے اس سے بہت پہلے غالباً ۱۸۶۲ء سے وابستہ تھے، لیکن ان دونوں کے درمیان پہلی ملاقات کب ہوئی اور کب روابط قائم ہوئے حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ البتہ علامہ شبلی کے قلم سے ان کا پہلا ذکر ان کی مثنوی صبح امید میں ملتا ہے، جو علی گڑھ تحریک کی حمایت میں ۱۸۸۵ء میں انہوں نے لکھی تھی۔ اس میں سرسید اور ان کی تحریک کا جیسا سراپا کھینچا گیا ہے ویسا شاید ہی آج تک کسی اور شاعر نے کھینچا ہو۔ اس میں نواب محسن الملک کا ذکر اس طرح ہے:

وہ نکتہ ور حقیقت آگاہ
یعنی مہدی علی ذی جاہ

اس کے بعد ۱۸۹۱ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس الٰہ آباد میں دونوں شریک تھے۔ اسی طرح ۱۸۹۲ء میں کالج کا جو ڈیپوٹیشن سرسید کی سربراہی میں حیدرآباد گیا تھا، اس میں علامہ شبلی بھی شامل تھے۔ نواب محسن الملک اس وقت حیدرآباد میں ایک بڑے عہدہ دار تھے۔ ان مواقع پر یقیناً دونوں میں ملاقاتیں رہی ہوں گی، لیکن اس کی کوئی تفصیل دستیاب نہیں ہوئی۔

ایک سال بعد ۱۸۹۳ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس علی گڑھ میں منعقد ہوا۔ اس کی صدارت نواب محسن الملک نے کی اور کانفرنس کے تمام ممتاز اشخاص نے شرکت کی۔ علامہ شبلی بھی شریک ہوئے اور ایک نظم پیش کی، جسے بے حد پسند کیا گیا۔ خود صدر اجلاس نواب محسن الملک نے بھی اپنی پسندیدگی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ:

> ''حضرات! مولانا شبلی صاحب نے جو نظم اس وقت سنائی وہ بلحاظ الفاظ کی عمدگی اور معانی کے پاکیزگی کے اس قابل ہے کہ قوم ہمیشہ اسے حرز جاں بناوے اور اس کا ورد رکھے اور اس پر عمل کرے۔
>
> صاحبو! مولوی شبلی صاحب کی نظم یا نثر اس کی محتاج نہیں ہے کہ کوئی اس کی تعریف کرے۔ خصوصاً مجھ سا ناچیز، جاہل جس کی تعریف درحقیقت تحسین ناشناس

ہے،مگر وہ جوش جواس نے دلوں میں پیدا کر دیا ہےاور وہ حالت جواس کے دردناک شعروں نے طاری کر دی ہے، مجھے مجبور کرتی ہے کہ میں مجلس کی طرف سے ان کا شکریہ ادا کروں اور شکریہ کے ووٹ پاس کرنے کا محرک بنوں۔ مجھے امید ہے کہ ہر ایک شخص جواس وقت مجلس میں موجود ہے میرے ساتھ اتفاق کرے گا اور ایک ایسے عالی دماغ، روشن خیال عالم کا جس نے اپنی بےنظیر تالیفات سے ایک نئی روشنی قوم کو دکھائی اور ایک نیا اور سیدھا راستہ تصنیف کا بتایا ہے، دل سے شکریہ ادا کرے گا۔'' (۲)

۱۸۹۴ء میں علامہ شبلی کو شمس العلماء کا خطاب ملا۔ چنانچہ مبارک باد اور تہنیت کے لئے علی گڑھ کالج میں جلسہ منعقد ہوا جس میں کالج کے تمام سر برآوردہ اشخاص سر سید احمد خاں، سید محمود، نواب محسن الملک، مولانا حالی، نواب مزمل اللہ خاں، پروفیسر آرنلڈ، جسٹس کرامت حسین وغیرہ نے شرکت کی۔ اس جلسہ کی صدارت بھی نواب محسن الملک نے کی تھی۔ ان کی صدارتی تقریر اور جلسہ کی کارروائی انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع ہوئی ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] نے اسے حیات شبلی میں نقل کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے نہ صرف بخوبی واقف تھے بلکہ دونوں میں گہرے دوستانہ مراسم بھی قائم ہو چکے تھے۔ یہ خطبہ اس لحاظ سے بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ اس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اس دور میں علامہ شبلی کے بارے میں کالج کے سب سے بڑے محسن کے کیا خیالات تھے۔ نواب محسن الملک نے اپنی صدارتی تقریر کے آغاز میں کہا کہ

''صاحبو! اس وقت اس جلسہ میں دو قسم کے لوگ شریک ہیں۔ ایک طالب علم جن کو مولانا شبلی صاحب سے شاگردی کا فخر حاصل ہے۔ دوسرے اور احباب جن کو مولوی صاحب موصوف کی دوستی کی عزت حاصل ہے۔ میں اگرچہ بہ ظاہر دوسرے قسم کے لوگوں میں ہوں مگر اے صاحبو! درحقیقت میں پہلے طبقہ میں داخل ہوں..........عزیزو! مولانا شبلی صاحب صرف تمہارے ہی استاد نہیں ہیں بلکہ در حقیقت مجھ پر بھی ان کو استادی کا حق ہے۔ اگر تم نے چند قاعدے صرف ونحو کے ان سے سیکھے یا چند ابتدائی کتابیں ان سے پڑھی ہیں تو میں نے ان کی تصنیف وتالیف

اور تقریر وتحریر سے بڑے فائدے حاصل کئے ہیں۔ کوئی روز ایسا نہیں ہوتا کہ ان کی صحبت سے کسی نہ کسی قسم کا علمی فائدہ مجھے نہ ہوتا ہو۔ یا ان کی باتوں سے کچھ نہ کچھ میری معلومات میں ترقی نہ ہوتی ہو۔ اس لئے اے میرے عزیز طالب علمو! نہ صرف بہ حیثیت ایک دوست ہونے کے بلکہ بحیثیت ایک طالب علم ہونے کے میں اس جلسہ میں شریک ہوا ہوں اور میں مولانا شبلی صاحب کو اس معزز خطاب کے پانے پر جو گورنمنٹ نے ان کو دیا ہے، مبارک باد دیتا ہوں''۔(۳)

بعد ازاں نواب صاحب نے علامہ شبلی کو شمس العلما کا خطاب ملنے پر پہلے حکومت کو، کالج کو اور پھر قوم کو مبارک باد دی۔ ان کا خیال تھا کہ

''مولانا کو مبارک باد دینا تو ایک امر رسمی اور صرف رسم ظاہری کی تکمیل ہے۔ وہ فی ذاتہ ہمیشہ سے علم کے آفتاب تھے اور گورنمنٹ ان کو خطاب دیتی یا نہ دیتی وہ سب کے نزدیک شمس العلما تھے''۔(۴)

علامہ شبلی کی ذاتی خوبیوں کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا :-

''صاحبو! مولانا شبلی صاحب کی ذاتی خوبیوں اور ان کے علمی کمالات کا ذکر کرنا فضول ہے جن کو ان سے ملنے کی عزت حاصل ہے وہ ان کے ان صفات کا اندازہ کر سکتے ہیں جو خدا نے کوٹ کوٹ کر ان میں بھر دیئے ہیں''۔(۵)

پھر نواب صاحب نے علامہ شبلی کے علم وفضل، ان کی تصنیفات وتالیفات کی عظمت، علوئے مقام ومرتبہ اور ان کی عظیم الشان خدمات کا تذکرہ تفصیل سے کیا اور کہا کہ:

''جن کو ان کی تالیفات وتصنیفات کے دیکھنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ اس بات کو سمجھ سکتے ہیں کہ ان کی نظر کیسی غائر اور ان کا علم کیسا وسیع، ان کے خیالات کیسے بلند، ان کا ذہن کیسا تیز، ان کی تحریر کیسی پرزور، ان کا بیان کیسا صاف اور ان کی تحقیق کیسی عالمانہ ہے، وہ ہمارے زمانہ کے پہلے مصنف ہیں جنھوں نے اپنی تالیفات میں فصاحت بیان اور سلاست عبارت اور لٹریچر کی تمام خوبیوں کے ساتھ اعتدال اور بے تعصبی اور انصاف کا لحاظ رکھا اور شاعرانہ خیالات اور ایشیائی مذاق کے موافق

مبالغہ، استعارہ اور عبارت آرائی اور تصنع کے بغیر بلاغت سے فلسفیانہ طرز پر سوانح عمری اور لائف کے لکھنے کا طریقہ جاری کیا۔ اور واقعات تاریخی کے تحقیق کرنے اور محققانہ طور پر واقعات اور معاملات پر رائے دینے اور نتائج کے اسباب بیان کرنے اور اخبار و روایات کے صدق و کذب کے دریافت کرنے کا راستہ بتایا اور ایسے زمانہ میں جب کہ ہماری قوم کا مذاق بگڑا ہوا ہے اور ایسے وقت میں جب کہ سوائے افسانوں اور ناولوں کے کسی اور قسم کی کتابوں کی قدر نہیں ہے، ہمارے مولانا منجملہ ان دو تین مصنفین کے ہیں جن کی تالیفات کی نہایت قدر کی گئی اور جن کو قوم نے نہایت شوق سے دیکھا اور جس سے مسلمانوں نے بہت فائدہ اٹھایا اور جس نے ان کے دلوں میں ایک نیا مذاق پیدا کیا اور جس نے مشاہیر روزگار کے حالات زندگی کے لکھنے کا طریقہ اور اس کا مقصد بتایا اور ہمارے مردہ لٹریچر میں بلکہ ہمارے مردہ خیالات میں ایک نئی جان ڈال دی۔ فللہ درہ وعفی اللہ اجرہ . (۶)

علامہ شبلی نے اپنی تصنیفات مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، المامون اور سیرۃ النعمان کے علاوہ علی گڑھ میں محققانہ تاریخی مقالات کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا جس کے تحت انہوں نے الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ اور حقوق الذمیین وغیرہ مقالات لکھے تھے۔ اس تاریخی سلسلہ نے بے حد مقبولیت پائی۔ سرسید بھی ان تحقیقات کے بے حد مداح تھے۔ چنانچہ انہوں نے تصحیح اغلاط تاریخی کا ایک صیغہ قائم کر کے علامہ شبلی کو اس کا سکریٹری مقرر کیا اور ان کے تاریخی مقالات اس میں شامل کئے۔ (۷) نواب محسن الملک بھی ان تحقیقات کے بے حد مداح تھے اور انہیں خدائے ذوالجلال کی رضامندی کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں:

''صاحبو! ہمارے دوست مولانا شبلی صاحب نے نہ صرف ہم مسلمانوں پر اپنی عمدہ تالیفات سے احسان کیا ہے بلکہ درحقیقت اسلام بھی ان کا ممنون ہے اور خدائے ذوالجلال کی رضامندی حاصل کرنے کا بھی انہوں نے نہایت عمدہ کام کیا ہے۔ ان چند اعتراضوں کا دور کرنا جو مذہب اسلام کے مخالف ہمارے مذہب پر کرتے تھے اور جن سے ہمارا مذہب، انسانیت، انصاف، علم اور تہذیب کے مخالف

خیال کیا جاتا تھا، وہ جزیہ اور اسکندریہ کے کتب خانہ کا جلانا تھا کہ برسوں سے یہ الزام ہم پر لگایا جاتا ہے اور کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی، لوگوں نے جزیہ کو کفر کا ٹیکس قرار دے رکھا تھا اور اسکندریہ کے کتب خانہ کو جلانے سے پیشوایانِ اسلام کو علم کا دشمن مشہور کر دیا تھا۔ اس ذی ہمت، عالی دماغ محقق نے جو مدرستہ العلوم کے ایک گوشہ میں بیٹھا ہوا۔ حکیمانہ زندگی بسر کر رہا تھا۔ ان دونوں چیزوں کی حقیقت ظاہر کرنے میں اپنی تحقیق کی ایک عجیب خداداد قوت ظاہر کی اور چند اوراق کے لکھنے اور مشتہر کرنے سے ایک عالم کو حیرت میں ڈال دیا اور یورپ کے بڑے بڑے محققوں کی آنکھوں پر سے غلطی کا پردہ اٹھادیا اور ان دونوں اعتراضوں کو اس خوبی سے مذہب اسلام پر سے دور کر دیا کہ تمام دنیا حیران رہ گئی۔ حقیقت میں یہ کام ہمارے مولانا نے ایسا کیا ہے کہ خود اسلام اس کی داد دیتا ہے اور خدا اس پر آفریں کرتا ہے''۔(۸)

علامہ شبلی کی مذکورہ علمی تحقیقات کو نواب صاحب ان کی فضیلت اور شمس العلما ہونے کے لئے کافی قرار دیتے ہیں:

''میرے نزدیک صرف وہ چند صفحے جو میرے معزز دوست نے جزیہ اور اسکندریہ کے کتب خانہ پر لکھے ہیں، ایسے ہیں کہ اگر کوئی کام مسلمانوں کے فائدہ کا انہوں نے نہ کیا ہوتا اور سوائے ان کے کوئی دوسری تحریر ان کی نہ ہوتی تو وہی چند صفحے ان کی فضیلت، لیاقت اور علم پر شاہد اور مسلمانوں کے فخر اور عزت کے لئے کافی اور ان کے شمس العلما ہونے کے شاہد تھے''۔(۹)

نواب محسن الملک نے علامہ شبلی کو طلبائے علی گڑھ کے لئے ایک قابل تقلید نمونہ قرار دیا اور ان کی درازی عمر کی دعا کے ساتھ طلبہ کو ان کے نقش قدم پر چلنے کا مشورہ دیا:

''اے میرے عزیز! اے میرے مدرستہ العلوم کے طالب علمو! نہایت خوش نصیب ہو کہ ایسے استاد تم کو ملے ہیں اور ایسے آفتاب کی روشنی تم کو پہنچتی ہے۔ تم اس زمانہ کو غنیمت سمجھو جب کہ تم کالج میں ہو اور ایسے استادوں کی صحبت و تعلیم سے فائدہ حاصل کر رہے ہو۔ اس کو ہاتھ سے نہ جانے دو اور اپنے استاد کے قدم بہ قدم چلنے

میں دقیقہ کوشش کا اٹھا نہ رکھو۔تمہارے سامنے ایک عمدہ نمونہ موجود ہے،تمہارے دلوں کومنور کرنے کے لئے ایک آفتاب روشن ہے،تم ایساوقت ہاتھوں سے نہ دواور اپنے استاد کے خصائل اورصفت سیکھنے اورعلم کے حاصل کرنے اور پھراسے کام میں لانے کی کوشش کروتا کہ ہم اپنی قوم میں نہ صرف ایک آفتاب کودیکھیں بلکہ ہمارے چاروں طرف سیکڑوں چانداورستارے نظر پڑیں،خدا کرے کہ ہمارا یہ آفتاب مدت تک روشن رہےاوراس کا سایہ ہم پر پڑے''۔(۱۰)

نواب محسن الملک نے علامہ شبلی کی کتابوں کوبھی بغور پڑھا تھا،کبھی کبھی اپنے خطبات میں ان کا حوالہ بھی دیتے تھے۔ایجوکیشنل کانفرنس ۱۸۹۸ء کے اجلاس میں سیدمحمود کے تراجم کے سلسلہ میں پیش کردہ ریزولیشن کی تائید میں انہوں نے اوردلائل کے ساتھ علامہ شبلی کی المامون کے حوالہ سے عہد عباسیہ کی ترجمہ کی خدمات کا ذکر کیا۔(۱۱) اور بتایا کہ اس میدان میں مسلمانوں کے کیا کارنامے ہیں۔

علامہ شبلی کوخیال پیدا ہوا کہ ایم اے او کالج علی گڑھ کی ملازمت سے کنارہ کش ہوکرتمام وقت تصنیف وتالیف میں صرف کرنا چاہئے مگراس کے لئے حالات سازگارنہیں تھے۔۱۸۹۶ء میں مولوی سیدعلی بلگرامی جن سے علامہ شبلی کے بے تکلفانہ مراسم تھےان کے ذریعہ وہ حیدرآباد پہنچےاوران کی کوششوں سے حکومت آصفیہ نے ۱۰۰/روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کیا تا کہ وہ اپنا تمام وقت تصنیف وتالیف میں صرف کرسکیں۔قیام حیدرآباد کے زمانہ میں کالج میں یہ قیاس آرائی ہونے لگی کہ علامہ شبلی علی گڑھ کالج سے کنارہ کش ہونے والے ہیں،چنانچہ صحیح صورت حال سمجھنے کے لئے نواب محسن الملک نے انہیں خط لکھا۔وہ خط تو دستیاب نہیں ہوا،البتہ علامہ شبلی نے ان کا جو جواب لکھا تھاوہ مکاتیب شبلی حصہ اول میں شامل ہے۔علامہ شبلی لکھتے ہیں:-

''جناب من ! آپ کا خط پڑھ کر بے اختیار ہنسی آ گئی،آپ لوگ مجھ کواس قدر بھولا اورسادہ دل سمجھتے ہیں،اسکول کے لئے میرا یہاں رہنا مفید ہوتا تو کیا رہ جاتا،لیکن یہاں کا روپیہ ہمیشہ یہیں خرچ ہوتا ہے باہرنہیں جاتا،مجھ کوسردست ۵۰۰/ ماہوار سے زیادہ نہیں مل سکتے اور یہی یہاں کا خرچ ہے،پھرجس قدر تنخواہ بڑھتی ہے

خرچ بڑھ جاتا ہے، البتہ اگر یہاں کی سوسائٹی میں مبتذل، بدحیثیت، بے وقعت ہوکر رہوں تو پس انداز ہوسکتا ہے۔ باقی وہاں کے لئے یہاں کے لوگوں سے چندہ یہ کس قدر حماقت ہے۔

مولوی صاحب! روپیہ اور دولت کی قدر مجھ سے زیادہ کسی کو نہیں، میں کچھ ابراہیم ادہم اور بایزید نہیں ہوں، میرا تو رواں رواں دنیا کی خواہش سے جکڑا ہوا ہے لیکن دنیا کو سلیقہ سے حاصل کرنا چاہتا ہوں، مجھ سے جوڑ توڑ سازش، درباداری، خوشامد، لوگوں کی جھوٹی آؤ بھگت نہیں ہوسکتی اور بغیر اس کے کامیابی معلوم، اس لئے میں نے گوشہ عافیت پسند کیا۔

یہاں مجھ سے میری خواہش کا استفسار ہوا میں نے کہا موجودہ آمدنی کے ساتھ کالج کے تعلق سے آزادی، چنانچہ اسی قدر ماہوار کا منصب مقرر ہوگیا، الفاروق کے بعد ۱۵۰ یا ۲۰۰ روپے ہوجائے، روبکار میں بھی اضافہ کا وعدہ درج کردیا گیا ہے گو مقدار کی تعین نہیں، بس میری تنہا زندگی کو یہ بہت ہے، تاہل کا ارادہ نہیں، زیادہ دھوم دھام کی خواہش نہیں، بے زحمت خدا نے اس قدر دیا تو لاکھ لاکھ شکر ہے اور یوں تو ؎
کاسہ چشم حریصاں الخ... رہا قوم کی خدمت کرنی اس کی تدبیر یہ نہیں کہ جھوٹی سفارش کرکے دو چار کو نوکری دلاؤ۔ بجائے اس کے طلبہ کو اس قابل بنانا چاہئے کہ وہ خود اپنی سفارش کرسکیں''۔ (۱۲)

اس خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت علی گڑھ کالج میں محض یہی مشتہر نہیں تھا کہ علامہ شبلی کالج سے علاحدہ ہورہے ہیں، بلکہ یہ بھی مشہور تھا کہ وہ اپنے قائم کردہ نیشنل اسکول اعظم گڑھ کے لئے حیدرآباد میں چندہ بھی کررہے ہیں۔ اس خط سے یہ بھی واضح ہورہا ہے کہ علامہ شبلی اور نواب صاحب کے درمیان بڑی بے تکلفی بھی تھی۔ وہ اپنے بارے میں انتہائی صفائی سے لکھ رہے ہیں کہ وہ کوئی ابراہیم ادہم اور بایزید بسطامی نہیں اور یہ بھی کہ ابھی تاہل کا ارادہ بھی نہیں اور جس قدر حیدرآباد سے منصب مقرر ہوا ہے وہ ان کے مصارف کے لئے کافی ہے اور آخری جملے میں وہ کالج پر تنقید بھی کرتے ہیں۔

بہرحال علامہ شبلی اس وقت کالج سے علاحدہ نہ ہوئے اور سرسید کی حیات تک اس سے وابستہ رہے۔ ایسا نہیں ہے کہ کالج سے علاحدہ ہونے کا ارادہ انہوں نے ترک کر دیا تھا بلکہ انہوں نے جب کالج سے علاحدگی کی بات کی تو مسٹر بیک پرنسپل نے سرسید سے کہا کہ علامہ شبلی ایک قابل مصنف ہیں، ان کا کالج سے وابستہ رہنا مفید ہوگا۔ آپ انہیں سمجھائیے کہ جس طرح یورپ کی بعض یونیورسٹیوں میں پروفیسر چھ ماہ تعلیم و تدریس کا کام کرتے ہیں اور بقیہ چھ ماہ وہ رخصت پر ہوتے ہیں اور ان کے نائبین تدریس کا کام انجام دیتے ہیں، اسی طرح وہ بھی چھ ماہ تدریس کا کام کریں اور بقیہ چھ ماہ تصنیف و تالیف میں منہمک رہیں۔ گرچہ سید محمود نے اس تجویز کی مخالفت کی مگر سرسید نے مسٹر بیک کی یہ تجویز تسلیم کر لی۔ (۱۳)

یہ زمانہ [۹۸ -۱۸۹۷ء] علی گڑھ کالج کی تاریخ میں خلفشار کا زمانہ تھا۔ خاص طور پر سرسید اور سید محمود کی بے لطفی سے کالج کی فضا بھی بے لطف ہوگئی تھی۔ آخرکار سرسید گھر چھوڑ کر نواب محمد اسماعیل دتاولی کے گھر چلے گئے اور پھر اسی مکان سے سفر آخرت پر روانہ ہوئے۔ یہ بات کم لوگوں کو معلوم ہوگی کہ علامہ شبلی بھی سرسید کی عنایت کردہ بنگلیہ چھوڑ کر نواب اسماعیل دتاولی کے مکان میں چلے گئے تھے۔ (۱۴) اور سرسید احمد خاں کی وفات کے دو ماہ بعد مئی ۱۸۹۸ء میں استعفا دے کر اعظم گڑھ کی راہ لی۔

سرسید احمد خاں، سید محمود کو اپنا جانشین بنا گئے تھے۔ چوں کہ سید محمود کی تعلیم انگلستان میں ہوئی تھی اور مسٹر بیک پرنسپل کو لندن سے وہی لے آئے تھے اس لئے وہ اور کالج کا انگریزی اسٹاف ان کا ہم نوا تھا اور ان کی طرف داری میں سرسید سے اخیر دور میں دباؤ ڈال ڈال کر فیصلے کرواتا تھا۔ جس کی وجہ سے ٹرسٹیز ناراض ہوگئے۔ اس میں نواب محسن الملک، وقار الملک اور مولانا حالی جیسے کالج کے ہمدرد و بہی خواہ اور سرسید کے شیدائی بھی شامل تھے۔ چنانچہ ٹرسٹیز نے سرسید کے خلاف ایک تحریر تیار کی جو اخبارات کو اشاعت کے لئے دے دی گئی تھی کہ سرسید نے وفات پائی۔ اس حادثہ فاجعہ کی وجہ سے وہ تحریر اگرچہ واپس لے لی گئی، مگر دلوں میں جو کھائی پیدا ہوگئی تھی وہ باقی رہی۔ سید محمود کے مطلق العنانی رویے نے اس میں اور اضافہ کیا۔ یہاں تک کہ کالج کا انگریزی اسٹاف بھی ان کے خلاف ہوگیا۔ علامہ شبلی ایک خط میں مولانا حمید الدین فراہی کو لکھتے ہیں ''کالج

کا حال کشمکش میں ہے۔ سر دست بیک صاحب نے قبضہ کر لیا ہے۔ سید محمود کی حالت خراب ہے۔'' (۱۵) چنانچہ ٹرسٹیز نے ان حالات میں جنوری ۱۸۹۹ء میں سید محمود کی جگہ نواب محسن الملک کو سکریٹری منتخب کیا۔ سید محمود اگر چہ سخت بپھرے اور برہم ہوئے مگر نواب صاحب نے حکمت عملی سے انہیں رام کر لیا اور سخت جد وجہد کے بعد کالج کو انتشار سے بچا کر ترقی کی راہ پر لگایا۔ اس وقت علامہ شبلی مستعفی ہو کر اعظم گڑھ میں مقیم اور علیل تھے۔ چنانچہ نواب محسن الملک نے اپنے دوست کی عیادت کے لئے اعظم گڑھ کا سفر کیا۔ سکریٹری شپ ملنے کے بعد غالبًا یہ ان کا پہلا سفر تھا۔ وہ مارچ ۱۸۹۹ء میں اعظم گڑھ آئے اور تین دن شبلی منزل میں مقیم رہے۔ علامہ شبلی نے اپنے بھائی مولوی محمد اسحاق وکیل کو ایک خط میں لکھا ہے کہ

> ''پانچ چھ دن سے طبیعت اچھی ہے۔ نواب محسن الملک میری عیادت کو یہاں آئے اور میرے بنگلہ میں تین دن رہے۔ ان کی آؤ بھگت میں مجھ کو بہت چلنا پھرنا پڑا، لیکن میں اس کی برداشت کر سکا''۔ (۱۶)

علامہ شبلی کے اس خط پر تاریخ کے بجائے محض سنہ ۱۸۹۸ء درج ہے۔ علامہ شبلی خطوط پر مکمل تاریخ لکھنے کا اہتمام کرتے تھے، مگر کبھی کبھی بلا تاریخ بھی خط لکھ دیتے تھے، جیسا کہ مکاتیب شبلی کے دونوں حصوں میں بعض خطوط سے معلوم ہوتا ہے۔ مذکورہ بالا خط پر سنہ ۱۸۹۸ء درج ہونے کی وجہ سے مولانا سید سلیمان ندوی نے نواب محسن الملک کی اعظم گڑھ آمد کا ذکر اسی سنہ کے ذیل میں کیا ہے۔ (۱۷)

پروفیسر اقبال حسین نے ۲۰۰۷ء میں ایک کتاب ''دستاویزات محسن الملک''، علی گڑھ سے شائع کی ہے۔ اس میں ایک دستاویز (نمبر ۱۷، اور شمار نمبر ۱۶۷) ''خط طلبائے اعظم گڑھ'' کا بھی اندراج ہے۔ فہرست سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایم اے او کالج علی گڑھ میں مقیم طلبائے اعظم گڑھ کا کوئی خط ہے جو انہوں نے نواب صاحب کے نام لکھا ہے مگر دراصل یہ طلبائے نیشنل ہائی اسکول اعظم گڑھ کا وہ سپاس نامہ ہے جو انہوں نے نواب محسن الملک کی اعظم گڑھ آمد پر ان کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ اس پر جو تاریخ درج ہے، وہ ۲۳/ مارچ ۱۸۹۹ء کی ہے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ نواب صاحب جنوری ۱۸۹۹ء میں کالج کے سکریٹری منتخب ہونے کے بعد مارچ

۱۸۹۹ء میں اعظم گڑھ تشریف لائے تھے نہ کہ ۱۸۹۸ء میں ۔ چوں کہ علامہ شبلی کے مذکورہ بالا خط میں محسن الملک کے قیام اعظم گڑھ کی مدت تین دن لکھی ہوئی ہے، اس لئے اس کی تاریخ کی تعیین ۲۲/۲۱/ مارچ سے ۲۴/۲۵/ مارچ ۱۸۹۹ء کی جاسکتی ہے۔

اس سپاس نامہ کو اصل سے نقل کرنے میں دستاویزات محسن الملک کے مرتب نے احتیاط نہیں کی ہے۔ کمپوزنگ کی متعدد غلطیاں بالکل واضح ہیں۔ حتی کہ اس دستاویز کی تاریخ کے اندراج میں بھی کئی غلطیاں ہیں۔ چار صفحے کے اس سپاس نامہ کے پہلے صفحہ پر ۲۳/اپریل ۱۸۹۸ء کی تاریخ درج ہے اور بقیہ صفحات میں ۲۳/اپریل ۱۸۹۹ء۔ جبکہ اصل سپاس نامہ کے اختتام پر ۲۳/ مارچ ۱۸۹۹ء کی تاریخ لکھی ہوئی ہے۔

طلبائے نیشنل ہائی اسکول اعظم گڑھ کا یہ سپاس نامہ یقینی ہے کہ علامہ شبلی کی ایما ہی سے پیش کیا گیا ہوگا۔ مشمولات سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے بہر حال یہ سپاس نامہ اپنے مشمولات کے لحاظ سے بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ اس کا آغاز اس طرح ہوا ہے:

> ''معلیٰ القاب جناب نواب محسن الملک صاحب!
>
> ہم طلبائے نیشنل ہائی اسکول اعظم گڑھ جو عالی جناب شمس العلما مولانا محمد شبلی صاحب کی ایک ادنی شعاع فیض و ضیاء مکرمت ہے اور جس کی تمام رفعت و ترقی مولانا ممدوح کی ہمدردی و روشن ضمیری کے خیالات سے وابستہ ہے، نہایت ادب سے دلی جوش کی شادمانی واٹھتے ہوئے جوش دل کے دلوں کے مسرت سے اس مبارک اور قابل فخر موقع پر جب کہ حضور عالی کے کوکب ہمایوں کے ورود نے اس سرزمین کو فلک چہارم کی عزت دی یا یوں کہئے کہ جناب شمس کی عیادت کی تقریب سے خورشید درخشاں نے قدم رنجہ فرمایا کہ اس سے ہمارے مرز بوم کے ہر خار و خس کو رتبہ انا الشرق عطا کیا ہے ۔ چند سطور حضور عالی کے قومی خدمات کے متعلق عرض کرنے کی اجازت چاہتے ہیں''۔(۱۸)

بعد ازاں ۱۸۵۷ء کے بعد کے حالات بالخصوص مسلمانوں کی زبوں حالی اور کسمپرسی کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کی بے بسی بیان کی گئی ہے اور یہ خوف ظاہر

کیا گیا ہے کہ مسلمانان ہند اسپین کے مسلمانوں کی طرح کے حالات کے قریب پہنچ گئے تھے۔ ایسے میں رحمت حق نے دوسیدوں کو پیدا کیا۔ پھر پہلے سید سرسید احمد خاں کی کاوشوں کا ذکر ہے۔ بعدازاں دوسرے سید نواب محسن الملک کی شخصیت اور فضل وکمال کا بیان ہے۔اس میں یہ خیال بھی ظاہر کیا گیا ہے کہ سرسید کی وفات کے بعد خوف تھا کہ تحریک علی گڑھ کہیں پژمردہ نہ ہوجائے مگر محسن الملک کی ذات گرامی سے یہ خوف جاتا رہا۔اصل عبارت یہ ہے:

''خلد آشیاں سید مرحوم کی وفات بے وقت ونا گہانی سے ہم بچگان اسلام کو اسلامی اوج وشان کی ترقی کی طرف سے ایک قسم کی مایوسی ہوگئی تھی، آپ کے قابل تعظیم قوت بازو کی ٹوٹنے سے ہم سخت متوحش تھے کہ مبادا ترقی کے ذرائع رک جائیں اور وہ قابل فخر مدرسہ سرچشمہ علم ومعدن فنون محمڈن اینگلواورینٹل کالج علی گڑھ جو غفرلہ سرسید مرحوم کی کوششوں کا ثمرہ ہے،اس کی روانی وطراوت اوراس کے ارکان ووصول تعلیم میں کوئی ناخوش گواری وڈھیل واقع ہواوراسلامی جماعت کا کوئی حامی ومعین نہ رہے،مگر خدا کا شکر ہے کہ ہماری مایوسی خوشی سے بدل گئی اور یہ بات اب علانیہ نظر آرہی ہے کہ قابل تعظیم مرے والا اپنے مرتے وقت ودیعۂ اپنے تمام دست وبازو کی قوت، اپنی تمام دلی روشنیاں وروشن ضمیریاں، اپنے تمام متبرک اوصاف وبرکات کو حضرت مہدی کے تمام برگزیدہ شمائل، زورآور دست وبازو، مستقل جدوجہد، نورانی دل مصفا وروشن دماغ پر اضافہ کرتا گیا ہے، جس کے قابل عظمت وسرگرم کوشش سے یہ صریح آشکار ہے کہ سید مرحوم کی کوششوں سے جو پود لگی تھی وہ جلد تناور درخت ہوگی اوراس کے ثمر سے انشاءاللہ ایک عالم بہرہ مند وفیض یاب ہوگا اوراس درس گاہ سے جو آپ کے صدقہ محنت میں جو یونیورسٹی بننے والی ہے وہ چشمہ فیض جاری ہوگا کہ مسلمانان ہند کے علمی خزاں خوردہ باغ میں ہمیشگی کی بہار آوے گی''۔(۱۹)

اس سپاس نامہ کا آخری پیراگراف نواب صاحب کے لئے دعا اور نیک خواہشات کے ساتھ طلبائے نیشنل اسکول اعظم گڑھ کے علی گڑھ سے والہانہ تعلق کا مظہر ہے:

''ہم کو آپ کی ہر تمام کوشش ومدرسۃ العلوم کے ساتھ نسبتاً دلی ہمدردی ہے۔

اس طرح پر کہ گویا مدرسۃ العلوم میں اس وقت تعلیم پا رہے ہیں اور حضور عالی جناب سے یہ امید رکھتے ہیں کہ ہم طلبائے نیشنل ہائی اسکول اعظم گڑھ کو بھی حضور مدرسۃ العلوم کا طالب علم تصور فرمائیں۔ اب ہماری یہ دعا ہے۔ حضرات ! آپ آمین کہئے کہ اے خدا، اپنے رسول پاک و نبی اکرمؐ کے طفیل میں ہمارے محسن، ہمارے حامی، ہمارے رہنما، ہمارے ناخدا جناب نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خاں صاحب بہادر کو جو ہمارے اعتقاد و یقین سے ہندوستان کے پانچ کروڑ مسلمانوں کے رہبر ہیں، خضر کی عمر اور نوح کی حیات عطا کر، وائے خدا، اے خدا ہمارے محسن الملک کی اس تکلیف راہ اور صعوبت سفر کا خیال کر کے اپنے فضل وجلال کے صدقہ میں ان کی کوششوں کو کامران اور ان کے دلی ارادوں کو کامیاب کر۔ آمین ثم آمین''۔(۲۰)

یہ سپاس نامہ پیش کرنے کے لئے یقیناً کوئی تقریب نیشنل ہائی اسکول یا شبلی منزل میں منعقد ہوئی ہوگی، مگر اس کی تفصیلات دستیاب نہ ہوسکیں۔ البتہ اس کے متن کے ایک جملہ سے واضح ہوتا ہے کہ تقریب منعقد ہوئی تھی ممکن ہے انسٹی ٹیوٹ گزٹ وغیرہ میں اس کی کوئی تفصیل درج ہو۔

یہ سپاس نامہ نواب صاحب کو جس وقت پیش کیا گیا اس وقت علامہ شبلی علی گڑھ کالج سے علاحدہ ہوکر اعظم گڑھ میں مقیم تھے اور نواب محسن الملک کالج کے سکریٹری منتخب ہو چکے تھے، ممکن ہے علامہ شبلی نے اسے نہ دیکھا ہو مگر اس کے لکھنے میں ان کا مشورہ ضرور شامل رہا ہوگا، کیونکہ اس وقت تک علامہ شبلی کا جو تعلیمی نظریہ قائم ہو چکا تھا اس کی بازگشت اس کے صفحات میں صاف سنائی دیتی ہے۔ مثلاً یہ اقتباس کہ:

''اور خدا کی مہربانیوں سے کچھ بعید نہیں ہے کہ علی گڑھ کے سرچشمہ علوم سے لارڈ بیکن کے ساتھ حضرت امام غزالی کی روح بھی خروج کرے۔ اڈلین و میکالے کے ساتھ امام رازی و امام بخاری کی برکتیں بھی اپنا جلوہ دکھائیں''۔(۲۱)

علامہ شبلی کے علی گڑھ کالج چھوڑنے اور حیدرآباد کا رخ کرنے کے اہل قلم نے متعدد اسباب بیان کئے ہیں۔ اس کی تفصیل سے قطع نظر یہاں دو باتوں کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔ علامہ شبلی نے لکھا ہے کہ میں نے علی گڑھ ندوہ کے لئے چھوڑا، گو واقعات اتفاقی کی وجہ سے

حیدرآباد جانا پڑا۔ جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی نے سرسید سے ان کی کشمکش اور اختلافات کو اس کا سبب قرار دیا ہے۔علاوہ ازیں حیدرآباد رخ کرنے کا ایک سبب والد کے ذریعہ چھوڑا گیا قرض بھی بتایا ہے،لیکن اصل سبب علامہ شبلی سے انگریزوں کی بدگمانی ہی تھی۔علامہ شبلی نے اسی کو واقعات اتفاقی سے تعبیر کیا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں انگریزوں کی بدگمانی اور اس کے اسباب کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔نواب محسن الملک جو اس زمانہ میں علامہ شبلی کے سب سے بڑے بہی خواہ نظر آتے ہیں،انہوں نے بھی شبلی کو حیدرآباد جانے کا مشورہ دیا۔(حیات شبلی ص۳٦٦)اس کی وجہ شاید انگریزوں کی بدگمانی ہی رہی ہوگی،کیوں کہ اس زمانہ میں انگریز علامہ شبلی کے خلاف تھے اور انہیں اتحاد اسلامی کا علم بردار خیال کرتے تھے۔ندوہ سے بھی بدظن تھے۔بہرحال علامہ شبلی کے حیدرآباد بعجلت جانے میں نواب محسن الملک کا مشورہ بھی شامل تھا۔(۲۲)

سنہ۱۹۰۰ء علامہ شبلی کے لئے بڑی کشمکش کا سال تھا۔ابھی انہوں نے علی گڑھ سے قطع تعلق کے بعد مستقبل کا کوئی فیصلہ بھی نہیں کیا تھا کہ ان کے والد شیخ حبیب اللہ نے ۱۲/اگست ۱۹۰۰ء کو انتقال کیا۔اس کے ساتھ ہی تقسیم وراثت کے مسائل کھڑے ہوگئے۔اسی زمانہ میں ایجوکیشنل کانفرنس کا رام پور میں اجلاس ہونا طے پایا تو نواب محسن الملک نے اس میں شرکت کے لئے تقاضا کیا،تاہم وہ غالباً تقسیم وراثت کے مسائل کی وجہ سے شریک نہ ہوسکے۔(۲۳)اسی سال نواب محسن الملک نے انہیں شعبہ دینیات کی کمیٹی کا رکن نامزد کیا اور ان کو میٹنگ میں شرکت کی دعوت دی۔اس کے جواب میں علامہ شبلی لکھتے ہیں:-

”عالی خدمت جناب محسن الملک بہادر سکریٹری مدرسۃ العلوم علی گڑھ

بجواب والا نامہ مورخہ ۳۱/مارچ ۱۹۰۰ء

میں فخر کے ساتھ دینیات کے صیغہ کی ممبری منظور کرتا ہوں لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آج ۲/اپریل کو خط پہنچا ہے،تیسری تک کس ذریعہ سے علی گڑھ پہنچ سکتا ہوں۔

والسلام

شبلی نعمانی

۲/اپریل ۱۹۰۰ء

علامہ شبلی کا یہ خط ان کے کسی مجموعہ مکاتیب میں شامل نہیں ہے۔ اسے سرسید اکیڈمی کے ریکارڈ روم سے حاصل کر کے پروفیسر سعود عالم قاسمی نے اپنی کتاب ''سرسید جدید ذہن کے معمار'' میں شامل کیا ہے۔(۲۴) انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ علامہ شبلی دینیات کے اس جلسہ میں گرچہ شریک نہ ہو سکے تاہم آئندہ سال ۱۴/فروری ۱۹۰۱ء کے جلسہ میں جو نواب محسن الملک کی کوٹھی پر منعقد ہوا تھا، علامہ شبلی نے شرکت کی۔(۲۵) اس اجلاس کی ایک قرارداد یہ تھی کہ:

''سیر کی نسبت یہ قرار پایا کہ بدء الاسلام کی تکمیل مولوی شبلی صاحب کردیں''۔(۲۶)

تاریخ بدء الاسلام کی تکمیل کی بات اور مذکورہ قرارداد دونوں محل نظر ہیں۔ اس لئے کہ بدء الاسلام کی تکمیل تو علامہ شبلی عہد سرسید میں کر چکے تھے اور وہ رسالہ کالج کے نصاب میں شامل ہو چکا تھا بلکہ اس قرارداد سے پہلے سرسید کی فرمائش پر اس کا فارسی ترجمہ بھی علامہ حمید الدین فراہی کر چکے تھے۔

علامہ شبلی نعمانی فروری ۱۹۰۱ء میں حیدرآباد گئے اور سررشتہ علوم وفنون کے ناظم مقرر ہوئے۔ ۱۹۰۲ء میں ان کی کتاب ''الغزالی'' شائع ہوئی۔ متعدد احباب نے اس کی فرمائش کی مگر یہ اعزاز صرف نواب محسن الملک کو حاصل ہوا کہ علامہ شبلی نے ان کی فرمائش پوری کی اور الغزالی خرید کر ان کو بھیجی۔(۲۷)

نواب محسن الملک چاہتے تھے کہ علامہ شبلی علی گڑھ واپس آجائیں، چنانچہ انہوں نے ایک سال پہلے اگرچہ حیدرآباد جانے کا مشورہ دیا تھا تاہم وہ اپنے مشن میں لگے رہے اور علامہ شبلی سے متعلق انگریزوں کے جو شکوک وشبہات تھے ان کے رفع کرنے کی کوشش کی اور جب انہیں کامیابی مل گئی اور گورنر کی طرف سے اجازت مل گئی کہ انہیں علی گڑھ بلا لو تو انہوں نے علامہ شبلی کو لکھا کہ فوراً کالج واپس آجائیے۔(۲۸) یہ ۱۹۰۱ء اور ۱۹۰۲ء کی بات ہے۔

۱۹۰۱ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ۲۹/دسمبر کو مدراس میں منعقد ہوا۔ نواب محسن الملک کی خواہش پر علامہ شبلی بھی اس میں شریک ہوئے اور ''اسلام'' کے عنوان سے ایک وقیع لکچر

دیا۔اس کی صدارت خودنواب محسن الملک نے کی۔اس کا ذکرانہوں نے اپنی صدارتی تقریر میں اس طرح کیا ہے:

''اس وقت جومرض مسلمانوں میں پیدا ہوگیا ہے وہ دوقسم کا ہے۔ایک تو وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ بحیثیت مسلمان ہونے کےکوئی مسلمان دنیاوی ترقی نہیں کر سکتا،ان کا مقولہ ہے کہ''دنیا ہیچ است وکار دنیا ہمہ ہیچ'' دوسری طرف یہ کہا جاتا ہے کہ جو کچھ ہے وہ دنیا ہے۔انگریزی پڑھواور دنیا میں ترقی حاصل کرلو۔اب غورطلب یہ امر ہے کہ اسلام نے دین ودنیا میں کیا رشتہ رکھا ہے۔اسلام نے بتایا ہے کہ دین کیا چیز ہے اور دنیا کیا چیز ہے۔اصلی دوا اسلام کے ڈاکٹر نے جو اس مرض کی بتائی ہے وہ مولوی شبلی صاحب نے بیان کردی ہے اور کوئی ضرورت نہیں کہ میں اب اس کے متعلق زیادہ بیان کروں۔''(۲۹)

علامہ شبلی کا یہ خطبہ خطبات شبلی میں شامل ہے۔

۲۹ردسمبر۱۹۰۲ء سے۴رجنوری۱۹۰۳ء تک ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا۔نواب صاحب کی خواہش پر علامہ شبلی حیدرآباد سے آکر شریک ہوئے۔کانفرنس کا یہی وہ اجلاس ہے جس میں کانفرنس کے مختلف شعبے قائم ہوئے،اس کے ایک شعبہ انجمن ترقی اردو کا سکریٹری علامہ شبلی کومنتخب کیا گیا،جس پروہ اخیر۱۹۰۵ء تک فائز رہے۔یہ سکریٹری شپ بھی نواب محسن الملک اور علامہ شبلی کی دوستی ہی کا نتیجہ تھی۔علامہ شبلی جب تک اس عہدہ پر فائز رہے ترقی اردو کے لئے مسلسل جدوجہد کرتے رہے اور اس کی روداد لکھ کرنواب محسن الملک کو ماہ بہ ماہ پیش کرتے رہے۔یہ رودادیں انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ میں شائع ہوئی ہیں۔اس کی دستیاب تفصیل اس طرح ہے:

۱۔رپورٹ انجمن ترقی اردو،ماہ اپریل۱۹۰۳ء،انسٹی ٹیوٹ گزٹ،۳۰رمئی۱۹۰۳ء

۲۔رپورٹ انجمن ترقی اردو،ماہ مئی۱۹۰۳ء،انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۱۳رجون و۲۰رجون۱۹۰۳ء

۳۔رپورٹ انجمن ترقی اردوماہ جون۱۹۰۳ء۔انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۵رجولائی۱۹۰۳ء

۴۔رپورٹ انجمن ترقی اردوماہ جولائی۱۹۰۳ء،انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۹راگست۱۹۰۳ء

۵۔ رپورٹ انجمن ترقی اردو ماہ اگست ستمبر ۱۹۰۳ء انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۶ را کتوبر ۱۹۰۳ء

انجمن ترقی اردو کی یہ رودادیں جہاں علامہ شبلی کی انجمن ترقی اردو کے لئے انتہائی محنت و جدوجہد سے واقف کراتی ہیں وہیں دوسری طرف نواب محسن الملک سے ان کی بے پناہ دلچسپی کا بھی پتہ دیتی ہیں۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں شائع شدہ مذکورہ بالا رودادوں کی نشاندہی باقیات شبلی کے مصنف مشتاق حسین مرحوم نے کی تھی، ممکن ہے گزٹ میں اور بھی رودادیں شائع ہوئی ہوں۔؟ کاش! کوئی ان کی نشاندہی کر سکتا۔

انجمن ترقی اردو کی ان رودادوں سے علامہ شبلی کی ترقی اردو کی گہری دلچسپی کے ساتھ ان کے بعض نظریات سے بھی واقفیت ہوتی ہے جو وہ بے تکلفی کے ساتھ نواب صاحب کو لکھ جاتے ہیں، مثلاً جب انجمن ترقی اردو نے تراجم کتب کے لئے اشتہار شائع کیا تو کس طرح کا معاملہ سامنے آیا۔ علامہ شبلی ماہ جولائی ۱۹۰۳ء کی روداد میں لکھتے ہیں:

> ''جب انجمن اردو کی تجویزیں تمام ملک میں شائع ہوئی تھیں تو کلکتہ سے لے کر لاہور تک ہر طرف سے اس کثرت سے ترجمہ کرنے کے لئے درخواستیں آئیں کہ مجھ کو گمان ہوا ہندوستان عباسیوں کا بغداد بن گیا ہے۔ لیکن جب مقررہ کتابوں کا اشتہار چھپا تو تقریباً ہر طرف سے سناٹا تھا۔ کتاب النباتات (Story of the Planto) اور طبقات الارض (Story of the Earth) کو کسی نے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ کتاب الروح (Story of Mind) کا صرف ایک ترجمہ اور سولر سسٹم کے تین ترجمے آئے جن کی کیفیت آگے آئے گی۔
>
> آپ یہ سن کر تعجب کریں گے کہ ترجمہ کرنے والے انگریزی کے اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں لیکن بجز ایک کے باقی تمام ترجمے ناقص اور ابتر ہیں۔
>
> کیا اس نتیجہ کے بعد بھی ہمارا قومی کالج علی گڑھ سائنس اور عربی زبان کی تعلیم پر خاص توجہ مبذول نہیں کرے گا۔ مترجمین کے گروہ کثیر میں سے اکثر نے سائنس کا کورس ہی نہیں لیا تھا۔ اس لئے انہوں نے مشتہرہ کتابوں کو ہاتھ نہیں لگایا اور جنہوں نے سائنس کو لیا تھا وہ عربی زبان سے ناآشنا تھے اس لئے علمی اصطلاحات کے ترجمہ

کے لئے ان کو عمدہ اور مناسب الفاظ نہیں مل سکتے تھے۔

میں آپ سے پھر دوبارہ کہتا ہوں کہ عربی زبان کی تعلیم کے بغیر یورپ کے علوم وفنون سے قوم کو فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔'' (۳۰)

اس اقتباس کی آخری سطروں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے بھی نواب محسن الملک کو اس طرف متوجہ کرا چکے تھے۔ البتہ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ نواب صاحب نے اس کا کیا جواب دیا۔؟

ایجوکیشنل کانفرنس کے اسی اجلاس میں ۲؍جنوری ۱۹۰۳ء کو علامہ شبلی نے ''اسلام اور تعصب'' کے عنوان سے ایک لکچر دیا۔ نواب محسن الملک نے اس کا اعلان اس طرح کیا:

''مولانا شبلی صاحب جن کی عالمانہ قابلیت سے آپ خوب واقف ہیں اور جن کی تعریف میں خود نہیں کرنا چاہتا وہ ایک لکچر دیں گے جس کا عنوان ہے اسلام اور تعصب۔'' (۳۱)

علامہ شبلی انجمن ترقی اردو کے تقریباً تین برس سکریٹری رہے، بعد ازاں مستعفی ہو گئے۔ لیکن تین برس انہوں نے بڑی دلجمعی سے انجمن کی خدمات انجام دیں۔ ان کی گراں قدر خدمات کا اندازہ انجمن کی ان رودادوں سے لگایا جا سکتا ہے جو انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور لسان الصدق میں شائع ہوئی ہیں۔ نواب صاحب نے ان کی خدمات کا اعتراف کیا ہے۔ ۳۰؍دسمبر ۱۹۰۳ء کی کانفرنس میں انہوں نے کہا کہ:

''ایک تو لٹریری سکشن ہے جس کے سکریٹری ہمارے نامور عالم اور مشہور عالی دماغ شمس العلماء مولانا شبلی نعمانی ہیں جن کے استقلال اور توجہ اور علمی قابلیت سے انجمن ترقی اردو نہایت مستحکم بنیاد پر قائم ہوئی ہے اور جو اپنا کام نہایت عمدگی اور خوبی سے انجام دے رہے ہیں اور جس کے عمدہ نتائج حاصل ہونے کی پوری امید ہے۔'' (۳۲)

علامہ شبلی نے انجمن کے حوالہ سے جو خدمات انجام دیں اب تک اس کا بھرپور جائزہ نہیں لیا جا سکا ہے۔ علامہ شبلی کے کارناموں میں یہ ایک اہم کارنامہ ہے۔ اس کا مستقل مطالعہ و جائزہ ضروری ہے۔

جس وقت علامہ شبلی حیدر آباد کی ملازمت کی مصروفیات کے باوجود ترقی اردو کے لئے مسلسل جدوجہد کر رہے تھے اور اس کی روداد یں انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں چھپ رہی تھیں، عین اسی زمانہ میں کسی شخص نے نواب محسن الملک کو ایک مراسلہ لکھا جو انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ۲۱/ مارچ ۱۹۰۳ء کو شائع ہوا، اس مراسلہ میں علی گڑھ کالج سے متعلق بعض نازیبا باتیں لکھی گئی تھیں اور خود نواب محسن الملک کی نیت پر شک کیا گیا تھا۔ مراسلہ نگار نے اس عیاری سے مراسلہ لکھا تھا کہ بغیر نام لئے اس کا انتساب علامہ شبلی کی طرف ہو جائے اور یہی ہوا بھی، چنانچہ علامہ شبلی نے اس کی اشاعت پر سخت ناراضی ظاہر کی۔ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی کو ایک خط میں لکھا کہ:

''نواب محسن الملک نے گم نام خط چھاپنے میں سخت غلطی کی۔ کم سے کم مجھ سے پہلے پوچھ لینا تھا۔ وہ سب ایک حیدر آبادی مفسد کی کارروائی ہے''۔ (۳۳)

اس کے بعد خود نواب محسن الملک کو مفصل خط لکھا چوں کہ اس سے علامہ شبلی کے علی گڑھ کالج سے متعلق بعض اہم خیالات و نظریات سامنے آتے ہیں، اس لئے اسے نقل کیا جاتا ہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''کون یہ گمان کر سکتا تھا کہ ایک شخص جس نے ۱۶/ برس تک کالج کی وفادارانہ ملازمت کی ہو، جس نے اپنی مشہور تصنیفات کالج کو دیا ہو، جس نے اپنے مقدور کے موافق وقتاً فوقتاً کالج کی مالی اعانت کی ہو، جو اکثر کانفرنس کے جلسوں میں اب تک شریک ہوتا رہا ہے اور جو اب بھی خواب دیکھتا رہتا ہے کہ اگر اس کو موجودہ تعلقات سے آزادی مل سکے تو پھر کالج کے احاطہ میں رہ کر سال کا بڑا حصہ کالج کی خدمت میں بلا کسی مالی معاوضہ کے صرف کرے، اس کی نسبت جب ایک گمنام چٹھی چھپے اور اس میں اس کی نسبت باغیانہ خیالات منسوب کئے جائیں تو نواب محسن الملک بلا اس دریافت کے کہ نویسندہ کون شخص ہے؟ اور اس کا کیا پایہ ہے؟ اور یہ کہ نویسندہ نے جو واقعہ بیان کیا ہے وہ کسی پبلک موقع کا واقعہ ہے یا پرائیویٹ استراق سمع ہے، اس خط کو چھاپ دیں اور پھر تمام قوم میں ایک غلغلہ برپا ہو جائے اور لوگ اس کی بنیاد پر مضامین کا تار باندھ دیں، ان ہذالشی عجاب ،

ہمارے بزرگ مولانا حالی نے بالکل سچ کہا ہے

اگر سن لیں کسی قومی جماعت میں شکر رنجی

ہزاروں ہوں گی یہ بدفال سن کر شادیاں ہم میں (۳۴)

علامہ شبلی نے جس حیدرآبادی مفسد کا ذکر کیا ہے اس کی نشاندہی نہیں ہوسکی تاہم اس سے یہ ضرور واضح ہوتا ہے کہ کوئی ایسا شخص ضرور تھا جسے سرسید کے بعد نواب محسن الملک سے علامہ شبلی کی قربت سوہان روح تھی۔ ماضی میں سرسید کے زمانہ میں بھی اس طرح کے بعض گم نام خطوط لکھے گئے تھے اور علامہ شبلی کو مطعون کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کی تفصیل ''حیات شبلی'' اور ''مکتوبات شبلی'' وغیرہ میں موجود ہے۔

بابائے اردو مولوی عبدالحق [۱۸۷۰۔۱۹۶۱ء] بھی اس وقت حیدرآباد میں تھے۔ جن کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی نے لکھا ہے کہ انہوں نے کسی وجہ سے ۱۹۰۲ء سے علامہ شبلی پر جا و بے جا اعتراض کرنا اپنا مسلک ہی بنالیا ہے (۳۵)، علامہ شبلی کا ذہن غالباً انہیں کی طرف گیا ہو، اس لئے کہ جب مولانا عبدالماجد دریابادی [۱۸۹۲-۱۹۷۶ء] نے الکلام پر ایک طالب علم کے نام سے ماہنامہ الناظر لکھنو میں تنقید لکھی تھی اس وقت بھی ان کی نظر ان ہی کی طرف اٹھی تھی (۳۶)۔ اس زمانہ میں حیدرآباد میں بابائے اردو شبلی مخالف سرگرمیوں میں مصروف تھے اور وہ یہ سب کچھ سرسید اور مولانا حالی کی حمایت کے نام پر کرتے تھے۔ انہوں نے اپنی متعدد تحریروں میں علامہ شبلی پر بے جا نقد بھی کیا ہے، مگر کسی ذرائع سے اب تک اس کی تصدیق نہیں کی جاسکی ہے کہ یہ گم نام خط بابائے اردو نے لکھا تھا اور وہ حیدرآبادی مفسد کون تھا۔؟

مولانا شبلی کے خط کا نواب محسن الملک نے کیا جواب دیا یہ تو نہیں معلوم ہوسکا، البتہ اس خط کی اشاعت سے چند دن پہلے ۲۵/اپریل ۱۹۰۳ء کو انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں ''شمس العلما مولوی شبلی نعمانی اور مدرسۃ العلوم علی گڑھ'' کے عنوان سے مرتب کی طرف سے ایک تحریر شائع ہوئی تھی۔ وہ تحریر یہ ہے:

''ہم کو تو کبھی اس کا خیال نہ تھا کہ کوئی سمجھدار آدمی جو مولانا کو جانتا ہے اور ان کے مزاج اور طبیعت اور ان تعلقات سے جو ان کو کالج کے ساتھ ہیں واقف ہے، یہ

شبہ کرے گا کہ جو باتیں حیدرآبادی صاحب نے لکھی تھیں وہ کبھی ان کی زبان سے نکلی ہوں۔مولانا کی شان اس سے بہت ارفع واعلی ہےاور ہم نے تو جواب میں اپنا خیال صاف ظاہر کر دیا تھا اور لکھ دیا تھا کہ ہمارے کالج کا کوئی پروفیسر ایسی باتیں نہیں کہہ سکتا''۔(۳۷)

گمنام خط کی اشاعت پر اگر چہ علامہ شبلی نے ناراضی ظاہر کی مگر نواب صاحب سے ان کے دوستانہ مراسم میں کسی طرح کا خلل واقع نہیں ہوا اور تعلقات بدستور رہے اور نواب صاحب انہیں کالج سے منسلک کرنے کے لئے اس زمانہ میں بھی کوشاں رہے اور جوں ہی انہیں اطلاع ملی کہ علامہ شبلی نے حیدرآباد سے قطع تعلق کر لیا ہے۔انہوں نے علامہ شبلی کو لکھا کہ فوراً کالج میں چلے آ ئیے۔حیدرآباد کا سابقہ وظیفہ بھی جاری ہو جائے گا اور ۱۰۰ روپیہ کالج سے بھی ملیں گے۔(۳۸)

علامہ شبلی نے علی گڑھ کالج سے استعفیٰ سید محمود [۱۸۵۰ - ۱۹۰۳ء] کے زمانہ سکریٹری شپ یعنی مئی ۱۸۹۸ء میں دیا تھا۔ چند ماہ بعد جب نواب محسن الملک سکریٹری منتخب ہوئے اسی وقت سے وہ علامہ شبلی کو واپس لانے کے لئے کوشاں ہو گئے۔علامہ شبلی کبھی راضی نہیں ہوئے۔ ۱۹۰۴ء میں علی گڑھ کے لئے نواب صاحب کے تقاضے بہت بڑھ گئے۔چنانچہ انہوں نے مولانا حبیب الرحمٰن شروانی سے مشورہ کے لئے خط لکھا کہ:

''کئی مہینہ سے نواب محسن الملک نہایت اصرار سے زور دے رہے ہیں کہ کالج آ جاؤ۔دوسو مشاہرہ ہوگا اور وظیفہ حیدرآباد بھی بحال رہے گا۔میں سال بھر سے کوشش کر رہا تھا کہ وظیفہ بحال ہو جائے تو نوکری چھوڑ کر ندوہ میں چلا آؤں۔تین ہفتے ہوئے اس کوشش میں ناکامی ہوئی۔نواب محسن الملک لکھتے ہیں کہ اگر کالج میں آؤں تو یہاں سے کوشش کرائی جائے اور وظیفہ جاری ہو جائے ، اب فرمائیے کیا کروں، کالج میں ندوہ کیوں کر ہو سکے گا اور کالج میں نہ آؤں تو حیدرآباد رہ کر اور بھی ندوے سے دوری ہے۔کوئی معقول رائے دیجئے''۔(۳۹)

شروانی صاحب نے کیا رائے دی یہ تو نہیں معلوم البتہ چند ماہ بعد چند شرائط کے ساتھ علامہ شبلی علی گڑھ آنے کے لئے راضی ہو گئے اور انہوں نے نواب محسن الملک صاحب کو رضامندی

کا خط بھی لکھ دیا۔مولانا حبیب الرحمٰن شروانی کے نام ایک خط میں لکھا ہے کہ:

> ''میں نے نواب محسن الملک کے خط کے جواب میں ان کو جو لکھا ہے وہ یہ کہ ۲۰۰ روپئے ماہوار کالج پر خواہ مخواہ ایک بار ہے،اس لئے میری خواہش یہ ہے کہ میں کالج میں آ کر بلا معاوضہ کام کروں،البتہ یہ چاہتا ہوں کہ سال میں میرے قیام کالج کی مدت لازمی صرف چار پانچ مہینے قرار دیئے جائیں،باقی اختیاری۔اس صورت میں ندوہ میں کام کرنے کا اچھا موقع ملے گا۔میں نے صراحتاً یہ بھی لکھ دیا ہے کہ بہر حال میں ندوہ سے عملی تعلق رکھوں گا۔''(۴۰)

اسی زمانہ میں مولوی سید ولی الحق پٹنہ کو ایک خط میں صاف لکھا کہ بقیہ زندگی علی گڑھ میں بسر کروں گا۔(۴۱) لیکن پھر یہ ممکن نہ ہو سکا۔

علامہ شبلی حیدر آباد سے ندوہ جانا چاہتے تھے۔ان کے علی گڑھ کے احباب اسے خودکشی سے تعبیر کرتے تھے۔نواب محسن الملک نے انہیں سمجھایا کہ ''ندوہ کی اس کسمپرسی کی حالت میں تو کوئی شخص آپ کا مزاحم نہ ہوگا،لیکن جب ترقی کے آثار نمایاں ہوں گے تو دفعتاً تمام مولوی آپ پر ٹوٹ پڑیں گے اور آمادہ مخالفت ہوں گے۔'' بقول مولانا سید سلیمان ندوی ان کی یہ پیشین گوئی پوری ہوئی۔(۴۲)

حیدر آباد سے علامہ شبلی کی علاحدگی کی اطلاع جب بھوپال پہنچی تو کشور آرائے بھوپال نواب سلطان جہاں بیگم انہیں بھوپال لانے کے لئے کوشاں ہوئیں اور چوں کہ علامہ شبلی سے نواب محسن الملک کی قربت جگ ظاہر تھی،اس لئے انہوں نے نواب صاحب ہی کو واسطہ بنایا، نواب صاحب نے علامہ شبلی کو لکھا کہ:

> ''مولانا !ہر ہائنس بیگم صاحبہ نے مجھ سے دریافت کیا ہے کہ مولوی صاحب یہاں آنا پسند کریں گے یا نہیں۔؟اگر آئیں گے تو کیا مشاہرہ قبول کریں گے۔ فرمایئے کیا جواب دیا جائے۔آپ کی طبیعت کیسی ہے۔الندوہ کب نکلے گا۔آپ کے قبضہ میں ندوہ کے آنے سے حضرات علماء کا کیا حال ہے۔مدد دیں گے یا فرنٹ ہو جائیں گے۔''(۴۳)

مولانا شبلی نے بھوپال کے قیام کی پیش کش بھی ٹھکرا دی اور احباب کے تمام خدشات کے باوجود نونہالان ملت کی خیر خواہی کے جذبات سے سرشار ندوہ آ گئے اور پھر ندوہ میں ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اور جس طرح ہوا وہ اب ہماری ملی تاریخ کے المیوں میں سے ایک ہے۔

اس سال یعنی ۱۹۰۵ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس رام پور میں ہونا طے پایا تو نواب صاحب نے علامہ شبلی سے شرکت کی درخواست کی مگر شاید وہ شریک نہ ہو سکے۔(۴۴) اسی سال ایم اے او کالج کی سینٹرل کمیٹی کی تشکیل ہوئی تو نواب محسن الملک نے علامہ شبلی کو سینٹرل کمیٹی کا رکن نامزد کر دیا۔ مگر علامہ شبلی نے معذرت کا خط لکھا:

جناب من!

''والا نامہ ورود فرما ہوا، سینٹرل کمیٹی کی ممبری میرے لئے موجب فخر ہے، لیکن میں اس کو پسند نہیں کرتا کہ بغیر کسی خدمت اور محنت کے محض فخر کے لئے اپنا نام فہرست میں لکھواؤں، میں سال بھر سے بیمار اور ضعیف ہوں، کوئی دماغی کام نہیں کر سکتا، تصنیف کا مشغلہ بالکل بند ہے، جب کسی کام کے قابل ہوں گا تو فخر سے اس عہدہ کو قبول کروں گا۔''(۴۵)

لیکن نواب صاحب نے یہ خط واپس کر دیا اور لکھا کہ:

''یہ خط واپس ہے، منظوری کا عنایت نامہ عنایت ہو، عذر نامسموع براہ کرم ضرور منظور فرمایئے، مجھ پر احسان ہوگا''۔(۴۶)

علامہ شبلی کے ندوہ سے وابستہ ہو جانے کے بعد ۱۹۰۶ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس ڈھاکہ میں منعقد ہوا۔ چنانچہ نواب محسن الملک نے انہیں اصرار کر کے ڈھاکہ بلایا اور وہ اجلاس میں شریک ہوئے اور ۲۲؍دسمبر کے اجلاس میں جس کی صدارت سفیر ایران مرزا شجاعت علی بیگ نے کی تھی ''تاریخ اسلام'' کے موضوع پر خطبہ دیا۔

اسی زمانہ میں ایم اے او کالج میں عربی کی ایک اعلیٰ جماعت قائم کی گئی اور اس کی تدریس کے لئے جرمنی سے جوزف ہارویز بلائے گئے تو نواب محسن الملک نے ۲۰۰ ماہوار پر علامہ شبلی کو ان کا اسسٹنٹ بنانا چاہا، مگر علامہ نے اسے بھی قبول نہیں کیا۔(۴۷) چند ماہ بعد فروری ۱۹۰۷ء میں

علامہ شبلی کی خواہش پر مولانا حمید الدین فراہی کو نواب صاحب ہی نے ایم .اے .او کالج کا استاد منتخب کیا تھا۔ (۴۸) اس سال [۱۹۰۷ء] ندوہ کے سالانہ اجلاس میں علامہ شبلی نے نواب محسن الملک کو مدعو کیا اور ان کی خواہش تھی کہ وہ شریک ہوں۔ (۴۹) لیکن یہ تفصیل معلوم نہ ہوسکی کہ آیا وہ شریک ہوئے یا نہیں۔؟

مولانا مسیح الزماں خاں صدر المدرسین ندوہ اور بعض دوسرے علمائے ندوہ الکلام کے حوالہ سے علامہ شبلی کے عقائد پر سوالات کرنے کے لئے جس وقت جمع ہوئے اتفاقاً نواب محسن الملک وہاں آ گئے اور وہ الکلام لے کر وہاں سے چلے گئے۔ (۵۰)

۱۷مئی ۱۹۰۷ء کو علامہ شبلی کے حادثہ پا کا سانحہ پیش آیا جس سے ملک میں کہرام مچ گیا، نثر نگاروں نے مضامین اور شعرا نے قطعات وغیرہ کے ذریعہ رنج وغم کا اظہار کیا۔ ماہنامہ الندوہ میں کئی قطعات ور باعیاں شائع ہوئیں۔ مولانا حالی نے اس حادثہ پر جو رباعی کہی تھی وہ بھی الندوہ میں شائع ہوئی ہے۔ اس موقع پر بھی نواب محسن الملک علامہ شبلی کو نہیں بھولے اور خط لکھ کر احوال دریافت کئے۔ چنانچہ علامہ شبلی نے انہیں ایک مفصل خط لکھ کر احوال سے آگاہ کیا۔ نواب صاحب نے یہ مفصل خط انسٹی ٹیوٹ گزٹ مورخہ ۵/جون ۱۹۰۷ء (ص ۸) میں شائع کرادیا تا کہ ان کی صحت کا علم قارئین کو ہو جائے، حالانکہ وہ اس وقت خود بیمار اور مہابلیشور بمبئی میں زیر علاج تھے۔ وہاں سے انہوں نے علامہ شبلی کو لکھا کہ:

> ’’آپ یہاں تشریف لا کر اپنا علاج کرائیں۔ یہاں سے بہتر نہ الہ آباد میں علاج ہوسکتا ہے نہ لکھنؤ میں۔ بمبئی میں ایک نہایت لائق ڈاکٹر رجب علی نامی ہیں جو اپنے فن میں کامل مہارت رکھتے ہیں اور دواخانہ بھی خود ان کا ہے۔ وہ آپ کا علاج اور مصنوعی پاؤں کا بنوانا بلا کسی قسم کی فیس اور خرچ کے اپنے ذمے لیتے ہیں۔‘‘ (۵۱)

علامہ شبلی نے اپنے دوست کی بات مانی اور بمبئی جا کر علاج کیا اور مصنوعی پاؤں بنوایا۔ مگر کسی تحریر سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ پاؤں کس ڈاکٹر نے بنایا تھا۔ آیا وہ ڈاکٹر رجب علی ہی تھے یا کوئی اور۔ اور جب علامہ شبلی صحت مند ہو کر ندوہ لکھنو پہنچے تو نواب صاحب علی گڑھ سے عیادت کے لئے لکھنؤ آئے۔ (۵۲)

نواب محسن الملک اور شبلی کے ربط وتعلق کی داستان یہیں ختم نہیں ہوتی بلکہ اس سے بھی آگے بڑھ کر ذہنی اور کسی قدر فکری اشتراک کے پہلو بھی سامنے آتے ہیں۔ دونوں کی تعلیم وتربیت قدیم طریقہ تعلیم کے مطابق ہوئی تھی۔ دونوں جدید تعلیم اور روشن خیالی کے علمبردار تھے۔ دونوں کو سرسید سے گہرا ربط وتعلق رہا۔ سرسید تو شبلی کے مربی ہی تھے، مگر اس اشتراک فکر وعمل کے باوجود دونوں کو سرسید کے مذہبی افکار سے اختلاف رہا۔ علامہ شبلی کے نقطہ نظر سے اہل علم بخوبی واقف ہیں کہ انہوں نے اس اختلاف رائے کا برملا اظہار کیا ہے اور لکھا ہے کہ میں ۱۶؍ برس سرسید کے ساتھ رہا اور ان کے مذہبی اور پولٹیکل خیالات کے خلاف رہا اور کانگریس کو دل سے پسند کرتا رہا۔

نواب محسن الملک کا بھی یہی نقطہ نظر تھا اور وہ بھی ان کے بعض مذہبی افکار سے متفق نہ تھے۔ حتی کہ ان سے اس سلسلہ میں خطوط کے ذریعہ اعلانیہ اختلاف کیا۔ اس کے بارے میں پروفیسر اصغر عباس نے لکھا ہے کہ:

> ''دونوں میں روابط کا آغاز سرسید کی تصنیف تبین الکلام فی تفسیر التوراۃ والانجیل علی ملۃ الاسلام میں ان کے بعض خیالات کے اختلاف سے ہوا۔ بعد میں انہوں نے سرسید کی تفسیر قرآن میں ان کے بعض مضامین سے بھی اختلاف کیا۔ دونوں کے مابین اختلاف کا خاص مسئلہ قانون فطرت کا سرسید کا تصور ہے۔ ان اختلافات کی تفصیل مکاتبات الخلان میں ملتی ہے۔ محسن الملک کو سرسید کے بعض تہذیبی افکار سے بھی اختلاف تھا۔ ان کے نزدیک مغرب سے آئے ہوئے عوارض میں سب سے بڑی بیماری آزادی ہے۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ہم نہ صرف مشرقی امراض کے لئے معالجہ کے محتاج ہیں بلکہ ہم کو ایسے طبیب کی بھی ضرورت ہے، جو مغربی بیماریوں سے بھی بچائے۔ انہوں نے سائنس اور مذہب کے درمیان توازن کی ضرورت پر بھی زور دیا۔ وہ جدید تعلیم کے نتائج سے بھی مایوس تھے۔ ان کے نزدیک اس تعلیم نے سیرتوں میں مثبت تبدیلی کے بجائے کورانہ تقلید کو فروغ دیا ہے۔ ۱۸۹۳ء میں جب وہ حیدرآباد سے سبکدوش ہوکر علی گڑھ آئے تو یہاں علی گڑھ کالج کے انتظامی امور میں انہیں سرسید سے اختلاف پیدا ہوا اور وہ بمبئی

چلے گئے''۔(۵۳)

سرسید سے نواب محسن الملک کے یہ ضمنی اختلافات اخیر تک قائم رہے اور ان میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی۔(۵۴)

پروفیسر اصغر عباس صاحب کے محولہ بالا اقتباس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان میں اور علامہ شبلی نعمانی کے نقطۂ نظر میں کس قدر ہم آہنگی تھی۔ البتہ علامہ شبلی سرسید کے مذہبی افکار کے ساتھ ان کے بعض سیاسی افکار کے بھی ناقد تھے اور اس کو دل سے ناپسند کرتے تھے۔ جب کہ نواب محسن الملک ہم نوا تھے۔

اسی طرح تحریک ندوہ کے دونوں ہمدرد اور بہی خواہ تھے اور دل و جان سے اس کی ترقی کے خواہش مند تھے۔ علامہ شبلی نے ندوہ اور تحریک ندوہ کے لئے اپنا سب کچھ نچھاور کردیا۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں۔ البتہ یہ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ ۱۸۹۴ء میں جب تحریک ندوہ قائم ہوئی تو نواب محسن الملک اس کے بڑے مؤید تھے۔ ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس منعقدہ ۲۹ر دسمبر ۱۸۹۴ء علی گڑھ میں انہوں نے تحریک ندوہ کی حمایت میں زبردست اور طویل تقریر کی اور یہ ریزولیشن پاس ہوا کہ:

> ''اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ جلسہ ندوۃ العلماء جو بمقام کان پور منعقد ہوا تھا اور جس میں علما اور اکابر دین جمع ہوئے تھے تمام مسلمانوں کی توجہ کے لائق ہے اور اس کے مقاصد یعنی اصلاح طریقہ تعلیم اور رفع نزاع باہمی نہایت عمدہ اور مفید ہیں۔ تمام مسلمانوں کو ایسی عمدہ اور مفید مجلس کی جس سے مسلمانوں کی دینی اور دنیوی بہبودی مقصود ہے بدل و جان، قلم سے، قدم سے، درم سے مدد کرنی چاہئے۔''(۵۵)

انہوں نے تحریک ندوۃ العلماء کی حمایت میں جو تقریر کی ہے، اس سے واضح ہوتا ہے کہ علامہ شبلی اور نواب صاحب کے خیالات بالکل یکساں تھے۔ انہوں نے جو دلیلیں دی ہیں وہ خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ انہوں نے جدید و قدیم دونوں فرقوں میں یکسانیت کا ذکر کیا ہے۔ پھر پہلے فرقہ یعنی جدید تعلیم کے ہم نواؤں کے بارے میں لکھتے ہیں:

> ''پہلا فرقہ جو قوم کی ترقی کے غم میں گھلا جاتا ہے۔ وہ کیا کہتا، کیا کرتا اور کیا

چاہتا ہے، اگر مختصر لفظوں میں بیان کیا جاوے تو وہ یہ کہتا ہے کہ قوم غافل اور کاہل ہے۔ باہم ان کے بات بات پر جھگڑے اور قصے ہیں۔ ان کی موجودہ تعلیم ناکافی ہے، ان کا طرز تعلیم غیر مفید ہے اور تربیت قطعاً مفقود۔ اس لئے وہ چاہتے ہیں کہ ان کا باہمی اختلاف دور ہو۔ تعلیم کے نقصوں کی اصلاح کی جاوے۔ طرز تعلیم مفید بنایا جاوے۔ تربیت کی تدبیریں کی جائیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مغربی علوم وفنون جو اس زمانہ میں دولت، عزت، علم اور خیالات کی ترقی کے لئے شرط لازمی ہیں سکھائے جاویں۔ اسی کے لئے وہ مجلسیں کرتے ہیں، انجمن بناتے ہیں، کانفرنس قائم کرتے ہیں، آرٹیکل لکھتے ہیں، اسپیچیں دیتے ہیں، لکچر سناتے ہیں، رزولیشن پاس کرتے ہیں، بزرگوں کے قصے سنا کر قوم کو جوش دلاتے ہیں، ان کی موجودہ حالت کے درد انگیز مرثیے پڑھ کر روتے اور رلاتے ہیں، اسکول قائم کرتے ہیں، کالج بناتے ہیں اور قوم کے لئے قوم سے بھیک مانگتے ہیں۔............ مگر اس کے ساتھ وہ دین کو بھی نہیں بھولتے۔ مسلمانوں کو اسلام پر قائم رہنے کی تدبیروں سے بھی غفلت نہیں کرتے۔ نئی تعلیم کے مضر اور خوف ناک برائیوں سے بھی اپنی قوم کو بچانا چاہتے ہیں اور الحاد ودہریت کی عالم گیر بلا سے اپنے نوجوان بچوں کی حفاظت کی فکر کرتے ہیں۔ ان کو بڑا خوف اس بات کا ہے کہ کہیں الحاد کی وبا جو یورپ میں پھیلی ہوئی ہے ہم تک نہ پہنچے اور ہمارے نوجوان طالب علم مذہب کے مضبوط اور مستحکم جہاز کو چھوڑ کر سائنس کے وسیع وعمیق سمندر میں نہ جا پڑیں۔(۵٦)

اس کے بعد نواب صاحب نے تحریک ندوہ کے پہلے اجلاس کی روداد سے ان کے مقاصد کا تعارف کرایا ہے:

''آپ دوسرے فرقہ کو دیکھئے جو علما اور دین داروں کا ہے۔ جو اپنی مسجد اور خانقاہ سے نکل کر قوم کے سامنے آیا ہے اور قوم کی ڈوبتی کشتی کو بچانے کو اس نے اپنا ہاتھ بڑھایا ہے۔ اگر آپ جاننا چاہتے ہیں کہ یہ حضرات کیا فرماتے۔ کیا چاہتے اور کیا کرتے ہیں تو اس کتاب (روداد ندوہ) کو دیکھئے جو میرے ہاتھ میں ہے۔ اس

روداد کو دیکھنے سے آپ کو معلوم ہوگا کہ اس مقدس فرقہ کو اپنی قوم کی غفلت اور کاہلی کی شکایت ہے اور نہ صرف عوام بلکہ خود علماء کے باہمی اختلاف اور مخالفت پر افسوس ہے۔ وہ بھی موجودہ تعلیم کو غیر کافی اور قابل اصلاح اور طرز تعلیم کو غیر مفید اور لائق تبدیل سمجھتا ہے۔ یہ اکابرین بھی مغربی علوم وفنون کے سیکھنے کی ضرورت بتاتے ہیں بلکہ اب تک جو غفلت اس سے کی گئی اسے بدنصیبی سمجھتے ہیں۔ اب انہوں نے اس امر کی ضرورت سمجھی ہے کہ شخصی کارروائی چھوڑی جائے اور جمہوری قوت سے کام لیا جائے۔'' (۵۷)

اس تقریر کے بعد بھی وہ کانفرنس کے جلسوں میں تحریک ندوہ کی تائید کرتے رہے، بلکہ بعض لوگوں نے اعتراض کیا تو دلائل سے انہیں قائل کرنے کی کوشش کی۔ تحریک ندوہ میں علامہ شبلی کی شمولیت پر انہوں نے کبھی اعتراض نہیں کیا، البتہ جب وہ دارالعلوم ندوہ میں مستقل قیام کرنے کے خواہاں ہوئے تو انہوں نے روکا۔ اس لئے کہ وہ علماء کے اختلافات اور ان کے طریقہ کار سے بخوبی واقف تھے۔

بعض اور باتوں میں بھی علامہ شبلی اور نواب صاحب میں ہم آہنگی فکر ونظر تھی۔ تاہم یہاں اس کی تفصیل قلم انداز کی جاتی ہے۔

۱۶/اکتوبر ۱۹۰۷ء کو نواب محسن الملک نے شملہ میں وفات پائی۔ علامہ شبلی اس وقت لکھنؤ میں تھے۔ اس خبر سے دل برداشتہ ہوئے۔ ''ہائے محسن الملک'' کے عنوان سے وفیاتی مضمون لکھا اور سخت ماتم کیا۔ جس کا ایک ایک حرف غم ناک ہے۔ اس میں پہلے نواب صاحب کی شخصیت اور خدمات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ پھر ان کے کارناموں کو بیان کرنے کے ساتھ ان کی ذاتی زندگی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ لکھتے ہیں:

''مرحوم ذاتی صفات کے لحاظ سے بھی نادرہ روزگار تھے۔ اس درجہ اس عزت، اس رتبہ پر ان کے اخلاق کا یہ حال تھا کہ ادنی درجہ کے آدمیوں سے بہ ادب و عزت ملتے تھے۔ ملاقات میں ہمیشہ پیش قدمی کرتے تھے۔ سب سے جھک کر ملتے تھے۔ اس کے ساتھ نہایت فراخ حوصلہ، فیاض، سخی اور جواد تھے اور یہی اوصاف تھے جن کی وجہ سے انہوں نے عالم کو مسخر کر لیا تھا''۔ (۵۸)

علامہ شبلی کے دلی رنج وغم بلکہ دلی جذبات کا اندازہ وفیاتی مضمون کے آخری چند جملوں سے ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

محسن الملک ! جا اور خوش خوش خدا کے سایۂ رحمت میں آرام کر، تو درد بھرا دل رکھتا تھا، لوگ تیرے لئے بھی روئیں گے اور بہت روئیں گے۔

در روزگارِ عشق تو ماہم فدا شدیم
افسوس کز قبیلہ مجنوں کسے نما ند(۵۹)

غرض نواب محسن الملک اور علامہ شبلی میں ہمیشہ گہرے مراسم وتعلقات رہے۔ دونوں ایک دوسرے کے دکھ درد میں ہمیشہ شریک اور اخیر تک خیر خواہ رہے۔ جن اہل قلم نے علامہ شبلی نعمانی کو علی گڑھ تحریک کا مخالف قرار دیا ہے شاید ان کی نظر علامہ شبلی کے کالج سے مستعفی ہو جانے کے بعد کالج اور خصوصاً نواب محسن الملک مرحوم سے قریبی اور نج کے تعلقات پر نہیں تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی کالج کے ہمیشہ خیر خواہ رہے اور ان سے جو کچھ بن پڑا وہ کرتے بھی رہے۔ آخری دور میں یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی کے ایک رکن کی حیثیت سے کالج کو یونیورسٹی بنانے کی جد و جہد میں ان کا بھی حصہ ہے جس کا خاطر خواہ ذکر نہیں کیا جاتا۔ واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی کا سرسید، نواب محسن الملک اور علی گڑھ کالج سے تعلق کبھی کم نہیں ہوا۔ ○

حوالے

(۱) مقالات شبلی ج ۸ ص ۱۹۳
(۲) مجموعہ لکچرز و اسپیچز ،نواب محسن الملک ص ۱۷۴-۱۷۵
(۳) حیات شبلی ص ۲۶۹-۲۷۰
(۴) حیات شبلی ص ۲۷۰
(۵) حیات شبلی ص ۲۷۰-۲۷۱
(۶) حیات شبلی ص ۲۷۱
(۷) حیات شبلی ص ۲۰۶

(۸) حیات شبلی ص ۲۷۱۔۲۷۲
(۹) حیات شبلی ص ۲۷۲
(۱۰) حیات شبلی ص ۲۷۳
(۱۱) مجموعہ لکچرز و اسپیچز ص ۲۸۲
(۱۲) مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۱۷
(۱۳) آپ بیتی، میر ولایت حسین ص ۱۱۶
(۱۴) ایضاً ص ۱۲۵
(۱۵) مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۵
(۱۶) مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۴۱
(۱۷) حیات شبلی ص ۳۴۹
(۱۸) دستاویزات محسن الملک ص ۳۴۷
(۱۹) دستاویزات محسن الملک ص ۳۴۸۔۳۴۹
(۲۰) ایضاً ص ۳۵۰
(۲۱) دستاویزات محسن الملک ص ۳۴۹
(۲۲) حیات شبلی ص ۳۶۶
(۲۳) مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۴۶
(۲۴) ص ۱۵۹
(۲۵) ایضاً
(۲۶) ایضاً
(۲۷) مکتوبات شبلی ص ۶۰
(۲۸) مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۱۴۰۔۱۴۲
(۲۹) مجموعہ لکچرز و اسپیچز حصہ اول ص ۴۴۵-۴۴۶
(۳۰) باقیات شبلی ص ۹۵-۹۶

(۳۱) مجموعہ لکچرز واسپیچز حصہ اول ص۴۸۳
(۳۲) ایضاً ص۵۰۰
(۳۳) مکاتیب شبلی ج۲ص۱۲
(۳۴) مکتوبات شبلی ص۳۴
(۳۵) حیات شبلی ص۱۹۶
(۳۶) مکاتیب شبلی ج اص۱۹۳
(۳۷) باقیات شبلی ص۱۹۱
(۳۸) حیات شبلی ص۲۷۶
(۳۹) مکتوبات شبلی ص۱۳۶
(۴۰) مکتوبات شبلی ص۱۲۲
(۴۱) مکتوبات شبلی ص۸۵
(۴۲) حیات شبلی ص۵۹۴
(۴۳) حیات شبلی ص۴۰۸۔۴۰۹
(۴۴) مکاتیب شبلی ج اص۴۶
(۴۵) مکاتیب شبلی ج اص۱۹۔۲۰
(۴۶) علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط ص۴۱
(۴۷) حیات شبلی ص۶۷۷
(۴۸) حیات شبلی ص۷۰۹
(۴۹) مکتوبات شبلی ص۳۹
(۵۰) یادایام ص۱۷
(۵۱) انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۴ر جولائی ۱۹۰۷ء ص۱
(۵۲) حیات شبلی ص۷۲۰
(۵۳) دستاویزات محسن الملک ص۱

(۵۴) حیات محسن ص۲۰۹

(۵۵) مجموعہ لکچرز واسپیچز حصہ اول ص۲۴۱

(۵۶) ایضاً ص۲۴۳

(۵۷) ایضاً ص۲۴۴

(۵۸) مقالات شبلی ج۸ ص۱۹۳

(۵۹) ایضاً ص۱۹۴

ooo

[۶]

علامہ اقبال: شبلی کی انجمن میں

۴ رجنوری ۱۹۰۳ء کو دہلی میں ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس منعقد ہوا، اس میں کئی ایسے اہم فیصلے ہوئے جن کے بڑے دور رس اثرات مرتب ہوئے۔ اسی اجلاس کا ایک انتہائی اہم فیصلہ انجمن ترقی اردو کے قیام کا فیصلہ تھا، چنانچہ اردو کی ترقی کے لئے اساطین اردو کی ایک مستقل کمیٹی تشکیل دی گئی اور اسے انجمن ترقی اردو کا نام دیا گیا۔ اس کے عہدیداران حسب ذیل تھے:

صدر	:	پروفیسر آرنلڈ، پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور۔
نائب صدر	:	شمس العلما ڈاکٹر مولوی نذیر احمد
//	:	شمس العلما مولوی ذکاء اللہ
//	:	شمس العلما مولانا خواجہ الطاف حسین حالؔی
سکریٹری	:	شمس العلما مولانا محمد شبلی نعمانی
اسسٹنٹ سکریٹری	:	مولوی حامد علی صدیقی سہارنپوری (۱)

علامہ شبلی جس وقت انجمن ترقی اردو کے سکریٹری نامزد ہوئے وہ ناظم سررشتہ علوم وفنون حیدرآباد کے عہدہ پر فائز تھے، تاہم اردو کی بقا و ترقی کے لئے انہوں نے بڑی دلچسپی لی اور انتہائی سرگرمی کے ساتھ کام شروع کیا اور متعدد علمی و عملی منصوبے بنائے اور سب سے پہلے انہوں نے اہل علم اور ارباب کمال کو انجمن سے وابستہ کرنا چاہا اور انہیں رکن بنایا۔

ڈپٹی نذیر احمد [۱۸۳۶-۱۹۱۰ء] نے انجمن ترقی اردو کا نائب صدر بنائے جانے پر علامہ شبلی کا شکریہ ادا کیا اور علمی تعاون کے ساتھ مالی تعاون بھی پیش کیا، انجمن ترقی اردو کی روداد وں میں علامہ شبلی نے اس کا اعتراف کیا ہے۔ (۲)

علامہ شبلی کا ایک اہم منصوبہ یہ بھی تھا کہ اردو کے ذخیرہ میں نئی اور معلومات افزا کتابوں کا اضافہ کیا جائے، اس کے لئے ضرور ہے کہ دیگر زبانوں کی مشہور اور مفید کتابوں کا اردو میں ترجمہ کیا جائے ۔ چنانچہ تمام اہل ذوق اراکین نے علامہ شبلی کی سربراہی میں ایک اجلاس میں عربی و انگریزی کی چودہ کتابوں کو منتخب کر کے اس کے ترجمے کی قرارداد منظور کی ۔ ان کتابوں کے انتخاب میں ڈپٹی نذیر احمد [۱۸۳۶-۲۹۱۲ء] اور خواجہ الطاف حسین حالی [۱۸۳۷-۱۹۱۴ء] کے ساتھ علامہ اقبال [۱۸۷۷-۱۹۳۸ء] کی رائے بھی شامل تھی ۔ (۳)

کتابوں کے انتخاب کے بعد ترجمہ کرنے کے لئے اخبارات میں اشتہارات شائع کرائے گئے، جس کے بڑے مثبت نتائج برآمد ہوئے اور ترجمہ کے لئے بے شمار درخواستیں آئیں ۔ ان تراجم کی اشاعت سے پہلے اس کے معیاری یا غیر معیاری ہونے کی جانچ کے لئے بھی علامہ شبلی نے چند اہل علم اور ارباب کمال کا انتخاب کیا ۔ ان ارباب کمال میں ایک اہم نام علامہ اقبال کا بھی ہے ۔ (۴)

چنانچہ علامہ اقبال کے پاس جانچنے کے لئے متعدد ترجمے بھیجے گئے ۔ چوں کہ انجمن ترقی اردو کے اس دور پر کوئی تحقیقی مقالہ اب تک نہیں لکھا گیا اس لئے اس کی تفصیل کہیں یکجا دستیاب نہیں ہے ۔ البتہ مختلف کتب و مضامین میں ان کا ضمناً ذکر آیا ہے ۔ مثلاً مرزا محمد سجاد بیگ کی کتاب ''الفہرست'' کے دیباچہ میں کسی قدر اس کی تفصیل ملتی ہے ۔ اسی طرح اسپنسر کی مشہور کتاب ''ایجوکیشن'' کا ترجمہ خواجہ غلام الحسنین [۱۸۶۸-۱۹۳۸ء] نے کیا ہے، جسے ۱۹۳۹ء میں انجمن ترقی اردو نے شائع کیا ۔ اس کے دیباچہ میں خواجہ صاحب نے صراحت کی ہے کہ انجمن کے اراکین نے متفقہ طور پر اسے لائق طباعت قرار دیا ۔ ان اراکین میں انہوں نے علامہ اقبال کی شمولیت کا بھی ذکر کیا ہے ۔ (۵) علامہ شبلی نے انجمن کی رپورٹ میں لکھا ہے کہ:

> ''ایجوکیشن ہربرٹ اسپنسر: اس کتاب کے سات ترجمے آئے اور ان میں متعدد ترجمے فی نفسہ اچھے تھے، لیکن مولوی غلام الحسنین صاحب انسپکٹر مدارس صوبہ گلبرگہ حیدرآباد دکن کا ترجمہ سب سے زیادہ صحیح صاف اور شستہ تھا، چوں کہ یہ کتاب نہایت اعلی درجہ کی کتاب ہے، ترجموں کے نمونے جناب آرنلڈ صاحب جناب شمس

العلما مولوی ذکاء اللہ صاحب، مولوی اقبال صاحب ایم.اے. پروفیسر گورنمنٹ کالج لاہور کے پاس بھیج دیئے گئے، بزرگان موصوف نے دقت نظر سے تمام ترجموں کو دیکھا اور مولوی غلام الحسنین کے ترجمہ کو انتخاب کیا۔''(۶)

یہ اس وقت کی بات ہے جب علامہ اقبال ''مولوی اقبال صاحب'' تھے۔ علامہ اقبال نہیں ہوئے تھے۔

مولوی سید ولی الحق جو سنڈا ضلع پٹنہ کے رہنے والے تھے، انہوں نے بھی کسی کتاب کے ترجمہ کا نمونہ بھیجا تھا تا کہ منظوری کے بعد وہ پوری کتاب کا ترجمہ کر سکیں اور وہ انجمن کی طرف سے شائع ہو۔ ان کا ترجمہ علامہ اقبال کے پاس ان کی رائے کے لئے بھیجا گیا تھا، اس پر علامہ اقبال نے مفصل رائے لکھی تھی جو مترجم کی درخواست پر ان کے پاس ملاحظہ کے لئے بھیجی گئی تھی۔(۷)

علامہ اقبال نے مولوی سید ولی الحق کے ترجمہ پر جو رائے دی تھی وہ غالباً انہیں ناگوار گذری۔ علامہ شبلی نے ایک خط میں اس کا ذکر کیا ہے اور مولوی سید ولی الحق کو لکھا ہے کہ:

''افسوس ہے کہ آپ نے مناظرہ کی روش اختیار کر لی۔ آپ کو صرف سادہ سا جواب لکھنا کافی تھا۔ پروفیسر اقبال کو کوئی مخاصمت مقصود نہ تھی، وہ بہت نیک نفس آدمی ہیں، انہوں نے پوچھا تھا کہ آپ نے فن اخلاق کی اسٹڈی کی ہے یا نہیں، اس قسم کے استفسار، قرن اول میں معمول تھا۔ آپ نے اس کے جواب میں سکوت اختیار کیا۔''(۸)

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ علامہ شبلی نے اقبال کو اس وقت نیک نفس قرار دیا تھا جب اقبال شناسی کا آغاز بھی نہیں ہوا تھا۔ اقبال کے دوست اور علوم اسلامیہ کی جوئے شیر کے فرہاد سید سلیمان ندوی نے بھی لکھا ہے کہ ''مولانا شبلی مرحوم نے اقبال کو اسی وقت پہچان لیا تھا جب ہنوز ان کی شاعری کے مرغ شہرت نے پر و بال نہیں پیدا کئے تھے۔''(۹)

علامہ شبلی انتہائی جوش وخروش کے ساتھ انجمن کے کاموں میں مصروف تھے اور ماہ بہ ماہ اس کی رپورٹ نواب محسن الملک کو علی گڑھ بھیجتے تھے جسے وہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ میں شائع کر دیتے تھے، ایک رپورٹ میں ان اراکین کا شکریہ ادا کیا ہے جنہوں نے مترجمہ کتب کی تصحیح و

تنقیح میں تعاون کیا، اس میں علامہ اقبال کا بھی نام شامل ہے۔ علامہ شبلی لکھتے ہیں:

''آخر میں مجھے جناب آرنلڈ صاحب پریسیڈنٹ اور مولانا نذیر احمد و مولوی ذکاء اللہ صاحب وائس پریسیڈنٹ، مولوی محمد اقبال صاحب اور مولوی محمد ابوالحسن صاحب اراکین کا شکریہ ادا کرنا چاہئے کہ ان بزرگوں نے ترجموں کی تنقید اور تصفیہ میں بہت مدد دی اور کتابوں کے جانچنے میں اپنا بہت سا قیمتی وقت صرف کیا۔''(۱۰)

علامہ شبلی تین برس [۱۹۰۳ - ۱۹۰۵ء] انجمن ترقی اردو کے سکریٹری رہے، غالباً دسمبر ۱۹۰۵ء میں انہوں نے اپنے عہدہ سے استعفیٰ دیا اور مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی [۱۸۶۶ - ۱۹۵۰ء] اس کے سکریٹری منتخب ہوئے، بعد ازاں مولوی عزیز مرزا [۱۸۶۵-۱۹۱۲ء] نے یہ عہدہ سنبھالا۔ اس کے بعد انجمن کی باگ ڈور بابائے اردو مولوی عبدالحق [۱۸۷۰-۱۹۶۱ء] کے ہاتھ میں آئی۔ جو پھر مدۃ العمر اس سے وابستہ رہے، چونکہ وہ علامہ شبلی کے ناقد ہی نہیں مخالف بھی تھے۔ لہٰذا علامہ شبلی کی تین سالہ جدوجہد کی داستان پردہ خفا میں چلی گئی۔

علامہ شبلی کے بعد علامہ اقبال کی انجمن ترقی اردو میں کیا سرگرمیاں رہیں اس کی کوئی تفصیل دستیاب نہیں، بلکہ ۱۹۰۶ء سے ۱۹۱۶ء تک کی انجمن کی رودادیں دستیاب نہیں ہیں، غالباً مولوی حبیب الرحمٰن خاں شروانی سے بابائے اردو کے ابتدائی دور تک رودادوں کا اہتمام نہیں ہوا۔ البتہ ۱۹۱۷ء میں انتخاب و ترجمہ کتب کے لئے موضوع کے لحاظ سے جن ارکان کا انتخاب ہوا، اس فہرست میں علامہ اقبال کا نام درج ہے اور ان کا موضوع فلسفہ لکھا ہوا ہے۔(۱۱)

۱۹۲۴ء میں انجمن ترقی اردو کی باقاعدہ مجلس نظما قائم کی گئی جو اس کی دیکھ ریکھ کرے۔ اس موقع پر علمی کاموں میں مشاورت کے لئے بھی متعدد اصحاب علم کا انتخاب عمل میں آیا تھا۔ اس فہرست میں سرفہرست علامہ اقبال ہیں۔ اسی فہرست میں ان کے دوست مولانا سید سلیمان ندوی کا نام بھی پہلی بار شامل ہوا ہے۔(۱۲) اسی طرح ۱۹۲۶ء میں نواب عمادالملک سید حسین بلگرامی کی وفات کے بعد سر راس مسعود انجمن کے صدر منتخب ہوئے تو ان کی کمیٹی کے ایک رکن علامہ اقبال بھی تھے۔(۱۳) اس کے بعد کی رودادیں دستیاب نہیں ہوئیں، اس لئے یہ نہ معلوم ہو سکا کہ علامہ اقبال کب تک انجمن کے رکن رہے، اور کس قدر دلچسپی لی، تاہم ان کے نام کی شمولیت بھی کچھ کم

اہمیت نہیں رکھتی۔ بہر حال شبلی کی انجمن ترقی اردو سے علامہ اقبال کا بھی علمی تعلق تھا۔ یہ تعلق خاص طور پر قابل ذکر اس لئے ہے کہ یہ ان کے عہد شباب کا قصہ ہے اور جسے ان کے سوانح نگاروں نے نظر انداز بھی کیا ہے۔

حوالے :

(۱) انجمن ترقی اردو ہند کی کہانی ص ۶، مولوی غلام ربانی، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، ۱۹۳۹ء

(۲) باقیات شبلی ص ۱۰۸، مشتاق حسین، آزاد کتاب گھر دہلی۔

(۳) ایضاً ص ۱۰۵

(۴) ایضاً ص ۸۷

(۵) فلسفہ تعلیم ص ۳-۴، خواجہ غلام الحسنین، انجمن ترقی اردو دہلی ۱۹۳۹ء

(۶) باقیات شبلی ص ۹۶

(۷) ایضاً ص ۸۲-۸۳

(۸) مکتوبات شبلی ص ۸۳، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء

(۹) یادِ رفتگاں ص ۱۸۳

(۱۰) باقیات شبلی، ص ۱۰۱

(۱۱) انجمن ترقی اردو ہند تاریخ اور خدمات ص ۲۸، ڈاکٹر محمد یونس غازی، دہلی، ۲۰۰۹ء

(۱۲) ایضاً ص ۳۱

(۱۳) ایضاً ص ۳۲

○○○

[۷]

علامہ شبلی اور عطیہ فیضی: چند حقائق

نصر اللہ خاں کے خاکہ ''عطیہ فیضی'' کے حوالہ سے

نصر اللہ خاں [۱۹۲۰-۲۰۰۲ء] اردو کے ممتاز اہل قلم اور ادیب تھے۔ ان کی زندگی اگر چہ مختلف مشاغل صحافت، تدریس اور ریڈیو کے شعبہ میں گذری، گویا قلم ہمیشہ ان کے ہاتھ میں رہا۔ ان کو نثر نگاری کا خاص سلیقہ تھا۔ سلاست، روانی، شگفتگی اور برجستگی ان کی نثر کی خاص خوبیاں ہیں۔ ان کی دو کتابیں ''بات سے بات'' اور ''کیا قافلہ جاتا ہے'' شائع ہوئیں۔ ثانی الذکر کا پہلا ایڈیشن ۱۹۸۴ء میں مکتبہ تہذیب وفن کراچی سے شائع ہوا تھا۔ دوسرا ایڈیشن جناب راشد اشرف نے ۲۰۱۷ء میں بزم ادب کراچی سے شائع کیا۔ یہ نصر اللہ خاں کے ۵۲/خاکوں کا مجموعہ ہے۔ اس میں علم وادب، شعر وشاعری، صحافت اور فنون لطیفہ کی بعض بڑی اہم شخصیات کے خاکے شامل ہیں۔

نصر اللہ خاں کو خاکہ نگاری میں مہارت حاصل تھی۔ انہوں نے جن اشخاص کے خاکے لکھے ہیں، ان کا مطالعہ ومشاہدہ گہرائی سے کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صاحب خاکہ کی زندگی کا عکس ان کے قلم سے کاغذ پر اتر گیا ہے۔ انہوں نے اصل شخصیت کے خدوخال ہی نمایاں نہیں کئے ہیں بلکہ صاحب خاکہ کے ان اوصاف کو بھی بیان کیا ہے جن پر عام طور پر نظر نہیں پڑتی۔ شخصیات کے واقعات ولطائف بیان کرنے میں بھی انہیں ملکہ حاصل ہے، بلکہ وہ اپنے دلفریب انداز نگارش سے صاحب خاکہ کی ایک ایک ادا دکھا دیتے ہیں۔ ان خوبیوں کے باوجود کہیں کہیں ان کا قلم لغزش کھا جاتا ہے۔ کہیں ان کا حافظہ ساتھ نہیں دیتا اور وہ لکھنے کی رو میں کہیں سے کہیں بہک جاتے ہیں۔ اس طرح کی لغزشیں ان کے قلم سے عطیہ فیضی [۱۸۷۷-۱۹۶۷ء] کے خاکہ میں زیادہ ہوئی ہیں۔ خاص طور پر علامہ شبلی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کے ذکر میں بے حد مبالغہ سے کام لیا ہے۔

شبلی وعطیہ کے حوالہ سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔متعدد مضامین و مقالات کے علاوہ مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں۔خود عطیہ فیضی نے علامہ شبلی پر یکے بعد دیگرے تین مضامین لکھے۔ نصراللہ خاں کا خاکہ ''عطیہ فیضی'' اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، چونکہ اس میں بیشتر واقعات و خیالات عطیہ فیضی کی زبانی پیش کئے گئے ہیں،اس لئے اس کی حیثیت بھی عطیہ کے خیالات کی ہوگئی ہے۔ یہاں نصراللہ خاں کے خاکہ کے اندراجات اور عطیہ فیضی کے بیانات کا تاریخی تناظر میں ایک مطالعہ پیش کیا جاتا ہے۔

نصراللہ خاں لکھتے ہیں:

> ''میں نے عطیہ بیگم کو اس عمر میں دیکھا تھا جب ان کی جوانی ڈھل رہی تھی۔ بوٹا سا قد، بڑی بڑی روشن آنکھیں،ان کی آنکھوں میں بلا کی چمک اور ذہانت تھی۔ ہاں رنگ روپ وقت کے ساتھ بدلتا گیا۔کچھ مٹیالا ہوکر کچھ سانولا ہوگیا تھا۔ناک ستواں تھی۔ساڑی پارسنوں کی طرح باندھتی تھیں۔پاؤں میں گرگابی، ناپ تول کر قدم رکھتیں۔آواز بڑی رعب دار، ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے۔گلے میں سیاہ دانوں کی مالا،کبھی کنٹھا،بغل میں چھتری،آگے آگے عطیہ اور پیچھے پیچھے ان کے شوہر فیضی رحمین۔''(۱)

نصراللہ خاں ۱۹۲۰ء میں پیدا ہوئے اور عطیہ فیضی ۱۸۷۷ء میں،اس لحاظ سے وہ عمر میں عطیہ فیضی سے ۴۳؍سال چھوٹے تھے۔انہوں نے ۱۹۴۷ء میں ایم اے پاس کیا اور ایک سال بعد ۱۹۴۸ء میں ریڈیو کراچی سے وابستہ ہوئے۔عطیہ فیضی اسی سال محمد علی جناح [۱۸۷۶-۱۹۴۸ء] کی دعوت پر کراچی گئیں۔اس وقت ان کی عمر ۷۱؍سال ہو چکی تھی،یعنی ان کی عمر طبعی بھی گذر چکی تھی، نہ کی جوانی ڈھلی تھی جیسا کہ نصراللہ خاں نے بیان کیا ہے۔اس کے بعد نصراللہ خاں نے عطیہ کے عاشقوں کا ذکر کیا ہے۔ان میں سرفہرست علامہ شبلی بعد ازاں علامہ اقبال [۱۸۷۷-۱۹۳۸ء] کا نام لکھا ہے مگر پھر پورے خاکہ میں علامہ اقبال کا کہیں ذکر نہیں آیا، ہر جگہ شبلی ہی شبلی ہیں۔ حالانکہ عطیہ فیضی کے اقبال سے بڑے گہرے مراسم تھے جو یورپ میں قائم ہوئے اور اخیر تک قائم رہے۔دونوں ایک دوسرے کے لئے کشش بھی رکھتے تھے۔اقبال کی دلی کیفیت کا اندازہ ان کے

اس شعر سے جوانہوں نے عطیہ فیضی کی ڈائری پر لکھا تھا لگایا جا سکتا ہے:

عالم جوش جنوں میں ہے روا کیا کیا کچھ!
کہئے کیا حکم ہے دیوانہ بنوں یا نہ بنوں (۲)

عطیہ فیضی نے ۱۹۴۷ء میں اپنے نام کے علامہ اقبال کے خطوط شائع کئے۔ ۱۹۵۱ء میں یوم اقبال منعقد کیا اور زندگی بھر علی الاعلان اقبال سے تعلق کا اظہار کرتی رہیں مگر نصراللہ خاں نے پورے خاکہ میں ان کا دوبارہ نام تک نہیں لیا ہے۔ راقم اس کا سبب تلاش کرنے میں ناکام رہا۔

شبلی وعطیہ کے روابط کے بارے میں نصراللہ خاں لکھتے ہیں:

> ''جہاں تک مولوی شبلی اور عطیہ کے معاشقے کا تعلق ہے تو عطیہ نے ایک انٹرویو میں مجھے بتایا کہ ان کے والد کابل میں برطانوی حکومت کے ہائی کمشنر تھے اور ان کی مولوی شبلی سے دوستی تھی، عطیہ مولوی صاحب کو چچا کہتی تھیں، لیکن مولوی صاحب چچا کی حد سے آگے بڑھے تو بقول عطیہ اس نے انہیں ڈانٹ دیا، لیکن یہ محض پردہ داری ہے۔ مولوی شبلی کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ معاملہ دوطرفہ تھا اور دونوں طرف آگ برابر لگی ہوئی تھی، لیکن یہ بات آگے نہیں بڑھی اور یہ شاید افلاطونی محبت تک رہی۔'' (۳)

۱۸۹۲ء میں علامہ شبلی نے قسطنطنیہ کا سفر کیا، وہاں عطیہ فیضی کے والد حسن علی آفندی سے ان کی ملاقات ہوئی۔ انہوں نے اپنے خانگی خطوط میں بقول عطیہ فیضی علامہ شبلی کا ذکر کیا اس طرح شبلی سے وہ واقف ہوئیں۔ ۱۵/سال بعد ۱۷/مئی ۱۹۰۷ء کو علامہ شبلی کے حادثہ پا کا واقعہ پیش آیا۔ اخیر دسمبر ۱۹۰۷ء میں ڈاکٹر رجب علی کی خواہش پر علامہ شبلی اپنا پاؤں بنوانے بمبئی گئے تو غالباً جنوری ۱۹۰۸ء میں زہرا فیضی [۱۸۶۶-۱۹۴۰ء] اور عطیہ فیضی سے ان کی ملاقات ہوئی۔ بعد از اں نومبر ۱۹۰۸ء میں عطیہ فیضی لکھنؤ آئیں اور غالباً مشیر حسین قدوائی کے یہاں قیام کیا۔ یہاں بھی بقول عطیہ شبلی سے ملاقات ہوئی۔ پھر خط وکتابت اور ربط وضبط کا سلسلہ قائم ہوا جو علامہ شبلی کی وفات تک قائم رہا۔ علامہ شبلی کی وفات کے ۱۱/سال بعد محمد امین زبیری [۱۸۷۰-۱۹۵۸ء] نے علامہ شبلی کے وہ خطوط جو زہرا و عطیہ فیضی کے نام تھے حاصل کئے اور ۱۹۲۵ء میں ''خطوط شبلی'' کے

نام سے شائع کیا۔ اس پر بابائے اردو مولوی عبدالحق [۱۸۷۰ - ۱۹۶۱ء] سے مقدمہ لکھوایا اور انہوں نے دونوں کے درمیان خلوص کی بومحسوس کی۔ چنانچہ اسی مقدمہ سے لوگوں کو شبلی وعطیہ کے دیرینہ تعلق کا علم ہوا۔ ۱۹۳۵ء میں امین زبیری نے خطوط شبلی کو دوبارہ شائع کیا۔ پھر انہوں نے پے در پے اس حوالہ سے کئی مضامین اور کتابیں لکھیں۔ ذکر شبلی اور شبلی کی رنگین زندگی جن کے ایک سے زائد اضافہ شدہ ایڈیشن شائع کیئے گئے۔ اسی سلسلہ کی کتابیں ہیں۔ بعدازاں ۱۹۵۰ء میں ڈاکٹر وحید قریشی [۱۹۲۵ - ۲۰۰۹ء] نے ''شبلی کی حیات معاشقہ'' سپرد قلم کی اور نفسیاتی تنقید کے نام پر خطوط شبلی کے بے سروپا معنی ومفہوم نکالے اور الفاروق کے مصنف کو ایک عاشق مزاج شخص ثابت کیا۔ شیخ محمد اکرام [۱۹۰۸-۱۹۷۳ء] نے شبلی نامہ میں وادی گل لکھ کر مزید رنگ آمیزی کی۔ چونکہ علامہ شبلی کے بارے میں عام رائے یہی ہے کہ وہ کانگریس کے حامی اور مسلم لیگ کے سخت مخالف تھے، اس لئے دوقومی نظریہ کے ایک مخالف کے لئے اس کی داستان معاشقہ بیان کرنے سے زیادہ لطف ولذت کی اور کیا چیز ہوسکتی تھی۔ چنانچہ پاکستان کے چند ایک سنجیدہ اہل قلم کے سوا بیشتر اہل قلم نے علامہ شبلی کو ایسا ہی سمجھا اور لکھا جیسا کہ مولوی عبدالحق، منشی امین زبیری اور ڈاکٹر وحید قریشی نے سمجھایا تھا۔ حتیٰ کہ ہمارے عہد کے ممتاز ادبی مورخ اور نقاد ڈاکٹر جمیل جالبی [۱۹۲۹-۲۰۱۹ء] جیسے نامور اہل قلم نے بھی تاریخ ادب اردو میں شبلی کے ذکر میں پہلے عطیہ کا ذکر کیا ہے، بعدازاں ان کی خدمات کو بیان کیا ہے۔ (۴) نصراللہ خاں نے بھی علامہ شبلی کے لئے عاشق اور معاشقہ جیسے الفاظ استعمال کر کے دراصل اس شرمناک روایت کو آگے بڑھایا ہے۔

نصراللہ خاں سے عطیہ فیضی کے خاکہ میں تجزیاتی غلطیاں تو ہوئی ہی ہیں، بعض تاریخی غلطیاں بھی سرزد ہوئی ہیں۔ ان کی یہ غلطیاں دو طرح کی ہیں۔ ایک وہ جو خود نصراللہ خاں کی بیان کردہ ہیں۔ دوسری وہ جو انہوں نے عطیہ فیضی کے حوالہ سے لکھی ہیں یا عطیہ فیضی کے الفاظ میں بیان کی ہیں۔ مثلاً انہوں نے لکھا ہے کہ ''عطیہ بمبئی میں پیدا ہوئیں۔'' (۵) حالانکہ عطیہ بیگم یکم اگست ۱۸۷۷ء کو قسطنطنیہ ترکی میں پیدا ہوئی تھیں۔ (۶) اسی طرح انہوں نے عطیہ فیضی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ ان کے والد حسن علی کابل میں ہائی کمشنر تھے۔ (۷) جبکہ صحیح یہ ہے کہ وہ قسطنطنیہ ترکی میں ایک تاجر تھے۔ مولانا ماہرالقادری نے انہیں ترکی میں برطانیہ کا سفیر لکھا ہے۔ (۸) جس کی

کسی اور حوالہ سے تصدیق نہیں ہوتی۔ دراصل خود عطیہ فیضی نے اس سلسلہ میں مبالغہ سے کام لیا ہے۔ تاہم واقعہ یہ ہے کہ علامہ شبلی ۱۸۹۲ء میں جب قسطنطنیہ پہنچے تو عطیہ کے والد حسن علی آفندی [۱۸۳۸-۱۹۰۳ء] سے ان کی قسطنطنیہ ہی میں ملاقات ہوئی۔ انہوں نے علامہ کی بڑی خاطر تواضع کی اور ساتھ ساتھ رہے۔ علامہ شبلی نے انہیں تاجر بتایا ہے اور سفرنامہ روم ومصر وشام میں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''حسن آفندی بدرالدین طیب جی بیرسٹرایٹ لا ساکن بمبئی کے عم زاد بھائی ہیں۔ ہندوستانی اشیا کی تجارت کرتے ہیں۔ پہلے ان کا کارخانہ بڑے فروغ پر تھا چنانچہ اور مصارف کے علاوہ آٹھ سو ماہوار صرف دکان کا کرایہ تھا لیکن اب فیشن بدل جانے سے ان چیزوں کی قدر نہیں رہی اور کارخانہ سست ہو گیا، تاہم خوشحالی سے بسر کرتے ہیں۔ مکان اور فرنیچر قسطنطنیہ کے لحاظ سے امیرانہ ہے، ایک باغ بھی تیار کرایا ہے۔ تمام لوگ ان کی عزت کرتے ہیں۔ سلطان کے یہاں سے مڈل بھی ملا ہے۔ انگریزی بھی بخوبی جانتے ہیں۔ نہایت خوش اخلاق، فیاض، روشن ضمیر، نیک طبع آدمی ہیں۔ ہندوستانیوں سے ان کو عجیب انس ومحبت ہے اور یہ حب الوطنی ہی میرے اور ان کے تعارف کا ذریعہ ہوئی۔''(۹)

پھر اپنی دلچسپ ملاقات کا ذکر اس طرح کیا ہے:

''ایک دفعہ میں بازار میں پھر رہا تھا۔ آفندی موصوف سامنے سے گذرے مجھ کو دیکھ کر بے اختیار بڑھ کر پوچھا'' آپ ہندوستانی تو نہیں'' اس وقت میرا لباس عربی تھا، طرہ یہ کہ جواب میں اتفاقاً زبان سے بجائے ہاں کے نعم کا لفظ نکلا، تاہم میرا ہندی ہونا کیونکر چھپ سکتا تھا۔ وہ گلے سے لپٹ گئے اور بولے کہ '' آپ تو ہماری چیز ہیں ہم سے بچ کر کہاں چلے تھے۔'' میں جب تک وہاں رہا اکثر میرے مکان پر تشریف لاتے تھے۔ کئی دفعہ دعوت کی اور اپنے گھر لے گئے۔ معلوم نہیں مہمان نوازی ان کی طینت کا خمیر ہے یا قسطنطنیہ کی آب وہوا کا خاصہ ہے۔ ان کا پتہ یہ ہے: مجوہر بدستاندہ حاجی حسن علی آفندی ہندی۔ میں نے پتہ اس غرض سے لکھا ہے کہ کوئی

صاحب قسطنطنیہ کا قصد کریں تو ان سے ضرور ملیں۔ ان سے بڑھ کر کوئی غم خوار نہیں ملتا۔"(۱۰)

جیسا کہ اوپر کے اقتباس میں مذکور ہے کہ ترکی میں حسن علی آفندی سے علامہ شبلی کی بار ہا ملاقاتیں رہیں اور انہیں وہ اپنے گھر بھی بلاتے رہے، مگر عطیہ نے قسطنطنیہ کے علاوہ دیگر ممالک میں بھی ان کے علامہ شبلی کے ساتھ سفر کرنے، رہنمائی کرنے حتیٰ کہ ان ممالک کے اہل علم اور علماو فضلا سے متعارف کرانے کا ذکر کیا ہے۔ عطیہ فیضی کی عمر اس وقت پندرہ سال تھی اور وہ اس وقت وہاں موجود بھی نہیں تھیں۔ خدا جانے ان کا یہ بیان کس حد تک درست ہے۔؟ (۱۱) علامہ شبلی نے قسطنطنیہ کے علاوہ کسی اور ملک میں ان کے ساتھ رہنے اور رہنمائی کرنے کی صراحت نہیں کی ہے۔

سفر نامہ روم ومصر وشام میں حسن علی نام کے کئی اشخاص کا ذکر ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سفر نامہ روم ومصر وشام کا اشاریہ نگار حسن علی آفندی اور حسین حبیب آفندی میں فرق نہ کر سکا اور دونوں کا اشاریہ ایک ہی نام سے بنایا ہے۔ حالانکہ دونوں دو شخص تھے اور نام بھی غلط درج کیا ہے۔ حسین حبیب کو حسین حسیب آفندی لکھا ہے۔ (۱۲) حسین حبیب آفندی علامہ شبلی کے شناسا اور ہندوستان میں ترکی کے سفیر رہ چکے تھے۔ بعد میں قسطنطنیہ میں پولس کمشنر ہوئے۔ ۱۸۷۷ء میں روس نے جب ترکی پر حملہ کیا تھا اس زمانہ میں علامہ شبلی ۲۰ رسالہ نوجوان اور ترکوں پر فدا تھے، چنانچہ انہوں نے ترکوں کے تعاون کے لئے اعظم گڑھ میں ایک انجمن بنائی۔ خود اس کے سکریٹری ہوئے اور اس زمانہ میں تین ہزار کی رقم جمع کر کے حسین حبیب آفندی ترکی سفیر مقیم بمبئی کے ذریعہ ترکی بھیجی تھی۔ علامہ شبلی کے سفر ترکی کے زمانہ میں وہ وہاں کے پولس کمشنر تھے۔ علامہ شبلی کی ان سے بے تکلفانہ ملاقاتیں رہیں جس کا ذکر انہوں نے اپنے سفر نامہ میں کئی جگہ کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حسین حبیب اور حسن علی دو شخص ہیں اور ان دونوں کا کابل سے کسی طرح کے تعلق کا ذکر نہیں ملتا۔ بہر حال عطیہ فیضی کے والد حسن علی آفندی کا کابل میں ہائی کمشنر ہونا ثابت نہیں۔ ظاہر ہے یہ نصر اللہ خاں کا سہو ہے، عطیہ فیضی کا نہیں۔

نصر اللہ خاں نے ایک اور بہت دلچسپ بات لکھی ہے کہ عطیہ شبلی کو چچا کہتی تھیں۔ یہ بات ان کے سوا کسی اور نے آج تک نہیں لکھی، لیکن واقعہ یہ ہے کہ تعلق تو ان کا چچا کا ہی تھا، اس لئے کہ

علامہ شبلی ان کے والد کے دوست تھے اور عمر میں ان سے ۱۹؍سال چھوٹے تھے۔ دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ عطیہ فیضی کے جو خطوط علامہ شبلی کے نام دستیاب ہیں ان میں وہ چچا کے بجائے محترم اور مولانا کے القاب سے یاد کرتی ہیں۔ (۱۳) حد سے بڑھنا اور ڈانٹنا سب نصر اللہ خاں کے دماغ کی اختراع ہے۔ مخالف سے مخالف شخص نے بھی اس طرح کی بیہودہ باتیں نہیں لکھی ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ جن لوگوں نے علامہ شبلی کے عطیہ فیضی سے معاشقے کی بات اڑائی تھی انہیں لوگوں نے شبلی کے ان سے عشق کی داستان بھی ان کو یعنی عطیہ فیضی کو سنائی۔ (۱۴) اس طرح عطیہ فیضی کو خود اپنے معاشقے کی ۳۰؍سال تک خبر ہی نہیں رہی۔ طرفہ تماشہ نصر اللہ خاں کہتے ہیں کہ خطوط شبلی سے اندازہ ہوتا ہے کہ آگ دونوں طرف برابر لگی ہوئی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر آگ دونوں طرف لگی ہوئی تھی تو عطیہ فیضی اس آگ میں کیوں نہیں جلیں؟۔ دراصل اس طرح نصر اللہ خاں بابائے اردو مولوی عبدالحق، محمد امین زبیری اور وحید قریشی کے خیالات کی بغیر نام لئے تصدیق و تشہیر کرتے ہیں۔ خطوط شبلی آج بھی سب کے سامنے ہیں۔ ان میں بقول عطیہ فیضی اس طرح کی کوئی بات نہیں ہے۔ (۱۵) دراصل ان خطوط میں بلند آہنگی کے ساتھ ادب وانشا کی جو لالہ کاری دکھائی دیتی ہے، وہ علامہ شبلی کے اسلوب نگارش کا امتیاز اور خاصہ ہے۔ علامہ شبلی کا تقریباً وہی رنگ و آہنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی، مہدی افادی اور مولانا آزاد حتیٰ کی خواجہ حسن نظامی جیسے صوفی منش بزرگ کے نام کے خطوط میں بھی نظر آتا ہے۔ اب اس کو کیا نام دیا جائے۔؟

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے کہ ۱۹۲۵ء تک علامہ شبلی اور عطیہ کے معاشقے کا کسی کو علم نہیں تھا۔ ۲۳-۱۹۲۲ء میں منشی امین زبیری نے عطیہ فیضی سے علامہ شبلی کے خطوط حاصل کئے اور انہیں مولوی عبدالحق کے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ اسی مقدمہ سے لوگوں کو شبلی وعطیہ کے معاشقے کا پہلی بار علم ہوا۔ مولوی عبدالحق علامہ شبلی کی جا و بے جا تنقید نہیں تنقیص کرتے رہتے تھے۔ اس کا آغاز گلشن ہند کے مقدمہ میں علامہ شبلی پر سخت تنقید سے ہوا۔ پھر حافظ محمود شیرانی سے تنقید شعر العجم لکھوائی اور اسے ۵-۶ برس تک مسلسل اپنے رسالہ اردو میں شائع کرتے رہے۔ ایسے ماحول میں امین زبیری نے خطوط شبلی گویا انہیں خوان سجا کر پیش کر دیا اور انہوں نے تنقید و تنقیص شبلی کی حدیں پار کر دیں اور ایسا طوفان کھڑا کیا کہ یہ اہل قلم کا ایک محبوب موضوع قرار پایا۔ ان حریفان شبلی کے

جواب میں ڈاکٹر ابن فرید [۱۹۲۵ - ۲۰۰۷ء] نے ایک طویل مقالہ ''شبلی چوں بہ خلوت می رود'' لکھا جو پہلے ادیب علی گڑھ کے شبلی نمبر میں بعد ازاں ان کی کتاب ''میں ہم اور ادب'' میں شائع ہوا۔ واقعہ یہ ہے کہ ڈاکٹر ابن فرید نے اپنے زورِ قلم اور زورِ تحقیق سے شبلی شکنی کی اس تحریک پر کاری ضرب لگائی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شیخ محمد اکرام نے اپنی کتاب کا نام بدل کر ''یادگارِ شبلی'' کر دیا۔ مولوی عبدالحق نے بھی اخیر عمر میں ادیب علی گڑھ کے شبلی نمبر میں معذرت خواہانہ انداز اختیار کیا۔ البتہ محمد امین زبیری سجدہ سہو کے لئے زندہ نہیں تھے۔ تاہم اب بھی ناواقف اور کم نظر اہل قلم کی طرف سے رہ رہ کر شبلی کے معاشقہ کی صدائیں بلند ہوجاتی ہیں۔

نصر اللہ خاں نے اس سلسلہ میں ایک اور گھناؤنی بات یہ لکھی ہے کہ:

> ''جس زمانہ میں میں ریڈیو پاکستان سے عطیہ کے انٹرویو کا انتظام کر رہا تھا تو مولوی عبدالحق صاحب نے یہ کہا تھا کہ تم عطیہ سے یہ بھی پوچھنا کہ مولوی شبلی صاحب کی ٹانگ میں گولی کیسے لگی۔؟ میں نے یہ سوال عطیہ سے انٹرویو میں تو نہیں پوچھا ایک نجی ملاقات میں پوچھا۔ عطیہ اس پر بگڑ گئیں اور کہنے لگیں ''تمہیں یہ بات مولوی عبدالحق نے بتائی ہوگی۔'' اور میں آج تک یہ سوچ رہا ہوں کہ آخر یہ کیا بات تھی۔'' (۱۶)

یہاں یہ واضح کرتا چلوں کہ ۷ ارمئی ۱۹۰۷ء کو شبلی منزل میں بھری ہوئی بندوق ایک جگہ سے دوسری جگہ رکھتے ہوئے شبلی کی بہو بیگم حامد حسن نعمانی سے دب گئی جس کی زد میں علامہ شبلی کا پاؤں آیا اور ان کی پنڈلی چور چور ہوگئی۔ اس حادثہ پر ملک میں کہرام مچ گیا۔ عیادت کے لئے اہل علم اور قدردانان شبلی نے اعظم گڑھ کی راہ لی۔ متعدد شاعروں نے قطعات ور باعیات لکھیں۔ بمبئی کے مشہور سرجن ڈاکٹر رجب علی نے نواب محسن الملک کے ذریعہ کہلوایا کہ وہ علاج کے لئے بمبئی آجائیں۔ غرض ہر شخص رنجیدہ اور فکر مند ہوا، مگر مولوی عبدالحق نے اس حادثہ پر بجائے دکھ کا اظہار کرنے کے شبلی کو ذلیل ورسوا کرنے کی کوشش کی۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ وہ علامہ شبلی کی مخالفت میں کس سطح پر آگئے تھے۔ نصر اللہ خاں نے بھی مولوی عبدالحق کے خاکے میں لکھا ہے کہ:

> ''ویسے میں یہ اچھی طرح جانتا ہوں کہ مولوی عبدالحق اور مولوی شبلی میں کافی

کٹا چھٹی تھی اور مولوی شبلی کے خلاف مولوی عبدالحق صاحب نے محمود شیرانی مرحوم سے کام لیا تھا لیکن اس کے باوجود شعر العجم کی اہمیت اور مولوی شبلی کے مرتبے میں کوئی فرق نہیں آیا۔'' (۱۷)

نصر اللہ خاں نے عطیہ فیضی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ شبلی نے عطیہ کو اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ وہ فرماں روائے بھوپال بیگم سلطان جہاں [۱۸۵۸-۱۹۳۰ء] کو راضی کریں کہ وہ علامہ شبلی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت لکھوائیں۔(۱۸) عطیہ فیضی نے اپنے مضمون میں بھی سیرت لکھوانے کے لئے بیگم صاحبہ کو خود متوجہ کرنے کی بات لکھی ہے۔(۱۹) ممکن ہے علامہ شبلی نے کسی موقع پر ان سے سیرت کا ذکر کیا ہو۔ اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا کیونکہ اس زمانہ میں ان کا عام موضوع سخن سیرت نبویؐ ہی تھا۔ وہ جہاں جاتے اور جس محفل میں ہوتے بس سیرت ہی کا ذکر کرتے جیسا کہ متعدد اہل قلم نے لکھا ہے۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ جانکنی کے عالم میں بھی وہ سیرت سیرت ہی پکارتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوئے۔ مگر تعجب ہے کہ خطوط شبلی میں اس کا ذکر کہیں نہیں آیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شبلی نے سیرۃ النبیؐ کے منصوبے کا باقاعدہ تحریری طور پر اعلان شائع کرایا تھا، جس سے متاثر ہوکر لوگوں نے تعاون کی غرض سے چندے بھیجے۔ بیگم سلطان جہاں نے جب تالیف سیرت کا تمام ذمہ اپنے سر لے لیا تو علامہ شبلی نے چندے کی رقم واپس کردی۔ اس کی تفصیل حیات شبلی میں موجود ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں خود بیگم سلطان جہاں نے اپنی خودنوشت ''اختر اقبال'' میں بہت واضح طور پر علامہ شبلی کے اعلان سے متاثر ہوکر رقم منظور کرنے کی بات لکھی ہے۔(۲۰) انہوں نے منشی امین زبیری یا عطیہ فیضی کے متوجہ کرنے کی صراحت نہیں کی ہے۔ عطیہ فیضی نے اپنے مضمون میں یہ بات بھی لکھی ہے کہ انہوں نے ہی بیگم سلطان جہاں سے علامہ شبلی کی ملاقات کرائی۔ (۲۱) لیکن یہ بات سرے سے درست نہیں، کیونکہ عطیہ فیضی کی ملاقات سے پہلے کم از کم دو مرتبہ علامہ شبلی بیگم سلطان جہاں سے مل چکے تھے۔ پہلی بار ۱۸۹۲ء میں سرسید کے ساتھ حیدرآباد سے واپس آتے ہوئے اور دوسری بار ۱۹۰۵ء میں ندوہ کے وفد کے ساتھ۔ اس دوسری ملاقات اور بیگم سلطان جہاں کی شخصیت اور ان کے علم وفضل کا تذکرہ بھی وہ ماہنامہ الندوہ میں کر چکے تھے۔ خود بیگم سلطان جہاں بھی علامہ شبلی کے فضل وکمال سے بہت متاثر

ہو چکی تھیں۔ چنانچہ ۱۹۰۵ء میں جب علامہ شبلی سررشتہ علوم وفنون حیدرآباد کی نظامت سے مستعفی ہوئے تو انہوں نے نواب محسن الملک کے توسط سے انہیں ریاست بھوپال سے وابستہ کرنا چاہا تھا (۲۲)، ان ملاقاتوں کے بعد پھر ملاقات اور متعارف کرانے کا قصہ دراصل عطیہ کی خود اپنی توقیر میں اضافہ کی ایک کوشش کے سوا کچھ نہیں۔

نصر اللہ خاں نے ایک اور بات لکھی ہے کہ ''سیرت پر غیر زبانوں میں جتنا کام ہو چکا تھا اس کے ترجمے عطیہ نے کرائے۔'' (۲۳) عطیہ فیضی نے بھی اپنے مضمون میں سیرت پر لکھی گئی انگریزی کتابوں کو شبلی کے سامنے لا کر ڈھیر کر دینے کا ذکر کیا ہے۔ (۲۴) ممکن ہے نصر اللہ خاں کو یہ بات بھی عطیہ فیضی ہی نے بتائی ہو، مگر اس بات کا ذکر اور کہیں نہیں ملتا اور نہ کسی اور حوالہ سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔ انگریزی مواد علامہ شبلی نے جن انگریزی دانوں سے ترجمہ کرایا تھا اور جن کتابوں سے کرایا تھا مکاتیب شبلی اور حیات شبلی میں ان کی تفصیل موجود ہے۔ اس میں عطیہ فیضی کا کہیں نام ونشان نہیں۔ حتیٰ کہ ''خطوط شبلی'' موسومہ عطیہ فیضی کے کسی خط میں بھی اس کی طرف اشارہ نہیں ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ نہ یہ عطیہ فیضی کا موضوع تھا اور نہ ان کے بس کی بات تھی کیونکہ ان کا موضوع موسیقی، مصوری اور فنون لطیفہ تھا۔ موسیقی پر ان کی کتاب قابل ذکر ہے اور یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ان علوم کے حاصل کرنے میں بھی علامہ شبلی نے ان کی مدد کی تھی۔ موسیقی اور اس کی کتابوں سے وہ بخوبی واقف تھے اور بعض کتابیں انہوں لکھنو سے نے خرید کر عطیہ فیضی کو بھیجی بھی تھیں، جیسا کہ خطوط شبلی میں مذکور ہے۔

نصر اللہ خاں نے عطیہ فیضی کا جو انٹرویو لیا تھا، اس میں ان کے سفر لکھنؤ کی تفصیل پوچھی تو انہوں نے بتایا کہ:

> ''جب میں لکھنؤ پہنچی تو دھواں دھار بارش ہو رہی تھی۔ میں نے دیکھا کہ مولوی شبلی صاحب چھتری لگائے ایک کونے میں کھڑے ہیں۔ ایک دس برس کا بچہ میرے کمپارٹمنٹ کے قریب اس وقت آیا جب میں گاڑی سے اتر چکی تھی۔ اس بچے نے مجھ سے پوچھا کیا آپ ہی عطیہ بیگم ہیں؟ میں نے کہا ہاں میں ہی عطیہ بیگم ہوں۔ بچے نے کہا میرے ساتھ چلئے، مولوی صاحب بھی آئے ہیں، چنانچہ میں نے

قلی کے سر پہ سامان رکھوایا اور پلیٹ فارم سے باہر نکلی، باہر ایک یکہ پہلے ہی سے کھڑا تھا، قلی نے اس میں سامان رکھا اور وہ بچہ آگے بیٹھ گیا اور یکہ چلا، دیکھتی کیا ہوں میرے پیچھے کے یکے میں مولوی صاحب سمٹے سمٹائے بیٹھے ہیں۔ مولوی صاحب کی اس حالت پر مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد یکہ مولوی صاحب کے گھر پہنچا اور میں گھر کے اندر داخل ہوئی۔ اتنے میں مولوی صاحب بھی آ گئے۔ مولوی صاحب کا گھر پرانے زمانے کا تھا۔ ڈیوڑھی سے گذرو تو سامنے صحن، پھر برآمدہ پھر دونوں طرف کمرے۔ مولوی صاحب کی اہلیہ اور بیٹی سے ملاقات ہوئی۔ چوڑی دار پاجامہ، ڈھیلا ڈھالا کرتا، سر پر دوپٹہ، دونوں ماں بیٹیوں کے کپڑے گھر میں رنگے ہوئے تھے۔ دونوں کے ہاتھوں میں دھانی چوڑیاں تھیں۔ ماں کے ہاتھوں اور پاؤں میں چھلے، ناک میں لونگ اور کانوں میں بندے تھے۔ بیٹی کی ناک میں نیم کا تنکا البتہ کانوں میں بالیاں تھیں۔ دونوں کے بال الٹے تھے۔ میں یہاں ایک ہفتے رہی اور دونوں ماں بیٹیوں میں گھل مل گئی۔ میں ان سے اتنی بے تکلف ہوگئی کہ میں نے ان کے ساتھ مل کر ڈھولک پر ساون کے گیت گائے۔"(۲۵)

عطیہ فیضی نے جب لکھنؤ آنے کی خواہش ظاہر کی تو علامہ شبلی نے دریافت کیا کہ آپ کہاں ٹھہرنا پسند کریں گی۔؟ علامہ شبلی ان کو اپنے دوست نواب سید علی حسن خاں کے گھر ٹھہرانا چاہتے تھے۔(۲۶) عطیہ کے لکھنؤ آنے کا ذکر انہوں نے مشیر حسین قدوائی رئیس گدیہ سے کیا جن کے خانوادہ فیضی سے گہرے روابط تھے۔ انہوں نے اپنے یہاں قیام کی پیش کش کی۔(۲۷) بہرحال عطیہ لکھنؤ آئیں۔ غالباً یہ نومبر ۱۹۰۸ء کی بات ہوگی۔ ماہ وسنہ تو صحیح ہے لیکن تاریخ قطعی طور پر معلوم نہ ہوسکی۔ البتہ یہ تو طے شدہ ہے کہ نومبر ۱۹۰۸ء سے پہلے وہ لکھنؤ نہیں آئیں۔ اب حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ان کے اس سفر سے دو سال پہلے علامہ شبلی کی اہلیہ کا دسمبر ۱۹۰۵ء میں انتقال ہو چکا تھا (۲۸)، جن کی تدفین میں مولانا ابوالکلام آزاد بھی اتفاقیہ اعظم گڑھ پہنچ کر شریک ہوئے تھے۔ اس کا ذکر انہوں نے اپنی خودنوشت آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی میں کیا ہے۔(۲۹) علاوہ ازیں علامہ شبلی کی بڑی بیٹی رابعہ خانم کا اس سے تین سال پہلے یعنی ۱۹۰۴ء میں انتقال ہو چکا تھا۔

(۳۰) صرف دوسری بیٹی فاطمہ خانم جو صاحب اولاد تھیں، زندہ تھیں۔ ان کی شادی بندول ہی میں ہوئی تھی اور وہ وہیں قیام کرتی تھیں۔ ان کے لکھنؤ آنے کا کہیں ذکر بھی نہیں ملتا۔ انہوں نے ۱۹۰۹ء میں وفات پائی۔ (۳۱) اب سوال یہ ہے کہ عطیہ فیضی کی علامہ شبلی کی اہلیہ سے ملاقات کیسے ہوئی اور انہوں نے ان کے لباس، طرز معاشرت کا کیسے ذکر کیا؟، یہاں تک کہ ان کے ساتھ ڈھولک پر ساون کے گیت کیسے گائے؟ جبکہ وہ دنیا ہی میں نہیں تھیں۔ یہ بے سر و پا قصہ دراصل عطیہ یا نصر اللہ خاں کے دماغ کی اپج ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی واسطہ نہیں۔

ایک بات اور سمجھ میں نہیں آتی کہ علامہ شبلی کی بیوی کی ناک میں لونگ اور بیٹی کی ناک میں نیم کا تنکا تھا۔ خطہ اعظم گڑھ میں چھوٹی بچیوں کی ناک میں نیم کا تنکا بچپن میں اس وقت ڈالا جاتا ہے، جب کیل پہننے کے لئے ناک میں تازہ تازہ سوراخ کیا جاتا ہے۔ مگر بڑی بچیوں کی ناک نیم کا تنکا نہیں کیل ہوتی ہے، جس زمانہ کی یہ باتیں ہیں علامہ شبلی کی صاحبزادی صاحب اولاد تھیں ان کی ناک میں نیم کا تنکا کہاں سے آ گیا؟۔ دراصل علامہ شبلی کے بیوی بچوں کو گنوار ثابت کرنے کی کہانی عطیہ فیضی نے اپنی برتری ثابت کرنے کے لئے گھڑی ہوگی۔ ایک حقیقت یہ بھی ہے کہ علامہ شبلی علمی حیثیت سے تو بلند رتبہ تھے ہی معاشرتی اعتبار سے بھی معمولی آدمی نہ تھے۔ حیدر آباد سے دوسو ماہوار وظیفہ کے سوا ان کی زمینداری کئی گاؤں پر مشتمل تھی اور ان کا رکھ رکھاؤ کبھی معمولی نہیں رہا۔ ان کے والد شیخ حبیب اللہ اعظم گڑھ کے نامور وکیل اور بڑے زمیندار اور متمول شخص تھے۔ برادران شبلی بھی بڑے عہدوں پر فائز اور بڑے نامور تھے۔ عطیہ فیضی کے یورپ جانے سے بیس سال پہلے علامہ شبلی کے منجھلے بھائی مہدی حسن یورپ سے بیرسٹری کی ڈگری حاصل کر چکے تھے۔ دوسرے بھائی محمد اسحاق الہ آباد ہائی کورٹ کے نامور وکیل تھے۔ خلف شبلی حامد حسن نعمانی اس وقت تحصیل دار اور بھتیجے محمد عثمان الہ آباد کے کوتوال تھے۔ بہرحال خانوادہ شبلی کسی درجہ کم رتبہ نہیں تھا کہ گنواروں کی زندگی بسر کرتا۔

نصر اللہ خاں کے قلم سے عطیہ کے سفر لکھنؤ کا حال اوپر گذر چکا ہے، اب خود عطیہ کے قلم سے ان کے سفر کی روداد ملاحظہ ہو:

''جب میں لکھنؤ پہنچی تو دیکھا کہ مولانا دور کھڑے ہیں، ایک بچے نے آ کر کہا

کہ وہ ہیں مولانا آپ ان کے پیچھے پیچھے جایئے، چنانچہ وہ ایک گاڑی میں سوار ہوگئے اور اس بچے نے مجھے دوسری بگھی میں سوار کرایا، ایک مکان میں پہنچے جس کا ماحول پرانی معاشرت کا نمونہ تھا، مولانا نے خوش آمدید کہا اور ایک دروازے کی طرف اشارہ کیا کہ آپ اندر جایئے، کمرے میں خاصا اندھیرا تھا اور کچھ بیویاں وہاں تشریف فرما تھیں، صاحب خانہ نے کہا کہ یہ میری بیٹیاں ہیں، ساجد، مسرت اور فاطمہ الرب، میں نے ایسے نام کبھی نہیں سنے تھے۔ یہ مکان مولانا کے کسی دوست کا تھا اور بیٹیاں اتنی شریف اور پردہ کی پابند تھیں کہ اپنے رشتہ داروں سے بھی پردہ کرتی تھیں۔'' (۳۲)

عطیہ فیضی کے اس بیان سے کم از کم یہ تو طے ہے کہ ان کا قیام علامہ شبلی کے گھر پر نہ تھا جیسا کہ نصر اللہ خاں نے اپنے خاکہ میں واضح طور پر لکھا ہے۔ لہٰذا یہ یقینی ہے کہ نصر اللہ خاں نے غلط بیانی سے کام لیا ہے اور شبلی کے گھر کا جو نقشہ اور ان کی اہلیہ اور بیٹی کے بارے میں جو کچھ عطیہ فیضی کے حوالہ سے لکھا ہے وہ سب فرضی داستان ہے۔

عطیہ بے پردہ رہتی تھیں۔ اس کو جائز قرار دینے کے لئے انہوں نے ایک اور واقعہ علماء سے مناظرہ کا گھڑا ہے، جس میں وہ بے پردہ علماء کے سامنے آگئیں اور علماء مجلس چھوڑ کر بھاگ گئے۔ (۳۳) انہوں نے یہ بھی کہا کہ علماء کے بھاگنے پر شبلی نے کہا کہ ''اب میں علماء کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہا۔'' اس سلسلے کا عطیہ کا آخری جملہ یہ ہے کہ ''مولوی صاحب علماء کو منہ دکھانے کے قابل رہے یا نہ رہے، لیکن واک آؤٹ کر کے علماء نے ہی ثابت کر دیا کہ ان کے پاس میرے اعتراضات کا کوئی جواب نہیں تھا۔'' دراصل یہ تمام باتیں عطیہ فیضی کی پیدا کردہ اور اپنے بے پردہ رہنے کا جواز پیش کرنے کی ایک کوشش کے سوا کچھ نہیں۔ سچ یہ ہے کہ عطیہ کا ذہن صاف نہیں، کہیں وہ علامہ شبلی کو روشن خیال ثابت کرتی ہیں تو کہیں قدامت پرست۔ جیسا جہاں بہتر معلوم ہوتا ہے وہ لکھ جاتی ہیں یا بیان کر دیتی ہیں۔

نصر اللہ خاں نے پردہ کے سلسلے میں انٹرویو کے حوالہ سے جو باتیں لکھی ہیں وہ عطیہ کے دوسرے مضامین میں بھی قدرے مختلف انداز میں درج ہیں، مگر یہ بات محل نظر ہے کہ آخر وہ بار بار

اور علامہ شبلی سے ہر ملاقات میں پردہ کا مسئلہ کیوں اٹھاتی ہیں۔؟ مثلاً علامہ شبلی سے بمبئی میں اپنی پہلی ملاقات کی تفصیل میں وہ لکھتی ہیں:

''جب ہم شبلی کی قیام گاہ پر پہنچے تو ہمیں ایک کمرے میں لے جایا گیا جہاں پردہ پڑا ہوا تھا، ہم نے محسوس کر لیا کہ ارادہ یہ ہے کہ ہم بند کمرے میں بیٹھیں اور وہیں سے بات چیت کریں، شبلی باہر دروازہ کے سامنے بیٹھے تھے، ان کے ساتھ کچھ اور لوگ بھی تھے، سب اس خیال میں چپ تھے کہ کیا کہیں، اور کیونکر شروع کریں۔ یہ عجیب تکلیف دہ صورت تھی جس پر غصہ بھی آ رہا تھا اور ہنسی بھی آ رہی تھی، میں نے فیصلہ کر لیا کہ اسے ختم ہونا چاہئے، میں نے پردہ پرے ہٹایا، باہر نکلی اور میں نے کہا کہ اگر آپ ہمارا سامنا نہیں کرنا چاہتے تو ہم بھی جاتے ہیں، ایک عجیب سکوت سا میری اس بات پر چھا گیا۔''(۳۴)

قیام لکھنؤ کا قصہ سنئے:

''شبلی نے مجھے لکھنؤ بلوا کر ایک عجیب مخمصے میں ڈال دیا، انہوں نے تمام علماء وفضلا کو اکٹھا کیا، انہوں نے قرآن و حدیث کے حوالوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ عورت مرد کے ماتحت ہے، اس لئے ایثار اور قربانی، ترک اور تیاگ کی زندگی بسر کرے، ہم پہلے سے ایک کمرے میں بٹھائے گئے تھے، جب یہ باتیں سنتے سنتے میں عاجز آ گئی تو مجھ سے صبر نہ ہو سکا، میں نے سوچا اس صورت حال کا خاتمہ ہونا چاہئے، کمرے سے باہر نکل کر میں نے کہا ''جنت ماں کے پاؤں کے نیچے ہے، یہ قرآن کہتا ہے اور دوزخ باپ کے پاؤں کے نیچے ہے، یہ شیطان کہتا ہے اور یہ دونوں بڑی سچائیاں ہیں۔'' میرے یہ الفاظ بم کا گولہ ثابت ہوئے۔''(۳۵)

ان واقعات سے کم از کم یہ تو طے ہے کہ شبلی ان کی بے پردگی کے خلاف تھے اور چاہتے تھے کہ وہ پردہ کریں، لیکن جب عطیہ یہ کہتی ہیں کہ وہ پردہ کے علمی و عملی دونوں طرح سے خلاف تھے۔(۳۶) تو سمجھ میں نہیں آتا کہ جب وہ پردہ کے خلاف تھے تو بار بار علماء کو جمع کر کے کیوں پردہ کی اہمیت ان پر واضح کرانا چاہتے تھے۔عطیہ ایک دوسرے مضمون میں لکھتی ہیں:

''ہم نے ان کے بارے میں اندازہ لگایا کہ وہ عورتوں کے بارے میں بہت زیادہ تنگ نظر اور قدامت پرست ہیں۔ ان کے نزدیک اسلام میں عورت کی کوئی خاص منزلت اور حیثیت نہیں تھی۔'' (۳۷)

عطیہ فیضی کی یہ رائے اس شخص کے بارے میں ہے جس نے امیر علی کے جواب میں الندوہ میں اسلام اور پردہ کے عنوان سے سخت مضمون لکھا تھا اور پردہ کی اہمیت واضح کرتے ہوئے ثابت کیا تھا کہ عورتوں کا پردہ کرنا اور منہ چھپانا مسلمانوں کی عام معاشرت تھی۔ (۳۸) واقعہ یہ ہے کہ عطیہ فیضی علامہ شبلی کو سمجھ ہی نہیں سکیں اور خود علامہ شبلی بھی عطیہ کو سمجھنے سے قاصر رہے۔ کیونکہ وہ عطیہ فیضی کی جس تربیت کے لئے سارے جتن کر رہے تھے اور جس مقصد سے کر رہے تھے، وہ عطیہ پر واضح نہیں کر سکے۔ اس روشن خیالی کا لازمی نتیجہ وہی نکلنا تھا جو مولوی عبدالحق، امین زبیری اور ڈاکٹر وحید قریشی وغیرہ نے نکالا۔ اس طرح علامہ شبلی کے وہ سارے جتن جو انہوں نے ایک جدید تعلیم یافتہ تیز طرار خاتون کی تربیت کے لئے کئے نہ صرف رائیگاں گئے بلکہ خود ان کی شخصیت کے لئے بھی مضر ثابت ہوئے۔

ایک اہل قلم ڈاکٹر محمد یامین عثمان نے اپنے مقالہ میں ثابت کیا ہے کہ علامہ شبلی کی عطیہ فیضی سے جو توقعات تھیں وہ تقریباً سب پوری ہوئیں۔ وہ ایک بہترین خطیب بنیں، خواتین کی تعلیم کے لئے جدوجہد کی، مدرسہ یادگار امیرا قائم کیا، پندرہ روزہ رسالہ معین نسواں جاری کیا، وغیرہ۔ (۳۹) حقیقت یہی ہے کہ عطیہ خود تو علامہ شبلی کی ذات سے فیض یاب ہوئیں، لیکن ان کی ایک تحریر جو ''علامہ شبلی اور خاندان فیضی'' کے عنوان سے شائع ہوئی اس سے علامہ شبلی کی شخصیت کو شدید نقصان پہنچا۔

نصر اللہ خاں نے عطیہ فیضی کے متعلق بعض متضاد مگر بڑی دلچسپ باتیں بھی ان کے خاکہ میں لکھ دی ہیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں:

''نواب سلطان جہاں کے بارے میں عطیہ بیگم یہ کہا کرتی تھیں کہ اگر بیگم چاہتیں تو بڑے بڑے نوابوں اور نواب زادوں کے رشتے موجود تھے لیکن انہوں نے ایک عالم بے بدل مولوی صدیق حسن خاں سے شادی کی جن کے پاس علم کی دولت

کے سوا کچھ نہ تھا اور بیگم صاحبہ ان کی اسی طرح خدمت کرتی تھیں جس طرح اس زمانے میں ایک عام عورت اپنے شوہر کی کیا کرتی تھی۔ بیگم صاحبہ ایک باپردہ خاتون تھیں۔'' (۴۰)

یہ بیگم سلطان جہاں کی توصیف وستائش میں عطیہ بیگم کا بیان ہے۔ خود عطیہ کا کیا حال تھا؟ نصر اللہ خاں کے الفاظ میں ملاحظہ ہو:

''وہ فیضی [رحمین] سے ذرا ذرا سی بات پر خفا ہو جاتیں اور اسے بری طرح ڈانٹتیں اور بے پناہ غصے کے عالم میں اسے یہودی کتا کہتیں، لیکن فیضی ہر وقت ''جی بیگم صاحب! جی بیگم صاحب!'' کہتے اور وفادار کتے کی طرح دم ہلاتے رہتے۔'' (۴۱)

عطیہ فیضی فرماں روائے بھوپال سلطان جہاں بیگم سے اپنے گہرے تعلقات کا ذکر کرتی ہیں۔ تالیف سیرت کے لئے شبلی کی طرف انہیں متوجہ کرانے کا دعوی کرتی ہیں۔ بھوپال جاتی ہیں۔ وہاں قیام کرتی ہیں لیکن ان کی معلومات کا یہ حال ہے کہ نواب سید صدیق حسن خاں کو ان کا شوہر بتاتی ہیں اور ان کی مثالی خدمت کا بھی ذکر کرتی ہیں۔ حالانکہ ان کے عقد میں نواب شاہ جہاں بیگم تھیں اور اطاعت شوہری کے قصے بیگم سلطان جہاں کے نہیں شاہ جہاں بیگم کے ہیں۔

عطیہ جھوٹ بھی دھڑلے سے بولتی اور لکھتی ہیں، ایک جگہ نہیں کم از کم دو جگہ لکھا ہے کہ والد نے بہن زہرا کے علمی ذوق کی شبلی سے تعریف وتحسین کی تو انہوں نے قسطنطنیہ ہی سے ان کے نام الندوہ جاری کرا دیا۔ (۴۲) علامہ شبلی کا سفر قسطنطنیہ ۱۸۹۲ء میں ہوا اور الندوہ جولائی ۱۹۰۴ء میں نکلا تو ان کے والد نے قسطنطنیہ سے الندوہ کیسے جاری کرا دیا؟ بعد میں بھی ان کے والد کے ذریعہ الندوہ کا اجرا ممکن نہیں ہوسکتا کیونکہ اس کے اجراء سے پہلے ۱۹۰۳ء میں وہ وفات پا چکے تھے۔

نصر اللہ خاں نے عطیہ بیگم کے خاکے میں اقبال کے دلی لگاؤ کا ذکر سرے سے نظر انداز کر دیا ہے۔ ان کی کراچی کی زندگی پر بھی روشنی نہیں ڈالی ہے۔ ان کے بارے میں جو کچھ بیان کیا وہ آزادی سے پہلے کے قصے ہیں۔ کراچی میں وہ کس کسمپرسی میں رہیں۔ کیا کیا تکلیفیں اٹھائیں۔ حتی کہ سخت مجبوری کے عالم میں انہیں ہاتھ پھیلانا پڑا۔ اور پھر وہ کس طرح بے یار و مددگار جناح اسپتال میں چل بسیں جس کی تفصیل ماہر القادری نے اپنے وفیاتی مضمون میں جو پہلے فاران میں

شائع ہوا بعد ازاں یادرفتگاں (۴۳) میں شامل کیا گیا، اس کی تفصیل لکھی ہے۔ نصر اللہ خاں نے ان سب واقعات کو قلم انداز کر دیا ہے۔ واضح رہے کہ عطیہ فیضی نے محمد علی جناح کی خواہش پر ہجرت کی تھی۔ جب ''قائد اعظم'' کے ایما پر جانے والوں کا یہ انجام ہوا تو جو بغیر بلائے گئے تھے ان کا کیا حشر ہوا ہوگا۔؟

ایک اور بات قابل ذکر ہے کہ علامہ شبلی اپنے عہد کی کانگریس کے حامی اور مسلم لیگ کے مخالف تھے۔ آخری دور میں الہلال کلکتہ کے صفحات میں ان کی یہ لے اور تیز ہوگئی تھی۔ خطوط شبلی سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک زمانہ میں عطیہ فیضی اس معاملہ میں نہ صرف ان کی ہم نوا تھیں بلکہ ان سے بھی دو قدم آگے تھیں، مگر جب انہیں ہجرت کرنی ہوئی تو انہوں نے اپنی دوست سروجنی نائیڈو کی بات بھی ٹھکرا دی۔ البتہ نصر اللہ خاں نے یہ بات قطعی طور پر سچ لکھی ہے کہ ''عطیہ کی شخصیت انتہائی پراسرار تھی۔'' (۴۴) اور وہ خود اس پراسرار داستان کو صحیح طور سے سمجھ نہیں سکے۔ ○

حوالے

(۱) کیا قافلہ جاتا ہے ص۱۴۲، نصر اللہ خاں، بزم ادب کراچی، ۲۰۱۷ء

(۲) اقبال از عطیہ ص۱۶۴، ضیاء الدین احمد برنی، اقبال اکادمی پاکستان طبع سوم ۱۹۸۱ء

(۳) کیا قافلہ جاتا ہے ص۱۴۳-۱۴۴

(۴) تاریخ ادب اردو جلد چہارم حصہ دوم ص۱۰۵۹۔ ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی

(۵) کیا قافلہ جاتا ہے ص۱۴۳

(۶) ڈاکٹر منیر احمد سلیچ، وفیات اہل قلم ص۳۰۵، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء

(۷) کیا قافلہ جاتا ہے ص۱۴۳

(۸) یادرفتگاں ج۲ ص۱۴۳، ماہر القادری، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی

(۹) سفر نامہ روم ومصر وشام ص۱۰۸، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء

(۱۰) ایضاً ص۱۰۸

(۱۱) شبلی شناسی کے اولین نقوش ص۱۳۳۔ ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ

(۱۲) سفرنامہ روم ومصروشام ص ۲۰۵
(۱۳) علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط ص ۱۴۰-۱۴۱، محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء
(۱۴) ماہنامہ ادبی دنیا لاہور، جون ۱۹۴۶ء ص ۳۷
(۱۵) ایضاً
(۱۶) کیا قافلہ جاتا ہے، ص ۱۴۳
(۱۷) ایضاً ص ۱۴۴
(۱۸) ایضاً ص ۱۴۴
(۱۹) شبلی معاصرین کی نظر میں ص ۱۷۹، ظفر احمد صدیقی، اردو اکادمی لکھنؤ
(۲۰) اختر اقبال ص ۲۳۸
(۲۱) شبلی شناسی کے اولین نقوش ص ۱۳۹
(۲۲) حیات شبلی ص ۴۰۸
(۲۳) کیا قافلہ جاتا ہے، ص ۱۴۴
(۲۴) شبلی شناسی کے اولین نقوش ص ۱۳۹
(۲۵) کیا قافلہ جاتا ہے ص ۱۴۴-۱۴۵
(۲۶) خطوط شبلی ص ۵۶، مرتبہ امین زبیری، شمسی سین پریس آگرہ
(۲۷) ایضاً ص ۵۷
(۲۸) حیات شبلی ص ۲۶۸
(۲۹) آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی ص ۱۹۶-۱۹۷
(۳۰) حیات شبلی ص ۲۶۷
(۳۱) ایضاً
(۳۲) شبلی شناسی کے اولین نقوش ص ۱۳۵
(۳۳) کیا قافلہ جاتا ہے، ص ۱۴۵
(۳۴) شبلی شناسی کے اولین نقوش ص ۱۳۸

(۳۵) شبلی شناسی کے اولین نقوش ص ۱۴۰

(۳۶) ادبی دنیا لاہور جون ۱۹۴۶ء ص ۳۶

(۳۷) شبلی شناسی کے اولین نقوش ص ۱۳۸

(۳۸) مقالات شبلی اول ص ۱۲۲، دار المصنفین اعظم گڑھ، ۱۹۳۰ء

(۳۹) مباحث لاہور، جنوری تا جون ۲۰۱۲ء، ص ۳۱۱-۳۲۶

(۴۰) کیا قافلہ جاتا ہے ص ۱۴۶

(۴۱) ایضاً ص ۱۴۳

(۴۲) شبلی شناسی کے اولین نقوش ص ۱۳۳

(۴۳) یادرفتگاں ج ۲ ص ۱۴۳

(۴۴) کیا قافلہ جاتا ہے ایضاً ص ۱۴۷

○○○

[۸]

علامہ شبلی نعمانیؒ

شیخ الحدیث مولانا محمد یونس جونپوری کی نظر میں

علامہ شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] عبقری اور جامع کمال شخص تھے۔ ان کی عظمت و جامعیت، ان کی تصنیفات وتالیفات کی انفرادیت اوران کے ادبی، تنقیدی، تاریخی اور تعلیمی افکار وخیالات کی افادیت کا ایک زمانہ معترف ہے:

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

عظمت شبلی کا اعتراف سب سے پہلے سرسید احمد خاں [۱۸۱۷- ۱۸۹۸ء] کے قلم سے المامون کے دیباچہ میں سامنے آیا۔ اس وقت علامہ شبلی کی عمر ۳۲ر برس تھی۔ پھر ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حالی، محسن الملک، ذکاءاللہ دہلوی، سید احمد دہلوی اور اس عہد کے متعدد ارباب کمال نے ان کی علمی تحقیقات اور تاریخی تصنیفات کی داد دی۔ بعد کے ادوار میں مہدی حسن افادی ان کے ادب وانشا کے بے پناہ مداح تھے اور انہیں تاریخ کا معلم اول قرار دیتے تھے۔ ان مادحین کی تفصیل کے لئے ایک دفتر درکار ہوگا۔ گذشتہ ۱۳۰ر برسوں سے یہ سلسلہ جاری ہے۔ اس سلسلہ کی ایک مثال ہمارے عہد کے ممتاز عالم وصوفی شیخ الحدیث مولانا شیخ محمد یونس جون پوری [۱۹۳۷ - ۲۰۱۷ء] سابق شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور کی ذات گرامی بھی تھی۔ ان کے اعترافات وخیالات خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

مولانا شیخ محمد یونس جون پوری علم وفضل کے بلند مقام پر فائز اور مختلف علوم وفنون کے جامع تھے۔ خاص طور پر علوم الحدیث میں یگانہ روزگار تھے۔ پچاس برس تک حدیث پاک کا درس دیا۔ انہیں شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا کاندھلوی [۱۸۹۸۔۱۹۸۳ء] سے شرف تلمذ حاصل تھا اور وہ

ان پر بڑا اعتماد کرتے تھے۔

حضرت شیخ الحدیث کا مطالعہ بے حد وسیع و عمیق تھا۔ مختلف موضوعات پر ان کی عالمانہ نظر تھی۔ علوم الحدیث میں وہ درک و بصیرت رکھتے ہی تھے۔ قرآن، تفسیر، تصوف و سلوک، کلام و عقائد اور تاریخ و سیر پر بھی عالمانہ اور محققانہ نظر تھی۔ درس و تدریس میں مدۃ العمر مصروف رہے۔ تصنیف و تالیف میں بھی حصہ لیا اور کئی کتب و رسائل اور شروح و حواشی ان کے قلم سے نکلے۔ جن کی افادیت کا اہل نظر نے برملا اعتراف کیا ہے۔

شیخ محمد یونس جون پوری علامہ شبلی کی شخصیت علم و فضل اور ان کی بعض تحقیقات اور علمی تصنیفات کے بڑے معترف و مداح تھے اور ان کا ذکر اپنی مجالس میں بڑی محبت و عقیدت سے کرتے تھے۔ ان کے یہ خیالات علامہ شبلی کی تصنیفات و تالیفات کے گہرے مطالعہ کا نتیجہ ہیں۔ انہوں نے اس کا ایک سبب یہ بھی لکھا ہے کہ:

"سن لو مجھے بھی شبلی سے محبت ہے کیوں کہ ان کو اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت تھی اور مجھے بھی اللہ اور اس کے رسولؐ سے محبت ہے"۔(۱)

علامہ شبلی سے متعلق حضرت شیخ جون پوری کے آراء وخیالات ان کے معتقدوں اور ان کی مجالس کے حاضر باشوں نے اپنی کتب و مضامین میں نقل کئے ہیں۔ خاص طور پر مولانا فیصل احمد بھٹکلی ندوی نے مجالس محدث العصر میں ان کے متعدد خیالات و فرمودات نقل کئے ہیں۔ یہاں ان ہی کا ذکر مقصود ہے۔

اہل علم واقف ہیں کہ علامہ شبلی ایک بڑے عاشق رسولؐ تھے۔ ۱۸۸۳ء میں جب وہ ایم اے او کالج علی گڑھ کالج سے بحیثیت پروفیسر وابستہ ہوئے تو وہاں انہوں نے اولاً مجالس میلاد کی طرح ڈالی۔ جسے وہ اپنے گھر پر منعقد کیا کرتے تھے اور جس میں وہ خود سیرت نبوی بیان کرتے۔ ابتدا میں اس میں چند اساتذہ وطلبہ شریک ہوتے تھے۔ پھر آہستہ آہستہ اسے بڑی مقبولیت ملی اور سیرت کے جلسے دھوم دھام سے سالار منزل میں ہونے لگے اور یہ سلسلہ غالباً اب بھی جاری ہے۔

علی گڑھ کے زمانہ قیام میں سیرت نبویؐ کے حوالہ سے علامہ شبلی کا دوسرا اہم کارنامہ تاریخ بدء الاسلام کی تالیف ہے۔ اس میں انہوں نے نبی کریم ﷺ کے سوانح اور حالات مقدسہ قلم بند

کئے ہیں۔ڈاکٹر انور خالد محمود نے اسے سیرۃ النبی کا تخم قرار دیا ہے۔یہ رسالہ طلبہ کی درسی ضرورت کے لئے قلم بند کیا گیا تھا اور ایک عرصہ تک ایم اے او کالج کے نصاب میں شامل رہا۔اس طرح گویا انہوں نے طلبائے علی گڑھ کو اسوہ نبویؐ سے روشناس کرانے کا آغاز کیا۔

علامہ شبلی کے عشق نبویؐ کا سب سے بڑا مظہر ان کی عظیم الشان تصنیف سیرۃ النبیؐ ہے۔یہ کتاب انہوں نے اس عزم کے ساتھ لکھی ہے کہ ''اگر مر نہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو دنیا کو ایک ایسی کتاب دے جاؤں گا جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہو سکتی۔''(۲) اسے وہ ذریعہ نجات بھی خیال کرتے تھے۔(۳)

متعدد اہل قلم اور علماء و فضلا کا خیال ہے کہ سیرۃ النبی ایک بے نظیر کتاب ہے اور اس کا جواب اردو کیا عربی و فارسی میں بھی نہیں ہے۔حضرت شیخ محمد یونس جون پوری نے بھی اپنی متعدد مجالس میں علامہ شبلی کے عشق نبویؐ اور سیرت النبی کی انفرادیت کا ذکر کیا ہے۔اس سلسلے کے ان کے اقوال یہ ہیں:

۱۔پہلا قول:

''شبلی کی سیرۃ النبی کی ایک،ایک سطر عشق رسول سے معطر ہے۔شبلی نے عشق رسول سے سیرت لکھی ہے۔شبلی کو اللہ اور اس کے رسول سے محبت تھی۔''(۴)

۲۔دوسرا قول:

''شبلی نے کس قدر محبت سے سیرۃ النبی لکھی ہے،اس کے پہلے صفحے سے اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔''(۵)

۳۔تیسرا قول:

''شبلی کو محبت تھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور وہ محبت میں ڈوب کر لکھتے تھے۔''(۶)

علامہ شبلی کو سر سید احمد خاں کے بعض مذہبی و سیاسی خیالات سے اتفاق نہ تھا۔اسی طرح وہ دیوبند کے نظریہ تعلیم کے بالمقابل تحریک ندوہ کے سب سے بڑے حامی تھے۔اس وجہ سے علی گڑھ اور دیوبند کے بعض ہم نواؤں نے انہیں مطعون کیا۔مطعون کرنے کا سلسلہ عہد شبلی میں تو تھا ہی بعد

ازمرگ بھی جاری رہا۔اس کوبعض انصاف پسنداہل قلم نے شبلی پرظلم سے تعبیر کیا ہے۔حضرت شیخ الحدیث بھی انہیں مظلوم تصور کرتے تھے۔ایک مرتبہ واضح طور پرفرمایا کہ شبلی مظلوم ہیں۔(۷)

علامہ شبلی غالباً پہلے ایسے سیرت نگار ہیں جنہوں نے سیرت کی تصنیف وتالیف میں یہ ضابطہ مقرر کیا کہ واقعات سیرت اولاً قرآن مجید سے نقل کئے جائیں پھراحادیث نبویؐ اورآخر میں تاریخ وسیر کی مستند کتابوں سے استفادہ کیا جائے۔سیرت نگاری کے میدان میں یہ ان کاایک منفرد اورمحققانہ نقطہ نظر تھا۔حضرت شیخ جون پوری علامہ شبلی اوران کی سیرۃ النبی کی اس منفرد خصوصیت کے بڑے مداح تھے۔ایک بارفرمایا کہ:

''ان کے جیسا کوئی شخص نہیں۔وہ عبقری الدھر ہیں۔انہوں نے تاریخ کا ایک نیاطرز اپنایا کہ صحیح بخاری،قرآن اوردنیا بھر کی کتابوں سے چھانٹ چھانٹ کر لکھنا شروع کیا۔انہیں نے لوگوں کو نیا منہج دیااورتاریخی شعور پیدا کیا۔''(۸)

ایک مرتبہ حضرت شیخ جون پوری سے ایک طالب علم نے سوال کیا کہ علامہ شبلی جن احادیث پرکلام کرتے ہیں وہ قابل قبول ہیں یانہیں؟اس کے جواب میں انہوں نے فرمایا کہ:

''شبلی محدث تونہیں ہیں البتہ محقق ضرور ہیں۔وہ جو کچھ فرماتے ہیں تحقیق کے بعد ہی فرماتے ہیں لہذاان کی تنقید قابل قبول ہے''۔(۹)

احادیث کے حوالہ سے یہ اس قدراہم اور بڑااعتراف ہے کہ اس سے پہلے کسی نے اس کے بارے میں لب کشائی نہیں کی۔خودحضرت شیخ جون پوری کے حلقہ کے بعض علماءعلامہ شبلی کی ان عظمتوں کے قائل نہیں۔یہاں یہ وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے کہ علامہ شبلی عام معنوں میں محدث بھلے ہی نہ رہے ہوں،لیکن علوم الحدیث پران کی بڑی گہری اورعالمانہ نظرتھی۔طالب علمی کے زمانہ میں وہ حدیث کی تحصیل وتکمیل کے لئے اعظم گڑھ سے سہارن پور گئے اوراپنے وقت کےسب سے بڑے شیخ الحدیث مولانا احمد علی محدث سہارنپوری[م:۷رجمادی الاول ۱۲۹۷ھ] کے سامنے زانوئے تلمذتہہ کیا۔ان کے مطالعہ میں کتب احادیث ہمیشہ رہیں جیسا کہ ان کے مکاتیب اوران کے کتب ومقالات کے مصادر سے واضح ہوتا ہے۔ندوہ کے زمانہ قیام میں انہوں نے درس بخاری کا بھی اہتمام کیا تھااورآخر میں سیرۃ النبی کے زمانہ تصنیف میں کئی برس تک کتب

احادیث کا انہوں نے بڑی گہرائی اور دقت نظر سے مطالعہ کیا تھا۔ اس کے متعدد نقوش سیرۃ النبی کے صفحات پر ثبت ہیں۔ علامہ شبلی اور علم حدیث کے عنوان سے مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے ایک اہم مقالہ سپرد قلم کیا ہے، جس میں احادیث سے ان کے شغف کا بالتفصیل ذکر کیا ہے۔(۱۰)

علوم الحدیث بالخصوص روایت و درایت، اسماء الرجال اور دیگر متعلقات علوم حدیث کے سلسلے میں ان کی گہری اور عالمانہ نظر کا اندازہ سیرۃ النبی کے مفصل اور لاجواب مقدمہ سے بھی کیا جاسکتا ہے۔ جس میں انہوں نے ایک ماہر محدث اور ماہر سیرت نگار و مؤرخ کی طرح اصول سیرت نگاری پر نقد و بحث کی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ واقعات سیرت میں جہاں جہاں احادیث سے استدلال کیا ہے، ان پر محدثانہ نقطۂ نظر سے جرح و تعدیل سے کام لیا ہے۔ غالباً یہی سبب ہے کہ حضرت شیخ محمد یونس جون پوری ان کی تحقیقات حدیث کو قابل قبول قرار دیتے ہیں۔

ہندوستانی مسلمانوں میں جو دو چار بڑے ماہر علم الکلام پیدا ہوئے ان میں ایک اہم نام علامہ شبلی کا بھی ہے اور اس لحاظ سے کہ انہوں نے ایک منصوبہ بند طریقے سے علم الکلام پر تصنیفی کام کیا وہ سب پر فائق ہیں۔ ان کے سلسلہ کلامیہ کی تصنیفات الکلام، علم الکلام، الغزالی اور سوانح مولانا روم وغیرہ کو بڑی مقبولیت نصیب ہوئی۔ ان سب کا فارسی زبان میں ایران و افغانستان میں ترجمہ ہوا اور آج بھی یہ کتابیں ہند و پاک اور ایران وغیرہ میں طبع ہوتی ہیں اور پڑھی پڑھائی جاتی ہیں۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ ان کتابوں کے حوالہ سے بعض نافہم علماء نے بڑا واویلا مچایا۔ ایک بار علامہ شبلی کی زندگی میں اور دوبارہ بعد از مرگ ان کی تکفیر کی گئی۔ اس سلسلہ میں علامہ شبلی پر دو الزامات عائد کئے جاتے ہیں۔ پہلا الزام ان کے بعض عقائد کے سلسلہ میں لگایا گیا۔ اس کی حقیقت صرف اس قدر ہے کہ علامہ شبلی نے الکلام میں رد کرنے کے لئے ملاحدہ کے جو اقوال نقل کئے تھے، انہیں علامہ شبلی کی طرف منسوب کر دیا گیا۔ علامہ شبلی نے اس کی تردید کی اور واضح کیا کہ وہ ان کے نہیں ملاحدہ کے اقوال ہیں اور رد کرنے کے لئے نقل کئے گئے ہیں اور میرا عقیدہ وہی ہے جو اہل سنت والجماعت کا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی[۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] نے جب الکلام شائع کی تو اس پر تنبیہ کے عنوان سے ایک مفصل مقدمہ لکھا۔ انہوں نے بھی اس مفروضہ کی تردید کی اور یہ بھی واضح کیا کہ ہمارے اسلاف کا اس سلسلہ میں دونوں طریقہ رہا ہے کہ کبھی وہ ملاحدہ کے اقوال

نقل کر کے تردید کرتے ہیں اور کبھی بغیر نقل کئے تردید کرتے ہیں۔علامہ شبلی نے اول الذکر طرز اختیار کیا۔الکلام وغیرہ سے علامہ شبلی کے جو عقائد مخالفین نے ثابت کئے ہیں وہ ملاحدہ کے ہیں۔علامہ شبلی کے نہیں ہیں۔

الکلام اور علم الکلام میں فرق اسلامی پر جو نقد و بحث ہے اور جس میں فرق اسلامی اشعریہ اور ماتریدیہ کے ذکر سے علامہ شبلی کے متاثر ہونے بلکہ معتزلی ہونے کا الزام عائد کیا جاتا ہے۔ مولانا سید عبدالحی حسنی [م:۱۹۲۳ء] نے نزہتہ الخواطر میں صاف لفظوں میں لکھا ہے کہ علامہ شبلی معتزلی تھے۔مولانا سید سلیمان ندوی نے الکلام کے دیباچہ اور حیات شبلی دونوں میں اس کا جائزہ لیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ ان سے اعتزال ثابت نہیں ہوتا اور علامہ شبلی معتزلی نہیں تھے۔شیخ الحدیث مولانا محمد یونس جونپوری بھی علامہ شبلی کے اعتزال کی تردید کرتے تھے۔ایک بار فرمایا کہ:

> ''صاحب نزہتہ الخواطر نے انہیں معتزلی لکھا ہے، یہ صحیح نہیں ہے،حقیقت یہ ہے کہ جو کوئی ان کی کتابیں پڑھتا ہے وہ مرعوب ہو جاتا ہے۔آج بھی کئی لوگ ان سے مرعوب ہیں۔'' (۱۱)

دوسری جگہ فرماتے ہیں:

> ''شبلی پر بہت سے لوگوں نے اعتراضات کئے۔یہ مولانا عبدالحی حسنی رائے بریلوی نے جو کچھ لکھا ہے کہ وہ معتزلی تھے، وہ صحیح نہیں ہے۔محسوس ہوتا ہے کہ جلے دل کے ساتھ لکھا ہے۔اب اس کی وجہ کیا تھی!نہیں معلوم۔''(۱۲)

مولانا سید عبدالحی حسنی سابق ناظم ندوہ نے نزہتہ الخواطر میں معتزلی کے علاوہ بھی کئی بے سروپا الزامات عائد کئے ہیں۔اس سے ان کے جلے دل ہونے کی تصدیق ہوتی ہے۔اس کی اس طرح بھی تائید ہوتی ہے کہ نزہتہ الخواطر کی تصنیف میں علامہ شبلی کا صائب مشورہ بھی شامل تھا۔ جس کا انہوں نے ماہنامہ الندوہ میں تو ذکر کیا مگر نزہتہ الخواطر میں اس کا اعتراف کہیں نظر نہیں آتا۔

شیخ الحدیث مولانا محمد یونس جون پوری اپنے گہرے مطالعہ شبلی کی وجہ سے ان کے بڑے قائل تھے۔مولانا سید بلال عبدالحی حسنی نے اپنے مضمون میں لکھاے کہ:

> ''مولانا اگرچہ خالص فن حدیث کے آدمی تھے اور اسی میں انہوں نے عمر

کھپائی تھی، مگر تاریخ وادب اور فکر اسلامی کا بھی انہوں نے مطالعہ کیا تھا۔ علامہ شبلی نعمانی اور علامہ سید سلیمان ندوی کی تصنیفات کے بڑے قدر داں تھے۔ ایک مجلس میں کسی نے علامہ شبلی پر کوئی طنزیہ جملہ کہہ دیا تو سخت ناراض ہوئے اور فرمایا کہ تم ان کے علم کو کیا جانو۔'' (۱۳)

ایک مضمون نگار محمد معاویہ سعدی ہیں جو حضرت شیخ الحدیث کے علم وفضل، علوم اسلامی بالخصوص علم حدیث میں ان کے درک وبصیرت کے نہ صرف قائل ہیں بلکہ بڑے معترف و مداح بھی ہیں، لیکن وہ حضرت شیخ الحدیث کی مداحی شبلی پر نالاں ہیں اور اسے ان کی کم نظری پر محمول کرتے ہیں اور لکھتے ہیں:

''یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ حریت فکر، آزادی رائے (فطرت پرستی اور اعتزال) کا یہ انحراف علامہ شبلی نعمانی کے ہاں بھی پایا جاتا ہے، جیسا کہ جابہ جا ان کی تحریروں میں اس کے نمونے موجود ہیں اور حکیم الامت حضرت تھانوی وغیرہ محققین علما نے اس کی صراحت بھی کی ہے۔ مگر غالبًا حضرت شیخ کے سامنے علامہ کی وہ تمام چیزیں تھیں نہیں۔ اس لئے سیرۃ النبی کے پرزور اسلوب، پرشوکت تعبیرات اور پر کشش انداز بیان سے متاثر ہو کر معجزات اور مغیبات کے سلسلے میں علامہ شبلی کے انحرافات پر تنبیہ اور ان کی تعیین کے بغیر آپ ان کی تحسین وتوصیف فرماتے تھے۔ جس سے بعض مرتبہ نوخیز اذہان علامہ سے مرعوب ومتاثر ہو جاتے تھے۔'' (۱۴)

مضمون نگار نے انحرافات شبلی کی نشاندہی نہیں کی اور نہ ہی حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی [۱۸۶۳-۱۹۴۳ء] اور دیگر علمائے محققین کے اعتراضات کے حوالے دئے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے وہ یہ ہے کہ چند علما نے الکلام کے بعض اقتباسات کی بنیاد پر ایک فتویٰ ترتیب دیا جس میں علامہ شبلی اور مولانا حمید الدین فراہی [۱۸۶۴-۱۹۳۰ء] کی تکفیر تھی۔ حضرت تھانوی نے ان کی تائید میں ان پر اعتبار کر کے اس پر اپنی مہر ثبت کر دی۔ جس سے بڑا اضطراب پیدا ہوا۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء]، مولانا امین احسن اصلاحیؒ [۱۹۰۴-۱۹۹۷ء] اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی [۱۹۰۳-۱۹۷۹ء] وغیرہ نے اس کے خلاف مضامین لکھے۔ بعد ازاں مولانا

عبدالماجد دریابادی [۱۸۹۲-۱۹۷۷ء] نے حضرت تھانوی کو حقیقت سے آگاہ کیا تو انہوں نے رجوع کر لیا۔ جب حضرت تھانوی نے رجوع کر لیا تو ان کے ہم خیال علماء کو بھی رجوع کر لینا چاہئے تھا، مگر ایسا نہیں ہوا اور بعض لوگ اسے دہراتے رہتے ہیں۔ مضمون نگار کی اس صلاحیت پر تعجب ہوا کہ بات اعتزال اور انحراف کی تھی اور انہوں نے دلیل میں سیرۃ النبی کے پرزور اسلوب، حسن بیان اور اثر آفرینی کو پیش کیا۔ انہیں اس بات کا بھی دکھ ہے کہ حضرت شیخ الحدیث کی مداحی شبلی سے بعض نوخیز اذہان مرعوب ومتاثر ہوئے۔ انہیں شاید یہ احساس نہیں کہ اس طرح وہ حضرت شیخ الحدیث کی بلند رتبہ شخصیت پر نقد کر رہے ہیں۔ جہاں تک سیرۃ النبی کی اثر آفرینی کا معاملہ ہے، واقعہ یہ ہے کہ اس سے گذشتہ صدی میں متعدد اذہان وقلوب متاثر ہوئے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی جیسے عالم وفاضل اور مفسر قرآن سیرۃ النبی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ ان کا الحاد جاتا رہا۔ خود حضرت شیخ الحدیث مولانا جون پوری نے ایک سے زائد بار اس سے متاثر ہونے کا ذکر ہے۔

ایک مجلس میں مولانا فیصل احمد بھٹکلی ندوی نے حضرت شیخ الحدیث سے ان کی محسن کتابوں کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا:

> ''میں کوئی علی میاں تھوڑے ہی ہوں کہ منصور پوری کی کتاب کا تذکرہ کروں گا۔ میں نے رحمت للعالمین پوری پڑھی ہے، کہیں رونا نہیں آیا۔ اس کے برخلاف شبلی کی سیرۃ النبی میں غزوۂ بدر کا جو تذکرہ ہے اس کو پڑھ کر آنسوؤں سے رویا ہوں۔'' (۱۵)

حضرت شیخ الحدیث نے کیسی خوب صورت اور معنی خیز دلیل دی ہے۔ اسے کوئی صاحب نظر ہی سمجھ سکتا ہے۔

ایک بار حضرت شیخ الحدیث نے مولانا فیصل احمد بھٹکلی ندوی سے سیرۃ النبی کے متعلق گفتگو فرمائی۔ جسے انہوں نے مجالس محدث العصر میں نقل کیا ہے۔ چوں کہ اس گفتگو سے حضرت شیخ جون پوری کی علامہ شبلی اور ان کی تصنیف سیرۃ النبی سے انس وعقیدت کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔ اس لئے اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔ حضرت شیخ الحدیث نے دریافت کیا کہ:

> ''کیا شبلی کی سیرت ندوے میں پڑھائی جاتی ہے۔؟

ہم نے کہا نہیں۔ البتہ طلبہ کے مطالعہ کے لئے جو کتابیں ان کی سطح کے لحاظ سے تجویز کی گئی ہیں ان میں سیرۃ النبی (شامل) ہے۔''

پوچھا: یہ سیرت پڑھ کے وہاں کوئی روتا نہیں۔؟

ہم نے کہا: ہم نے نہیں دیکھا۔

فرمایا: غزوۂ بدر کا بیان میں نے دو دفعہ پڑھا اور دونوں دفعہ آنسوؤں سے رویا ہوں۔ انہوں نے اس میں اپنا دل نکال کر رکھ دیا ہے۔

پھر حضرت شیخ نے علامہ شبلی کا درج ذیل قطعہ پڑھا:

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستاں لکھی
مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا
مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتم
خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

ہم نے کہا: اللہ نے ان کے دل کی آواز سن لی اور اسی پر ان کا خاتمہ بالخیر ہو گیا۔ ہم نے [یہ بھی] عرض کیا کہ: شبلی نے صرف ستاون سال کی عمر پائی۔ اللہ نے انہیں کم عمری میں بڑی شہرت عطا فرمائی تھی۔

فرمایا: عبقری لوگوں کی یہی شان ہوتی ہے، شبلی عبقری تھے اور .... وغیرہ کوئی عبقری نہیں۔(۱۶)

یہی نہیں حضرت شیخ علامہ شبلی کو امام اور عبقری کے علاوہ انقلابی اور بے نظیر شخصیت بھی قرار دیتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں:

''وہ ایک انقلابی اور بے نظیر شخصیت کے مالک تھے۔ شبلی تو امام تھے۔ اگر وہ زندہ رہتے تو پتہ نہیں کیا کرتے۔ ان کی سیرۃ النبی میں غزوۂ بدر اور فتح مکہ کا حال پڑھا ہے۔ کیسے عاشق رسول تھے۔''(۱۷)

غالباً اسی عقیدت و محبت اور تعلق کی بنا پر حضرت شیخ الحدیث جونپوری ایک بار یادگار شبلی دارالمصنّفین دیکھنے اعظم گڑھ تشریف لائے۔ پہلے کتب خانہ دیکھا۔ پھر مزار شبلی پر حاضر ہو کر فاتحہ

خوانی کی ۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں عاشق رسولؐ بزرگوں کی تربت ٹھنڈی رکھے اور درجات بلند کرے۔

حوالے

(۱) (ملا اویس ندوی۔www.naadir.org

(۲) مکاتیب شبلی ج۱ص۲۴۲

(۳) ایضاً ص۱۰۸

(۴) ملا اویس ندوی حوالہ مذکور

(۵) ایضاً

(۶) مجالس محدث العصر ص۳۰۲

(۷) ملا اویس ندوی حوالہ مذکور

(۸) ایضاً

(۹) ایضاً

(۱۰) عظمت شبلی ص۲۳۶-۲۴۴

(۱۱) ملا اویس ندوی حوالہ مذکور

(۱۲) مجالس محدث العصر ص۳۰۲

(۱۳) تعمیر حیات، ۱۰/اگست ۲۰۱۷ء ص۲۳

(۱۴) ماہنامہ شاہراہ علم، اکل کوا، ستمبر ۲۰۱۷ء ص۴۹

(۱۵) مجالس محدث العصر ص۲۰۷

(۱۶) مجالس محدث العصر ص۴۵۸

(۱۷) ایضاً ص۱۱۴

ooo

[۹]

شبلی نیشنل اسکول کی تاریخ کا ایک ورق

علامہ شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] فروری ۱۸۸۳ء میں ایم اے او کالج علی گڑھ سے وابستہ ہوئے۔ محض چار ماہ بعد ۲۶/جون ۱۸۸۳ء کو نیشنل اسکول اعظم گڑھ کی بنیاد رکھی۔ علی گڑھ کی تدریسی اور تصنیفی مصروفیات کے باوجود انہوں نے نیشنل اسکول کی مسلسل خبر گیری اور سرپرستی کی اور اسے ترقی دینے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یہی وجہ ہے کہ چار سال بعد ۱۸۸۷ء میں وہ مڈل اور ۱۸۹۴ء میں ہائی اسکول ہو گیا۔ ۱۸۹۸ء میں علامہ شبلی علی گڑھ کو خیر باد کہہ کر حیدر آباد چلے گئے اور ناظم سررشتہ علوم وفنون مقرر ہوئے۔ علاوہ ازیں انجمن ترقی اردو کی نظامت کا بار بھی ڈالا گیا۔ اس کے باوجود نیشنل اسکول کی طرف توجہ دیتے رہے۔ بعد ازاں وہ ندوہ سے وابستہ ہو گئے اور ان کی ساری توجہ ندوہ کی طرف ہو گئی۔ اس دوران نیشنل اسکول بڑے نشیب وفراز سے گذرا۔ ہائی اسکول سے تنزل کر کے مڈل ہو گیا۔ کچھ لوگوں نے یہ بھی غضب کیا کہ اس کا نام بدل کر نیشنل اسکول کے بجائے مسلم جارج اسکول کر دیا۔ نو برس بعد ۱۹۱۳ء میں جب علامہ شبلی نے ندوہ سے مستعفی ہو کر اعظم گڑھ مراجعت کی تو پھر اس کے لئے فکر مند ہوئے، لیکن ان کی دوبارہ جدوجہد کا ابھی آغاز ہی تھا اور اس کی تعمیرات کا سلسلہ جاری ہوا ہی تھا کہ انہوں نے ۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء کو وفات پائی۔

علامہ شبلی کی وفات کے بعد ان کے اعزہ، احباب اور برادری کے لوگوں نے اسکول کو سنبھالا اور ترقی دی۔ چنانچہ ۱۹۲۸ء میں دوبارہ ہائی اسکول، ۱۹۴۰ء میں انٹر کالج اور ۱۹۴۶ء میں اسے ضلع اعظم گڑھ کا پہلا ڈگری کالج کا درجہ حاصل ہوا۔ آج ۱۳۶/سال بعد وہ ملک کا ممتاز تعلیمی ادارہ ہے اور برسوں سے اس لائق ہے کہ اسے یونیورسٹی کا درجہ دیا جائے۔ علامہ شبلی اگر زندہ ہوتے تو اس کو یونیورسٹی بنانے کے لئے جان کی بازی لگا دیتے۔

۱۸۹۴ء میں علامہ شبلی کی موجودگی میں اس کا ایک جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا تھا، جس میں کسی خاص مہمان نے شرکت کی تھی، جن کا نام معلوم نہ ہوسکا۔ اس موقع پر علامہ شبلی کے منجھلے بھائی اور نیشنل اسکول کی مینجنگ کمیٹی کے اسسٹنٹ سکریٹری مولوی محمد اسحاق [م: ۱۲/اگست ۱۹۱۴ء] وکیل ہائی کورٹ الہ آباد نے اس کی سالانہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے اس کی ایک مختصر تاریخ بھی بیان کی تھی، جو احسان اللہ عباسی [۱۸۶۵ - ۱۹۲۸ء] کے اخبار الوقت گورکھپور میں ۱۰/اکتوبر ۱۸۹۴ء کے شمارہ میں مراسلہ کی شکل میں شائع ہوئی تھی اور جو پروفیسر اصغر عباس صاحب سابق صدر شعبہ اردو مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کو ملی تھی جس کا عکس انہوں نے راقم کو آثار شبلی کی تصنیف کے زمانہ میں بھیجا تھا۔ اس عنایت کے لئے میں ان کا بے حد شکر گذار ہوں۔

اس رپورٹ اور تاریخ کی اس لحاظ سے بڑی اہمیت ہے کہ نیشنل اسکول کے متعلق یہ سب سے قدیم تحریر ہے جو اس کے اسسٹنٹ سکریٹری نے اس کے بانی کی موجودگی میں پیش کی تھی۔ دوسرے یہ کہ کالج کی تاریخ تاسیس ۲۰/جون ۱۸۸۳ء قرار دی جاتی ہے، مگر اس رپورٹ میں ۲۶/جون ۱۸۸۳ء کی تاریخ درج ہے۔ اس رپورٹ کے آخر میں اس کے اراکین کے نام بھی دئے گئے ہیں۔ جن میں علامہ شبلی کے والد شیخ حبیب اللہ، ماموں مولوی محمد سلیم و شیخ عبدالحق و دیگر احباب و اعزہ کے نام شامل ہیں اور جن کا ذکر کہیں اور نہیں ملتا۔ یہی نہیں ۱۸۸۳ء سے ۱۸۹۴ء تک اسکول کے لئے کیا جدوجہد ہوئی؟ اور مستقبل کے کیا کیا منصوبے تھے؟ اس رپورٹ سے اس کی بھی کسی قدر وضاحت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ رپورٹ شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ کی تاریخ کا ایک اہم ورق ہے۔ رپورٹ درج ذیل ہے:

جناب والا!

میں بحیثیت اسسٹنٹ سکریٹری مینجنگ کمیٹی نیشنل اسکول اعظم گڑھ تمام ممبران کمیٹی کی طرف سے جناب والا سے اس بات کی اجازت چاہتا ہوں کہ نیشنل اسکول کی سالانہ رپورٹ بابت سال حال آپ کی خدمت میں پیش کروں، لیکن قبل اس کے کہ میں رپورٹ کے ضروری مراتب بیان کروں، میں جناب والا سے استدعا کرتا ہوں کہ نیشنل اسکول کی نہایت اجمالی تاریخ کے بیان کرنے کی مجھ کو اجازت دی جائے۔

جناب والا!

مسلمانوں کی حالت میں تقریباً نصف صدی سے جو انقلاب عظیم پیدا ہوا ہے اور جس نے ان کو دفعتاً دولت، حکومت، اقتدار، عزت تمام چیزوں میں ہندوستان کی اور تمام قوموں سے پسپا کر دیا ہے، ایک ایسا واقعہ ہے جس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ زمینداریاں ان کی ہاتھوں سے نکلی جاتی ہیں۔ عہد ہائے سرکاری میں ہر روز ان کا حصہ کم ہوتا جاتا ہے۔ دولت ان کا ساتھ چھوڑتی جاتی ہے۔ اگرچہ اب بھی بہت سے ایسے مسلمان ہیں جن کی غفلت کی نیند اب تک پوری نہیں ہوئی ہے، لیکن عام طور پر قوم کے بڑے حصہ کو اپنی حالت کا احساس ہو چلا ہے۔

جناب والا!

اگر یہ صحیح ہے کہ ہماری قومی تنزل کا اصل الاصول موجودہ تعلیم سے بے پروائی ہے تو ہمارا شہر تنزل کے میدان میں آج تک اور تمام شہروں سے آگے رہا ہے، جس کا علانیہ ثبوت یہ ہے کہ باوجود اس کے کہ مسلمانوں کی مردم شماری اس ضلع میں بمقابلہ اور قوموں کے بیس فیصدی ہے، لیکن تعلیم کے لحاظ سے یہ نسبت چھ یا سات فیصدی سے کبھی آگے نہیں بڑھی۔

چند برس ہوئے کہ ان حالات کے لحاظ سے یہاں کے چند مسلمانوں کے دل میں ایک تحریک پیدا ہوئی اور انھوں نے ۲۶ جون ۱۸۸۳ء کو ابتدائی اسکول کی بنیاد ڈالی۔ اس وقت یہ اسکول اس حالت میں تھا کہ اس پر اسکول کا لفظ اطلاق کرنا بھی موزوں نہ تھا۔ اس کے اسٹاف میں صرف دو ماسٹر تھے اور اس کی مجموعی آمدنی کل ۲۶/روپیہ ماہوار تھی اور وہ بھی نہایت غیر مستقل اور بے ثبات تھی۔

جناب والا!

اگرچہ یہ اسکول ہر ایک لحاظ سے نہایت بے ثباتی کی حالت میں تھا، اس کے مددگاروں کی تعداد نہایت قلیل تھی، اس کے پہلو میں ایک دوسرا بڑا اسکول موجود تھا، ظاہری حالت کے اعتبار سے ہر طرح پر اس سے فائق تھا، شہر کے تمام بزرگ اس کی طرف سے بے پروا تھے، تاہم اس کے بانیوں نے ہمت نہیں ہاری اور ان کی ہمت اور استقلال کا یہ نتیجہ تھا کہ وہ روز بروز زیادہ ترقی کرتا گیا، یہاں تک کہ ۱۸۸۶ء میں اس نے اپنے خاص طیار کردہ طلبہ مڈل کے امتحان میں بھیجے اور اسی

سال میونسپلٹی نے ۱۰روپیہ ماہوار سے اس کی اعانت منظور کی۔ستمبر ۱۸۸۷ء میں افسران سے سرشتہ تعلیم نے اس کی عمدگی تعلیم کے لحاظ سے اس کے لیے گورنمنٹ ایڈ کی سفارش کی اور بیس روپیہ ماہانہ کی رقم سرشتہ تعلیم سے منظور ہوئی۔جولائی ۱۸۹۳ء میں یہ رقم (بیس روپیہ) سے (۲۵/روپیہ) اور جولائی ۱۸۹۴ء میں (۲۵/روپیہ) سے چالیس روپیہ ہوگئی اور میں نہایت فخر اور خوشی سے بیان کرتا ہوں کہ صاحب ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن نے اپنے ڈاکٹ نمبری ۱۴۱۳،مورخہ ۱۰ستمبر ۱۸۹۴ء میں وعدہ فرمایا ہے کہ جولائی ۱۸۹۵ء میں یہ رقم پوری سو روپے ماہوار تک پہنچ جائے گی۔اور یہ ایک ایسی امداد ہے جو شاید اس حلقہ کے کسی ایڈڈ اسکول کو حاصل نہیں ہوسکی ہے۔

پچھلے دو تین سال سے اس نے مڈل کلاس کا نتیجہ اس قدر عمدہ دکھلایا کہ تمام ممالک مغربی و شمالی کے اسکولوں میں اس کا دوسرا نمبر رہا اور مسٹر ولبی انسپکٹر مدارس نے کتاب معائنہ میں اس کی نسبت یہ الفاظ لکھے ''گذشتہ مڈل کلاس کے امتحان کا نتیجہ نہایت نمایاں ہوا،یعنی ۸۵ فیصدی طلبا پاس ہوئے۔حالاں کہ اس شہر کے اور اسکولوں میں یہ نسبت کبھی تیس فیصدی سے زیادہ نہیں ہوئی۔

اسکول کی یہ ترقی بوجہ اس عمدہ اسٹاف کے ہے جو اسکول میں موجود ہے اور جس میں ہیڈ ماسٹر صاحب کا نام خصوصیت کے ساتھ لیے جانے کے قابل ہے۔

جناب والا!

اسکول کی تاریخ میں یہ امر خاص طور پر بیان کرنے کے قابل ہے کہ مسلمانوں کو جو تعلیم کے میدان میں اپنے ہندو بھائیوں سے پیچھے رہ گئے ہیں،اس اسکول نے نہایت فائدہ پہنچایا۔ چنانچہ مسٹر ولبی نے ۱۲مارچ ۱۸۹۲ء کو جب اسکول کا ملاحظہ کیا تو کیفیت کے خاتمہ میں یہ الفاظ لکھے کہ ''یہاں کے مسلمانوں نے تعلیم میں جو سرگرمی دکھلائی ہے،اس تمام حلقہ میں ایسی سرگرمی اور کہیں ظاہر نہیں کی گئی ہے۔''

جناب والا!

اگر چہ یہ اسکول زیادہ تر مسلمانوں کی تعلیمی ضرورت کے لحاظ سے قائم کیا گیا تھا،لیکن اس کی فیاضی ہندو اور مسلمانوں پر یکساں مبذول رہی ہے۔اس وقت اس کے طلبا میں ہندو طالب علموں کی تعداد مسلمانوں کے بہ نسبت نصف سے کچھ ہی کم ہے اور فری طلبہ جن کی تعداد گیارہ

ہے۔ان میں چھ لڑکے ہندو ہیں۔خود اس کے اسٹاف میں ہندو ٹیچروں کی تعداد مسلمان ٹیچروں کے برابر ہے۔

جناب والا!

اگر چہ جیسا کہ میں نے ابھی بیان کیا کہ اسکول کی ترقی کی رفتار برابر تیز ہوتی جاتی ہے، لیکن ایک امر اس کی ترقی کا بہت بڑا سدراہ ہے اور وہ یہ کہ اس کی کوئی مستقل عمارت نہیں ہے، جن عارضی اور کرائے کے مکانوں میں وہ اب تک منتقل ہوتا رہا ہے، وہ کسی طرح بلحاظ وسعت، بلحاظ صحت، بلحاظ شان وشوکت اس کے لیے موزوں نہ تھے۔ چنانچہ انسپکٹر مدارس نے ہر دفعہ اس خیال کو ظاہر کیا کہ اگر یہ ضرورت پوری نہ کی جائے گی تو سرکار سے مدد ملنا خطرہ کی حالت میں ہوگا۔ اس ضرورت کے لحاظ سے ۱۳/اکتوبر ۱۸۹۳ء کو ایک خاص جلسہ منعقد ہوا اور تعمیر کے لیے خاص چندہ کھولا گیا۔

جناب والا!

اگر چہ نہایت افسوس ہے کہ عمارت کی غرض کے لیے چندہ دینے والوں کی تعداد انھیں چند ممبروں پر محدود رہی جو اسکول کی بنیاد پڑنے کے دن مینجنگ کمیٹی کے ممبر تھے، تاہم میں نہایت خوشی سے اس بات کا اظہار کرتا ہوں کہ چندہ بقدر معتد بہ جمع ہو گیا ہے۔ عمارت کا نقشہ باقاعدہ تیار ہو کر صاحب ڈائریکٹر کے پاس بھیج دیا گیا ہے اور کل لاگت یعنی ۵۰۹۰ میں سے ۲۵۴۵ کی رقم مہیا کرنا مینجنگ کمیٹی نے اپنے ذمہ لیا ہے اور باقی نصف کی نسبت امید ہے کہ حسب قاعدہ سررشتہ تعلیم سے عطا ہوگی۔

جناب والا!

اگر چہ ہم نے اب تک شہر کے بزرگوں کی سردمہری کی شکایت کی ہے، لیکن ہم کو نہایت قوی امید ہے کہ آئندہ ہم کو اس شکایت کا موقع حاصل نہیں ہوگا اور بالخصوص عمارت کے چندہ میں بزرگانِ شہر سے ہم کو امداد واعانت کی نہایت قوی توقع ہے۔

جناب والا!

اسکول ترقی کی جس حالت کو پہنچ گیا ہے، اس کے لحاظ سے تمام ممبروں کو ضروری معلوم

ہوا کہ وہ انٹرنس کے درجہ تک پہنچا دیا جائے۔ چنانچہ اس سال سیکنڈ کلاس کھولنے کا انتظام کیا گیا۔ چونکہ بموجب حکم انسپکٹر صاحب مدارس اس انتظام میں ایک نیا ماسٹر اضافہ کرنا ضرور تھا، اس لیے ایک بی اے پاس ماسٹر کا جداگانہ انتظام کیا گیا اور اس کی تنخواہ کی رقم سکنڈ کلاس طلبا کی فیس اور ممبروں کے ذاتی چندہ سے مہیا کی گئی۔ اکتوبر ۱۸۹۴ء سے سیکنڈ کلاس باضابطہ کھل جائے گی جس کے لیے بموجب ڈاکٹ مورخہ ۲۰/ستمبر ۱۸۹۴ء صاحب ڈائرکٹر کے یہاں سے منظوری آ چکی ہے۔

جناب والا! اب میں بکمال ادب آپ کی خدمت میں اس بات کی التجا کرتا ہوں کہ آپ ان طلبہ کو جو امتحان مڈل اور امتحان سالانہ میں کامیاب ہوئے ہیں، اپنے دست مبارک سے انعام تقسیم فرمائیں۔

ہم ممبران مینجنگ کمیٹی نیشنل اسکول

۱۔ شیخ حبیب اللہ وکیل ۲۔ مولوی محمد سعید وکیل

۳۔ مولوی مرزا سلیم وکیل ۴۔ حافظ حبیب اللہ وکیل

۵۔ حافظ حفلی وکیل ۶۔ شیخ عبدالحق

۷۔ حافظ مولوی محمد سلیم وکیل

۸۔ محمد اسحاق بی اے، ایل ایل بی وکیل ہائی کورٹ، اسسٹنٹ سکریٹری

۹۔ مولوی محمد شبلی نعمانی، سکریٹری

(روزنامہ، الوقت گورکھپور، ۱۰/اکتوبر ۱۸۹۴ء ص ۳-۴)

○○○

[۱۰]

علامہ شبلی اور انجمن حمایت اسلام

۲۴؍ستمبر ۱۸۸۴ء کو ایک بزرگ ہستی چراغِ دین اور ان کے رفقا قاضی خلیفہ حمیدالدین، مولوی غلام اللہ اور منشی عبدالرحیم وغیرہ کی کوششوں سے انجمن حمایت اسلام لاہور کا قیام عمل میں آیا۔ اس کا بنیادی مقصد اگرچہ حمایت اسلام اور دفاع اسلام تھا تاہم مسلمانوں کی تعلیمی بیداری اور جدید شعور کے فروغ میں بھی اس کا بڑا نمایاں حصہ ہے۔ نیز اس نے متنوع علمی، ادبی، شعری اور تاریخی خدمات بھی انجام دیں۔

انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسے ہماری علمی، ادبی، تعلیمی اور ملی تاریخ میں بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔ ہندوستان کے مایۂ ناز اہل علم اور ادباء و شعراء اس میں شریک ہوتے۔ اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے۔ ان جلسوں کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان میں سر سید احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد، مولانا حالی، مولانا شبلی، علامہ اقبال، سر محمد شفیع بیرسٹر، مرزا ارشد گورگانی، مولانا شاہ سلیمان پھلواری اور مولوی عبدالحق حقانی جیسے اہل علم اور مشاہیر نے اس کے مختلف اجلاسوں میں شرکت کی۔ علامہ اقبال اولاً اسی انجمن حمایت اسلام کے اجلاسوں میں اپنی نظموں کے ذریعہ روشناس ہوئے۔ فروری ۱۹۰۰ء میں انھوں نے پہلی بار شرکت کی اور اپنی مشہور نظم نالہ یتیم پیش کی۔ بعدازاں ڈاکٹر صاحب مدۃ العمر اس سے وابستہ رہے۔ ان کی مشہور نظمیں شکوہ، جوابِ شکوہ، فریاد امت، تصویر درد، شمع اور شاعر، طلوع اسلام اور خضر راہ وغیرہ اولاً انجمن ہی کے جلسوں میں پیش کی گئیں اور مقبول ہوئیں۔

ڈپٹی نذیر احمد بھی انجمن حمایت اسلام کے خاص مقرروں میں تھے۔ ۱۸۸۶ء میں انھوں نے انجمن کے اجلاس میں پہلی بار خطاب کیا۔ پھر وہ آخر تک شریک ہوتے رہے اور متنوع

موضوعات پر خطبے دئے۔ان کے مجموعہ خطبات میں متعدد ایسے خطبات شامل ہیں جو انھوں نے انجمن حمایت اسلام کے جلسوں میں دیئے تھے۔

علامہ شبلی نے اپنی علمی زندگی کا مقصد آغاز ہی میں حمایت اسلام اور دفاع اسلام قرار دیدیا تھا۔چنانچہ وہ مدۃ العمر ان کاموں میں سرگرم رہے۔ان کے ابتدائی دور کے تاریخی اور تحقیقی مقالات اور ایجوکیشن کانفرنس کے خطبات دراصل اسی فکروخیال کا حصہ ہیں۔اخیر دور میں تو باقاعدہ انجمن حفاظت واشاعت ہی قائم کی تھی۔چونکہ انجمن حمایت اسلام کے بنیادی موضوع سے فکر شبلی ہم آہنگ تھی اس لئے وہ اس سے کیسے دور رہ سکتے تھے۔چنانچہ انھوں نے انجمن حمایت اسلام کے کئی اجلاسوں میں شرکت کی۔مگر اس کی تفصیل سے حیات شبلی کے اوراق خالی ہیں۔مولانا سید سلیمان ندوی نے محض اس قدر لکھا ہے کہ

> ''انجمن حمایت اسلام'' لاہور کی مشہور انجمن ہے۔اکثر اکابر اس کے سالانہ جلسوں میں شریک ہوتے رہے ہیں۔مارچ ۱۸۹۵ء میں اس کے سالانہ اجلاس میں سید صاحب (سرسید) اور ان کے دیگر رفقاء نے شرکت کی۔اسی سلسلہ میں مولانا بھی تشریف لے گئے تھے۔یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ انھوں نے اس جلسہ میں کس موضوع پر تقریر کی''۔(۱)

مولانا سید سلیمان ندوی کا ماخذ دراصل علامہ شبلی کا ایک خط ہے جو مسٹر محمد شفیع کے نام لکھا گیا ہے اور جو مکاتیب شبلی حصہ اول میں شامل ہے۔علامہ شبلیؒ نے لکھا ہے کہ

> ''ہاں میں لاہور گیا تھا،انجمن حمایت اسلام کا جلسہ تھا۔سید صاحب وغیرہ سب گئے تھے۔'' (۲)

محمد حنیف شاہد نے علامہ شبلی کی کئی نادر تحریریں تلاش وجستجو کے بعد صحیفہ لاہور جنوری ۱۹۷۱ء میں شائع کی ہیں۔اس میں بھی ۱۸۹۵ء کے اجلاس کی تفصیل نہیں ہے اور انھوں نے بھی علامہ شبلی کے خطبے کا ذکر نہیں کیا ہے۔البتہ محمد حنیف شاہد نے ۱۹۰۳ء کے انجمن کے جلسہ میں علامہ شبلی کی شرکت کا ذکر انجمن کی روداد کے حوالہ سے کیا ہے اور انجمن حمایت اسلام کی روداد سے ان کا وہ خطبہ جو انھوں نے ''الاسلام'' کے عنوان سے دیا تھا نقل کر کے صحیفہ لاہور جنوری ۱۹۷۱ء میں شائع

کرادیا ہے۔ یہ خطبہ خاصا طویل ہے۔ روداد کے مرتب مولوی عبدالکریم کے مطابق یہ خطبہ تحریری تھا۔ یہی سوچ کر نقل نویسوں نے اسے نقل نہیں کیا اور علامہ شبلی نے تحریری خطبہ کے بعد بھی خطاب کیا۔ بہرحال یہ ایک مفصل خطبہ ہے۔ اس کے ذیلی عناوین یہ ہیں۔

۱- مذہب انسان کی فطرت میں شامل ہے۔

۲- مذہب اسلام

۳- عقل اور مذہب

۴- دین و دنیا یا جسمانیات اور روحانیات کا باہمی تعلق اور اس کا موازنہ

ان ذیلی عناوین سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ یہ خطبہ کس قدر اہم موضوع پر ہے۔ اس میں علامہ شبلی نے پہلے ثابت کیا ہے کہ مذہب فطری چیز ہے اور انسان اس کے بغیر زندگی گذار ہی نہیں سکتا۔ پھر اسلام کی عظمت بیان کی ہے۔ عقلی اور نقلی امور کو واضح کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی حقانیت بڑے خوب صورت اور مدلل انداز میں ثابت کی گئی ہے۔ بعد ازاں مذہب اور عقلیات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس میں اوّلاً مذاہب میں درجہ عقل کی وضاحت کی گئی ہے اور کسی کا یہ قول بھی نقل کیا گیا ہے کہ

''دنیا میں آج جس قدر مذہب موجود ہیں ان سب میں یقین کی ابتدا اس حکم سے شروع ہوئی ہے کہ مذہب میں عقل کو دخل نہ دو۔'' (۳)

اس قول کو علامہ شبلی نے جابرانہ حکم سے تعبیر کیا ہے۔ پھر اسلام اور عقل کے موضوع پر انتہائی بصیرت افروز گفتگو کی ہے اور قرآن واحادیث سے متعدد دلائل دے کر ثابت کیا ہے کہ اسلام ایک سائنٹفک مذہب ہے۔ لااکراہ فی الدین کا بھی حوالہ دیا ہے اور اس کے مفہوم کی وضاحت کی ہے۔ آخر میں جسمانیات اور روحانیات کے باہمی تعلق کی وضاحت کی ہے۔ ان کا موازنہ بھی کیا ہے اور پوری گفتگو میں کثرت سے قرآنی آیات سے استدلال کیا گیا ہے۔ بعض فرق اسلامی کا بھی اس میں ذکر آگیا ہے۔ غرض ذیلی عناوین پر بڑی مدلل گفتگو کی ہے۔ جس کا لب لباب یہ ہے کہ

''غرض خواہ نفس، مذہب، بالخصوص مذہب اسلام، خواہ خاص خاص اسلامی

عقائد جس چیز پر یقین دلانا چاہا ساتھ ہی دلیل بھی بیان کی۔ ایک جگہ نہیں کہا کہ ان عقائد کو بلا دلیل تسلیم کرو۔'' (۴)

اپنے موضوع، انداز خطابت اور دلائل و براہین کے نقطہ نظر سے علامہ شبلی کا یہ خطبہ بڑا عالمانہ ہے اور پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

انجمن حمایت اسلام کے اس اجلاس میں علامہ اقبال بھی شریک ہوئے تھے اور اپنی مشہور نظم ''فریاد امت'' اس موقع پر پیش کی تھی۔ یقیناً دونوں کے درمیان ملاقات اور رسم و رواہ کا آغاز ہوا ہوگا۔ اس قیاس کو اس بات سے مزید تقویت ملتی ہے کہ اس کے بعد علامہ اقبال کی پہلی کتاب ''علم الاقتصاد'' شائع ہوئی، جس کے ایک حصہ کی زبان و بیان کی اصلاح علامہ شبلی نے کی تھی جیسا کہ علامہ اقبال نے دیباچہ میں صراحت کی ہے۔ غالبًا انجمن کے اسی اجلاس کے موقع پر اقبال نے اصلاح لی ہوگی، کیونکہ اگر وہ کتاب کا مسودہ حیدرآباد بھیجتے جہاں علامہ شبلی اس وقت مقیم تھے تو یقینی طور پر علامہ شبلی مکمل کتاب کی تصحیح کرتے نہ کہ جزوی۔

شبلی و اقبال کی ملاقات کا سنہ علی العموم اہل قلم نے ۱۹۱۱ء ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس دہلی کو قرار دیا ہے۔ گذشتہ دنوں میں نے مقالہ ''شبلی اقبال اور دارالمصنّفین'' میں دونوں کی ملاقات کا سنہ ۱۹۰۸ء طے کرنے کی کوشش کی تھی۔ ۱۹۰۸ء میں محمڈن اینگلو اورینٹل کانفرنس کے امرتسر اجلاس میں دونوں بزرگوں نے شرکت کی تھی، جس کا ذکر کانفرنس کی ایک روداد میں مذکور ہے۔ البتہ اس روداد میں ملاقات شبلی و اقبال کی کوئی اور تفصیل موجود نہیں ہے، تاہم جب اجلاس میں دونوں شریک تھے تو ان کی ملاقات سے کیونکر انکار کیا جا سکتا ہے ؟

''مرقع اقبال'' میں پروفیسر جگن ناتھ آزاد نے ۱۹۰۴ء کی ایک تصویر شائع کی ہے۔ جس میں متعدد اشخاص کے ساتھ علامہ شبلی کی تصویر کی تصریح کی گئی ہے، مگر علامہ شبلی کی یہ تصویر ان کی دیگر تصویروں سے مختلف ہے اور کسی اور ذرائع سے اس کی تصدیق بھی نہیں ہوتی کہ ۱۹۰۴ء میں دونوں بزرگوں کی کہیں ملاقات ہوئی تھی یا دونوں کسی جلسے میں یکجا ہوئے تھے۔

اب ۱۹۰۳ء کی انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسہ میں دونوں کی شرکت اور اسی زمانہ میں ''علم الاقتصاد'' کی زبان کی شبلی کے قلم سے اصلاح سے یہ رائے قائم ہوتی ہے کہ ان دونوں

بزرگوں کی پہلی ملاقات ۱۹۰۳ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے اجلاس میں ہوئی تھی۔

۱۹۰۳ء کے بعد ۱۹۰۷ء میں انجمن حمایت اسلام لاہور کے اجلاس میں علامہ شبلی شریک ہوئے۔ یہ جلسہ ۲۹؍مارچ ۱۹۰۷ء کو صبح ۸؍بجے سے لے کر شام پانچ بجے تک جاری رہا۔ اس کے دو اجلاس ہوئے۔ پہلے اجلاس کی صدارت خواجہ ضیاء الدین [سینئر وکیل کورٹ پنجاب] نے کی، جبکہ دوسرا اجلاس مولوی حاجی الٰہی بخش [وکیل ہوشیار پور] کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس کی روداد میں لکھا ہوا ہے کہ منشی سراج الدین ایڈیٹر زمیندار لاہور کو نظم پیش کرنی تھی۔ انھوں نے معذرت کی اور کہا کہ

> ''جناب صدر انجمن وحاضرین جلسہ !
>
> اگر اس معزز اور عالی شان مجمع میں مولانا حافظ نذیر احمد خاں صاحب شمس العلماء ایل ایل ڈی، شمس العلماء مولانا مولوی شبلی صاحب اور میاں محمد شفیع صاحب بیرسٹر ایٹ لا وغیرہ رونق افروز ہوں، میرا اسٹیج پر کھڑا ہونا سورج کے دربار میں جگنو کا حاضر ہونا ہے۔'' (۵)

اس اجلاس کی روداد میں جناب محمد حنیف شاہد نے یہ صراحت بھی کی ہے کہ

> ''مولانا شبلی نے اس جلسے میں صرف شرکت ہی فرمائی، کوئی لکچر وغیرہ نہیں دیا تھا''۔(۶)

چونکہ انجمن حمایت اسلام کی روداد کا محمد حنیف شاہد نے گہرائی سے مطالعہ کیا ہے۔ کئی مضامین اور علامہ اقبال کے حوالہ سے ایک مستقل کتاب ''اقبال اور انجمن حمایت اسلام'' بھی لکھی ہے۔ باوجود اس کے ان کے مذکورہ بیان پر یقین نہیں آتا، کیونکہ علامہ شبلی اس قدر طویل مسافت یعنی اعظم گڑھ سے لاہور کا سفر بے سود طے نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن یہ بھی واقعہ ہے کہ اس سے زیادہ کوئی تفصیل دستیاب نہیں۔

علامہ شبلی انجمن حمایت اسلام کے چوبیسویں سالانہ اجلاس میں بھی شریک ہوئے۔ یہ اجلاس ۹ تا ۱۱؍اپریل ۱۹۰۹ء میں اسلامیہ کالج لاہور کے گراؤنڈ میں منعقد ہوا تھا۔ ۹؍اپریل ۱۹۰۹ء کے پہلے اجلاس کی صدارت شمس العلما مفتی عبداللہ ٹونکی نے کی۔ بعد ازاں دوسرا اجلاس

علامہ شبلی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ انجمن حمایت اسلام کے جنرل سکریٹری نے علامہ شبلی کی صدارت کا اعلان ان الفاظ میں کیا :

''اس اجلاس کے صدر علامہ زماں مولانا مولوی شبلی صاحب نعمانی ہیں۔ جن کی نسبت مجھے زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں۔ آپ کی نیابت میزبانی اور بڑا احسان ہے کہ اس جلسے میں تشریف لائے۔ گو آپ کے استمزاج کے بغیر آپ کو صدر جلسہ ہونے کی تکلیف دی گئی، مگر آپ نے اس کو منظور فرما کر ہمیں عزّت بخشی، جس کے لئے ہم ان کے نہایت ہی شکر گذار ہیں''۔ (۷)

اس اجلاس میں سر شیخ عبدالقادر بیرسٹر ایٹ لا، خلیفہ عمادالدین اسسٹنٹ انسپکٹر مدارس حلقہ لاہور، حافظ مولوی محمد ابراہیم ایڈیٹر الہادی سیال کوٹ نے اپنے اپنے خطبات وخیالات پیش کئے۔ (۸) اور اسی پر اجلاس ختم ہوا۔ اس اجلاس میں کی گئی علامہ شبلی کی صدارتی تقریر کی تفصیل سے انجمن کی روداد خالی ہے اور ابتک کہیں اس کا سراغ نہیں لگا ہے۔

تیسرے روز یعنی ۱۱/اپریل ۱۹۰۹ء کو دوسرے اجلاس کی صدارت میاں نظام الدین [باغبان پورہ] نے فرمائی۔ اس میں بھی کئی اہل علم نے خطاب کیا۔ آخری خطاب علامہ شبلی کا تھا۔ اس اجلاس کے ناظم مولوی احمد بابا تھے۔ انھوں درج ذیل الفاظ میں علامہ شبلی کو خطبہ پیش کرنے کی دعوت دی:

''صاحبان! اب اس وقت شمس العلماء مولانا شبلی، ابن خلدون ثانی، فاضل موزعی وعالم یلمعی، جامع فروغ واصول، اسم بامسمیٰ شبلی نعمانی کا خطاب ہے۔ جن کے دیدار فیض آثار کے لئے ہماری آنکھیں ترستی اور ان کے کلام معجز بیان سننے کے لئے کان اسی طرح منتظر شنیدن ہیں جس طرح گوش روزہ دار بر اذان۔''

بعد ازاں علامہ شبلی نے تعلیم وتربیت کے موضوع پر اجلاس سے خطاب کیا اور قرآن، احادیث اور واقعات تاریخ وسیر سے مدلل ومزین بڑی پُر جوش اور پر اثر تقریر کی، جس نے مجمع کو بہت متاثر کیا۔ یہاں تک کہ دورانِ خطاب ہی خان بہادر میاں محمد شفیع اُٹھ کھڑے ہوئے اور مجمع سے مخاطب ہو کر کہا کہ

''جوسنہری اصول اور قابل قدر بات مولانا صاحب شبلی نے نوجوان مسلمانوں کے لئے فرمائی ہے، میں اس کا صدق دل سے نوجوان مسلمانوں کی طرف سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔نوجوانوں میں مذہب کی طرف سے یہ غفلت شرم کے ساتھ تسلیم کرنی پڑتی ہے اور اس کی وجہ موجودہ طرز تعلیم کا خراب اثر ہے، جس کے باعث مذہبی واقفیت کا بالکل موقع نہیں مل سکتا۔ یہ ہمارا قصور نہیں ہے۔اگر ہمارا قصور ہوتا تو اس کا بھی میں اقبال کرتا۔اس زمانے میں اسی قسم کے طرز تعلیم کا رواج ہے، جس پر ہمارے بزرگوں کی مجبوری ہے کہ وہ ہم کو ایسے ہی مدرسے میں بھیجتے ہیں جہاں ہمارے اخلاق پر اس قسم کے اثر پڑتے ہیں۔جن طلبہ کو کچھ کچھ دینی معلومات حاصل ہیں وہ اپنی خانگی تعلیم کے ذریعہ سے اس سے مستفید ہیں۔ مدرسوں میں تو اس تعلیم کا نام ونشان بھی نہیں ملتا اور اب اس کا قریباً خاتمہ ہوتا جاتا ہے۔ کیونکہ وہ معلومات بظاہر ہمارے بزرگوں ہی تک محدود نظر آتے ہیں۔اگلی نسل کی نسبت اس قدر واقفیت کی بھی امید نہیں پڑتی۔میں آپ کو صدق دل سے بتاتا ہوں اور میرا ایمان ہے کہ اگر ہمارے مذہب کا ہمارے دلوں سے جوش جاتا رہا تو ہماری قوم (خدانخواستہ) تباہ ہوجائے گی''۔(۱۰)

اس درمیانی اور ناگہانی گفتگو کے بعد علامہ شبلی نے دوبارہ خطاب شروع کیا اور دیر تک خطاب کرتے رہے۔تعلیم وتربیت کے موضوع پر یہ علامہ شبلی کا ایک اہم خطبہ ہے۔جن لوگوں نے علامہ شبلی کا خطبہ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم کا مطالعہ کیا ہے، ان کے ذخیرہ معلومات میں یہ خطبہ یقینی طور پر ایک قیمتی اضافہ ہے۔

فروغ علم وادب کے خیال سے انجمن حمایت اسلام نے علمی وادبی کتابوں کی اشاعت کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا اور متعدد اہم کتب شائع کی تھیں۔اس کی فہرست میں علامہ شبلی کی کتابیں بھی شامل ہیں۔انجمن حمایت اسلام نے علامہ شبلی کی سیرۃ النعمان، الفاروق، الغزالی اور شعرالعجم کی پانچوں جلدوں کو شائع کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ انجمن کی فہرست کتب میں سب سے زیادہ علامہ شبلی ہی کی تصنیفات شامل ہیں۔اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ علامہ شبلی کا انجمن حمایت اسلام لاہور

سے کس نوعیت کا تعلق تھا۔

انجمن حمایت اسلام لاہور کی رودادیں مجھے دستیاب نہ ہوسکیں ورنہ اور بھی تفصیلات ملتیں۔خاص طور پر علامہ شبلی کی انجمن سے جو خط وکتابت ہوئی ممکن ہے اس کی تفصیل رودادوں میں کہیں مل جائے۔بہر حال علامہ شبلی اور انجمن حمایت اسلام بھی مطالعہ کا ایک موضوع تھا، جس کی طرف سوائے محمد حنیف شاہد کے کسی اور اہل قلم نے توجہ نہیں کی۔واقعہ یہ ہے کہ زمانہ کی دست برد سے جو چیزیں بچ بچا کر مجھ تک پہنچیں میں نے انھیں اس مقالہ میں جمع کر دیا ہے، یقین ہے یہ مضمون اس نوع سے مطالعہ شبلی کا نقطۂ آغاز ثابت ہوگا اور علامہ شبلی کی انجمن حمایت اسلام کے سلسلہ کی خدمات کو بھی روشنی میں لائے گا۔

حوالے

۱- حیات شبلی ص ۲۸۹، سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڈھ، ۲۰۱۵ء

۲- مکاتیب شبلی، سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڈھ، ۲۰۱۰ء

۳- نوادرات شبلی ص ۸۵، محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڈھ، ۲۰۱۷ء

۴- ایضاً ص ۸۹

۵- روداد انجمن، ماہ جولائی ۱۹۰۷ء، اسلامیہ اسٹیم پریس لاہور ص ۴۶، بحوالہ صحیفہ لاہور، جنوری ۱۹۷۱ء، ص ۶۲

۶- ایضاً ص ۶۳

۷- ایضاً

۸- ایضاً ص ۶۳-۶۶

۹- ایضاً ص ۶۷

۱۰- ایضاً ص ۷۱

ooo

[۱۱]

علامہ شبلی اور کلکتہ

کلکتہ دنیا کے عظیم ترین شہروں میں سے ایک ہے۔اس کی خاک سے متعدد اہل علم اور ارباب کمال اٹھے،جن کی ضیا پاشیوں سے آسمان علم وادب اب تک منور ہے۔

ہماری ادبی تاریخ میں جس طرح مرزا غالب زندہ جاوید ہیں اسی طرح ان کا یہ شعر بھی ہمیشہ زندہ رہے گا۔

کلکتے کا جو ذکر کیا تو نے ہم نشیں
اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ صرف غالب ہی کلکتہ کے لئے دلفگار نہیں رہے۔سیرۃ النبیؐ کے مصنف علامہ شبلی بھی اس پر دل و جان سے فدا تھے۔ان کے دسیوں مکتوبات میں کلکتہ کے لیے بے تابی اور بے قراری کا اظہار ہوا ہے اور دسیوں بار وہ کلکتہ گئے۔اس کے متعدد اسباب میں مشہور شاعر سید رضا علی وحشت سے تعلق خاطر،مولانا ابوالکلام آزاد سے موانست کے جذبات اور مولوی شرف الدین سے مراسم تو تھے ہی،ایک نامعلوم کشش برج خا کی سے بھی تھی۔علاوہ ازیں دلچسپی کے اور بھی اسباب تھے۔ایشیاٹک سوسائٹی سے علمی تعلق،مسلم انسٹی ٹیوٹ اور مدرسہ عالیہ سے لگاؤ اور تحریک وقف علی الاولاد کے لئے جنرل کونسل کے اراکین سے ربط وضبط،علامہ شبلی کو بار بار کلکتہ کھینچ لے جاتے تھے۔انہوں نے کتنی بار کلکتے کا قصد کیا صحیح تعداد معلوم نہیں۔البتہ چند اسفار کا ذکر ان کے مکاتیب کے گہرے مطالعہ سے ضرور سامنے آتا ہے۔وجہ چاہے جو بھی ہو لیکن یہ اسفار اصلاً ان کی کلکتہ سے شیفتگی اور دلچسپی ہی کا نتیجہ تھے۔

کلکتہ سے علامہ شبلی کی دلچسپی کا پہلا محور رائل ایشیاٹک سوسائٹی تھی۔ان کا ذوق علم بار ہا

ایشیاٹک سوسائٹی کھینچ کر لے گیا اور انہوں نے اس سے بھر پور استفادہ کیا۔ خاص طور پر اس کی نادر و نایاب کتابوں کا مطالعہ کیا۔ ان کی علمی و ادبی جستجو اور بلند پایہ علمی حیثیت کی بنا پر ۱۸۹۵ء میں رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے انہیں اپنا رکن نامزد کیا۔ پھر تو وہ اکثر اس کے اجلاسوں میں شریک ہونے لگے۔ ان کے مفید مشوروں سے رائل ایشیاٹک سوسائٹی نے فائدہ بھی اٹھایا۔ نواب سید علی حسن خاں [۱۸۶۶ - ۱۹۳۶ء] اور نواب حبیب الرحمٰن خاں شروانی [۱۸۶۴ - ۱۹۵۰ء] کو ایشیاٹک سوسائٹی کا رکن بنائے جانے کی قراردادیں انہیں نے پیش کی تھیں جو منظور ہوئیں۔ نواب سید علی حسن خاں نے اپنی خودنوشت ''تذکرہ طاہر'' میں اس کا اعتراف کیا ہے۔ (۱)

۱۹/دسمبر ۱۹۰۶ء کو علامہ شبلی کلکتہ میں تھے۔ ان کا قیام شہر کلکتہ، امرتلا لین نمبر ۱۳ میں تھا۔ وہیں سے مہدی حسن افادی کو ایک خط میں لکھا کہ:

> ''خان خاناں کی نہایت مبسوط لائف (مآثر رحیمی) اسی زمانے کی تصنیف سوسائٹی میں ہے، آجکل اس کے مطالعہ سے لطف اٹھا رہا ہوں۔'' (۲)

کلکتہ کے اسی سفر میں ان کو دوبارہ لکھا کہ:

> ''اس سفر میں آپ کے نہ ہونے کا سخت افسوس ہے، شاہ صاحب تو عشق مجازی سے بھی کوسوں دور ہیں۔ وہ کیا ساتھ دیں گے۔ وہاں تو ہاتھ کے سوا آنکھ کا بھی کام نہیں۔ خان خاناں کا تذکرہ دیکھ کر واقعی مفت خوری کا بار بار تقاضا ہوتا ہے کہ بے ہاتھ پاؤں ہلائے مفت مال ہاتھ آتا ہے۔'' (۳)

یہ شاہ صاحب جو بقول علامہ شبلی عشق مجازی سے کوسوں دور تھے، معلوم نہ ہو سکا کہ کون شخص تھے۔؟

مذکورہ بالا خط میں کلکتہ کے علمی ذخائر کا بھی تذکرہ کیا ہے اور لکھا ہے کہ:

> ''ڈاکٹر راس نے اسلامی لٹریچر اور صنائع کے بڑے نوادر جمع کیے ہیں، ان میں اورنگزیب کے ہاتھ کا قرآن مجید بھی ہے۔ زیب النساء اور داراشکوہ کی تحریریں بھی ہیں۔ کاش آپ آسکتے۔'' (۴)

ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ کے مخطوطے مآثر رحیمی کا جس کے مطالعہ کا وہ اس وقت لطف اٹھا

رہے تھے بالآخر یہ لطف انہوں نے عام کر دیا، یعنی اس پر ایک مفصل ریویو لکھا اور ماہ نامہ الندوہ لکھنو (اپریل ۱۹۰۷ء ص ۳-۱۶) میں شائع کیا۔ (۵)

کلکتہ کے لیے ان کی بے قراری کا اندازہ درج ان کے ذیل خطوط کے اقتباسات سے لگایا جا سکتا ہے:

۱۔ میں کلکتہ جا رہا ہوں۔ (۱۲ر دسمبر ۱۹۰۶ء (۶)

۲۔ کلکتہ جانا ہے۔ (۱۸ر جنوری ۱۹۱۰ء (۷)

۳۔ کلکتہ جاؤں گا۔ (۱۳ر اپریل ۱۹۱۱ء) (۸)

۴۔ ممکن ہے آج کل میں کلکتہ چلا جاؤں۔ کلکتہ کا پتہ: شبلی، مکلا وڈ اسٹریٹ نمبر ۱۳، کلکتہ، (۱ر مارچ ۱۹۱۲ء (۹)

۵۔ ڈھاکہ یونیورسٹی میں کمیٹی ہے، کل کلکتہ جاؤں گا۔ (۲۵ر جولائی ۱۹۱۲ء (۲۰)

۶۔ کلکتہ آنے کا سو سو بار جی چاہتا ہے، لیکن کیا کروں، سیرت کے لیے کتابوں کی کئی الماریاں ساتھ رکھنی پڑتی ہیں، ان کو کہاں لیے پھروں۔ (۲۰ر اگست ۱۹۱۳ء (۱۱)

۷۔ اگر مناسب ہو تو میں کلکتہ سے پٹنہ کا دورہ بھی کر سکتا ہوں۔ (۱۱ر مارچ ۱۹۱۴ء (۱۲)

علامہ شبلی کے مکاتیب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ درج ذیل تاریخوں میں کلکتہ میں تھے:

۱۔ ۱۹ر دسمبر ۱۹۰۵ء کو علامہ شبلی کلکتہ میں تھے۔ اپنے دوست ریاض حسن خاں خیال کو کلکتہ سے خط لکھا۔ (۱۳)

۲۔ علامہ شبلی ۲ر دسمبر ۱۹۰۶ء کو کلکتہ میں مقیم تھے، یہاں سے مولوی احسن اللہ خاں ثاقب کو خط لکھا۔ (۱۴)

۳۔ ۵ر جون ۱۹۰۹ء کو مولانا آزاد کو لکھتے ہیں:

''کلکتہ گیا۔ ایک خاص کام تھا۔ مولوی شرف الدین کے یہاں ٹھہرا۔ دلچسپیوں کی نئی راہیں نکلیں۔ لیکن

چہ حظ خضر برد از عمر جاوداں تنہا

ایک ہفتہ رہ کر واپس آیا۔'' (۱۵)

۴۔ علامہ شبلی ۲۶؍مئی ۱۹۱۰ءکوکلکتہ میں تھے۔(۱۶)

۵۔ ۳۰؍مئی ۱۹۱۰ء کو کلکتہ میں مقیم تھے۔مولانا حمید الدین فراہی کو وہیں سے خط لکھا۔(۱۷)

۶۔ جون ۱۹۱۰ءکوکلکتہ میں تھے۔ایک خط میں لکھا کہ:

''شدت گرمی سے کلکتہ بھاگ گیا تھا اور واقع میں وہاں بہت آرام تھا۔''

۸؍جون ۱۹۱۰ءکوواپس آئے۔(۹؍جون ۱۹۱۰ء۔(۱۸)

۷۔ ۲؍مارچ ۱۹۱۲ءکوکلکتہ پہنچے۔(۲۳؍جنوری ۱۹۱۳ء۔(۱۹)

مذکورہ بالاخطوط سے گوعلامہ شبلی کی کلکتہ میں موجودگی کاعلم ہوتا ہےلیکن وہاں کی سرگرمیوں کی تفصیل نہیں ملتی۔البتہ علامہ شبلی کلکتہ کے بعض اہل علم ،ارباب کمال اوررؤسا سے اچھی طرح واقف تھے، بلکہ ان سے گہرے روابط بھی تھے۔مولوی شرف الدین کا اوپر ذکر آچکا ہے۔مولانا شمس الہدیٰ اورمولوی محمد یوسف صاحبان کےعلم وفضل کے بھی وہ بڑے معترف ومداح تھے۔یہی وجہ ہے کہ ان کے نام انھوں نے ارکان ندوہ میں شامل کرنے کی غرض سے ندوہ کی مجلس انتظامیہ میں پیش کئے تھے۔۸؍مارچ ۱۹۱۰ء،(۲۰)

شمس العلما مولوی ہدایت حسین[۱۸۸۷-۱۹۴۳] پرنسپل مدرسہ عالیہ کلکتہ کی شخصیت اور ان کےعلم وفضل سے بھی وہ واقف تھے۔(۲۱)اسی طرح وہ مولوی فضل حق کےعلم وفضل کے بھی بڑے قائل تھےاورانہیں ندوہ کا صدر مدرس بنانا چاہتے تھے۔(۲۲) خان بہادر مرزا شجاعت علی خاں صاحب رئیس کلکتہ سے بھی وہ واقف تھے۔مرزا صاحب ان کے زمانہ سکریٹری شپ انجمن ترقی اردو کےاراکین میں شامل ہوئے اور مالی مدد کی۔(۲۳)

انجمن ترقی اردو کی جدوجہد کے زمانہ میں کلکتہ کے متعدد اہل علم علامہ شبلی کے رابطہ میں رہے۔کلکتہ کے ایک بزرگ قاضی عبداللطیف تھے جوحبل المتین کلکتہ کے ایڈیٹوریل اسٹاف میں تھے۔انہیں سائنس سے خاص دلچسپی تھی اور کلکتہ ہائی کورٹ کے سند یافتہ مترجم تھے۔انہوں نے علامہ شبلی کوخط لکھا کہ:

''میں اگر چہ متمول نہیں ہوں،لیکن فیاض دل واقع ہوا ہوں۔آپ مجھ سے بلا

اجرت سائنس کی کتابوں کا ترجمہ کرا سکتے ہیں اور میں نہایت خوشی سے اپنی خدمات کو آپ کی انجمن میں وقف کرتا ہوں۔'' (۲۴)

علامہ شبلی کی کلکتہ میں مانگ بھی رہتی تھی۔ایک خط میں ذکر ہے کہ کلکتہ کانفرنس میں بلاوا ہے۔ (۲۵) یہ نہیں معلوم ہوسکا کہ اس بلاوے پر علامہ شبلی وہاں تشریف لے گئے یا نہیں۔البتہ ایک اور خط میں جس پر تاریخ درج نہیں ہے اور وہ کلکتہ سے مہدی حسن افادی کو لکھا گیا ہے، اس قدر تصریح ہے کہ ''مسلمان اور فن تاریخ'' کے عنوان سے آج میرا لکچر ہے۔ (۲۶) یہ لکچر کہاں ہوا؟ اور اس میں کون لوگ شریک تھے۔؟ اس کی تفصیلات دستیاب نہیں۔

راجپوتانہ وغیرہ کے ارتداد سے پریشان ہوکر اس کے سد باب کے لئے علامہ شبلی نے اشاعت اسلام کا ایک وسیع تر منصوبہ بنایا اور جلد ہی اس کا آغاز کر دیا۔اس سلسلہ میں انھوں نے مختلف شہروں میں احباب کو خطوط لکھے اور اخبارات ورسائل میں مضامین شائع کئے۔ایک پمفلٹ تیار کرا کے مختلف شہروں میں تقسیم کرایا۔اشاعت اسلام کے سلسلہ میں علامہ شبلی ۲/ مارچ ۱۹۱۲ء کو کلکتہ گئے اور پمفلٹ تقسیم کرائے۔منصوبہ اشاعت اسلام میں ان کے مددگار مولانا سید سلیمان ندوی[۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] تھے۔ان کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''عزیزی! میں کل کلکتہ پہنچا۔شاید دو تین دن قیام ہو۔اشاعت (اسلام) کا کام یہاں شروع کرا دینا چاہتا ہوں۔'' (۲۷)

خدا جانے اشاعت اسلام کا یہ کام کلکتہ میں شروع ہوا یا نہیں؟ اور اگر ہوا تو کس قدر ہوا اور اس میں کون لوگ شامل تھے۔؟ اس کی کہیں تصریح نہیں ملتی۔

علامہ شبلی کا ایک بڑا عظیم الشان کارنامہ وقف علی الاولاد کو قانون کا درجہ دلانے کی تحریک بھی ہے۔یہ تحریک انھوں نے ۱۹۰۸ء میں وقف علی الاولاد پر انگریز ججوں کے غلط فیصلوں سے متاثر ہوکر شروع کی تھی۔اس کا مقصد قانون وقف علی الاولاد انگریزی حکومت سے منظور کرا کے مسلمانوں کی موقوفہ جائدادوں کا بقا وتحفظ تھا۔اس کے لیے انھوں نے رسالہ وقف علی الاولاد لکھا۔ایک استفتاء تیار کرا کے علما سے فتاوے حاصل کیے اور تمام ہندوستان کے علماء اور قانون دانوں کے پاس استفتاء اور رسالہ بھیج کر ان کی تائید حاصل کی۔حمایت حاصل کرنے اور اسے عوامی مسئلہ

بنانے کے لئے ایک فارم تیار کرا کے سیکڑوں افراد کے دستخط حاصل کئے۔ رسالہ وقف علی الاولاد وغیرہ انھوں نے کلکتہ کے علماء وقانون دانوں کے پاس بھی بھیجے اور اس سلسلہ میں ان سے خط وکتابت کی۔

نواب سید امیر حسن خاں سٹی مجسٹریٹ کلکتہ نے علامہ شبلی نعمانی کی اس تحریک وقف علی الاولاد سے اتفاق کیا اور ہر طرح کی مدد کا وعدہ کیا۔(۲۸) مولوی محمد یوسف صاحب وکیل کلکتہ جنہیں وقف علی الاولاد کے مسئلہ پر علامہ شبلی سے پہلے توجہ دینے کا فخر حاصل ہے، انھیں بھی خط لکھ کر تحریک وقف علی الاولاد کی طرف متوجہ کیا اور ان کی نہ صرف تائید حاصل کی بلکہ انہیں انجمن وقف علی الاولاد کا رکن بھی نامزد کیا۔ اپنا رسالہ وقف بھی بھیجا، چنانچہ انھوں نے متعدد مفید مشورے بھی دئے۔(۲۹)

ان کے علاوہ بعض دیگر مشاہیر کلکتہ سے بھی علامہ شبلی نعمانی نے رابطہ کیا۔ کلکتہ ہی نہیں قرب وجوار کے مشاہیر سے بھی رابطہ قائم کیا۔ چنانچہ مرشدآباد کے نواب فضل ربی [پ:۱۸۴۸ء -انتقال: نامعلوم] سے بھی خط وکتابت کی اور انھوں نے بھی انجمن تحریک وقف علی الاولاد کی حمایت کی۔(۳۰)

اپنے موضوع پر پہلی کتاب ''مغل اور اردو'' کے مصنف نواب نصیر حسین خیال [۱۸۸۰-۱۹۳۴ء] اگرچہ عظیم آبادی تھے، لیکن ان کا قیام اور شعری وادبی سرگرمیوں کا مرکز ایک عرصہ تک کلکتہ ہی رہا۔ ان کی مشہور کتاب ''داستان اردو'' جس کا ایک باب ''مغل اور اردو'' کے نام سے شائع ہوا ہے۔ کلکتہ ہی میں لکھی گئی۔ ان سے بھی علامہ شبلی کی شناسائی تھی۔ وقف کے سلسلہ میں ان سے بھی خط وکتابت ہوئی۔ انھوں نے علامہ شبلی کو ایک خط میں لکھا کہ:

> ''فقیر ہر طرح کی مدد کے لئے حاضر ہے اور کلکتہ بلکہ صوبہ بہار و بنگال کے متعلق جو خدمت ہمارے سپرد کی جائے گی اس کی انجام دہی اپنا فرض سمجھے گا۔''(۳۱)

چونکہ اس وقت جنرل کونسل کے ممبران کا قیام اور حکومت کا مرکز کلکتہ ہی تھا، اس لئے انھیں کلکتہ کا بارہا سفر کرنا پڑا اور لوگوں سے رابطہ قائم کرنا پڑا۔ اسی زمانہ میں امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد نے خدا جانے کس پس منظر میں انھیں رنگون چلنے کی دعوت دی۔ اس کے جواب میں علامہ

شبلی نے لکھا کہ

''رنگون نہیں کلکتہ آ سکتا ہوں۔ وقف کے مسئلہ میں شاید وہاں کچھ کامیابی مل سکے۔'' (۳۲)

اپنے شاگرد اور تاریخ گجرات کے مصنف مولانا سید ابوظفر ندوی کو ایک خط میں لکھا کہ ''وقف اولاد کا ڈیپوٹیشن عنقریب کلکتہ جائے گا''۔ (۳۳) ایک دوسرے خط میں لکھا کہ ''میں وقف اولاد کا ڈیپوٹیشن لے کر کلکتہ جا رہا تھا، ہوم ممبر (وہاں سے) چل دئے۔ اب شاید تاریخ بدل جائے۔'' (۳۴) مولانا حبیب الرحمان خاں شروانی کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''الہ آباد سے کلکتہ گیا اور تمام وائسرائے کونسل کے ممبروں کو ایک جلسہ میں جمع کرا کے تمام مراتب طے کر دئے۔ ان شاء اللہ اسی مہینہ میں بل (وقف علی الاولاد) حسب مراد پاس ہو جائے گا اور سب کمیٹی بیٹھ جائے گی۔'' (۳۵)

اس سلسلہ میں انہوں نے کئی بار کلکتہ کی خاک چھانی اور اپنے احباب کو بھی اس کی طرف متوجہ کرتے رہے۔ بالآخر انہیں کامیابی ملی اور قانون وقف علی الاولاد پاس ہوا۔ اس کی روداد بہت طویل ہے، اس لئے اس سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

اخیر دور میں علامہ شبلی نے جو قومی و ملی اور فکاہیہ نظمیں الہلال اور ہمدرد وغیرہ میں لکھیں۔ اس میں حکومت کے خلاف باغیانہ تیور کہیں کہیں عیاں ہو گئے ہیں۔ کلکتہ ہی کے کسی پبلشر نے قومی نظموں کا ایک مجموعہ شائع کیا تھا، جس میں ایک نظم علامہ شبلی کی بھی شامل تھی۔ اسے حکومت نے ضبط کر لیا۔ (۳۶) اس مجموعہ کی تفصیلات ابتک دستیاب نہیں ہو سکی ہیں کہ اس کا نام کیا تھا؟ اور اس میں کن شعراء کی نظمیں شامل تھیں۔؟ اور خود علامہ شبلی کی کون سی نظم شامل تھی۔؟ اب اسے کلکتہ کے اہل علم ہی بتا سکتے ہیں۔

علامہ شبلی کے کلکتے سے ربط وتعلق کی داستان ان کے دو محبوں کے ذکر کے بغیر پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتی۔ ان میں ایک سید رضا علی وحشت [۱۸۸۱-۱۹۵۶] کی شخصیت ہے اور دوسری امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد [۱۸۸۸ء-۱۹۵۸ء] کی ذات گرامی ہے۔

سید رضا علی وحشت سے ان کے بڑے گہرے مراسم وتعلقات تھے۔ اس کا آغاز کب ہوا

اس کی تفصیل دستیاب نہیں، البتہ اس کے شواہد ملتے ہیں کہ دونوں میں خط وکتابت رہی۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ سب سے پہلے وحشت ہی نے علامہ شبلی کی شخصیت اور خدمات پر انگریزی میں مقالہ لکھا جو (Morning News) مارننگ نیوز کلکتہ میں ۱۹۰۹ء میں اس کے خاص ایڈیشن میں شائع ہوا اور پسند کیا گیا۔ اس مضمون کی صحیح تاریخ اشاعت معلوم نہیں ہوسکی۔

دیوان وحشت [مطبوعہ: ۱۹۱۰ء] جب شائع ہوا اور اسے علامہ شبلی کی خدمت میں انھوں نے بھیجا تو علامہ شبلی نے ان کے شعری کمالات کی کھل کر داد دی اور لکھا کہ:

''آپ کے کلام میں من حیث الاغلب ،جدت ،ندرت اور پختگی ہوتی ہے۔ غالب اور مومن کی ترکیبیں اور طرز آپ سے خوب بن پڑتی ہے۔'' (۳۷)

مسلم انسٹی ٹیوٹ مسلمانان کلکتہ کا بڑا اہم اور تاریخی ادارہ ہے ۔اس نے اپنے ایک اجلاس میں علامہ شبلی کو مدعو کیا۔ چنانچہ علامہ شبلی اس اجلاس میں شریک ہوئے اور خطاب بھی کیا۔ یہ خطاب کس موضوع پر تھا معلوم نہ ہوسکا۔ ممکن ہے اس کی تفصیل مسلم انسٹی ٹیوٹ کی کسی روداد میں کہیں رقم ہو، جو راقم کو دستیاب نہیں ہوسکی ہے۔ علامہ شبلی غالباً وحشت ہی کی خواہش پر شریک ہوئے تھے۔ اس موقع پر وحشت نے فارسی میں ایک استقبالیہ نظم پیش کر کے علامہ شبلی کا پرجوش استقبال کیا۔ اس کے ایک ایک مصرعے سے ان کی عقیدت شبلی ظاہر ہوتی ہے۔ فرماتے ہیں:

نوید عیش رسانید پیک فرخ فال — بخویش از طرب اے مسلم انسٹی ٹیوٹ ببال
کدام نوگل مہر و وفا دمید ایں جا — کہ بوئے روح فزائش زدل ربودہ ملال
کدام صاحب علم وہنر رسید ایں جا — کہ بہر دیدن او جمع گشتہ اہل کمال
کدام مخزن صدق و صفا قد آرا شد — کہ ہم چو آئینہ بر جائے ماندہ آب زلال
کدام ماہر فن سخن زبان بکشود — فرو چکید گہر ہائے بے عدیل و مثال
مگر بیامدہ علامہ زماں شبلی — کہ دارد از نفس شاہد کمال جمال
فدائے معنی رنگین و نکتہ سنجی او — کہ آفریں ز زباں ہا نما بد استقلال
بلا کہ شوخی تحریر و حرف گفتن او — چناں بود بعاشق رسد پیام وصال
زہے صفائی کلام ولطافت سخنش — بداں رسد کہ بفریاد آید آب زلال

کشود لب بہ ثنایش رضا علی وحشت
کہ اعتقاد قوی دارد او باہل کمال(۳۸)

۱۸نومبر۱۹۱۴ءکوعلامہ شبلی نے ۵۷ سال کی عمر میں چند دن کی بیماری اسہال میں وفات پائی۔ ہندوستان کے مختلف گوشوں میں ان کی کم عمری کی موت پر بڑاماتم ہوا۔متعدد شعرا نے مراثی و قطعات لکھے۔علامہ اقبال نے پہلے تاریخ کہی۔پھرایک نظم ''حالی وشبلی'' لکھ کرخراج عقیدت پیش کیا۔ان کی موت پر کلکتہ میں سید رضا علی حشت نے بھی آنسو بہائے، بلکہ سب کو رلایا۔واقعہ یہ ہے کہ یہ صرف وحشت کے آنسونہیں تھے بلکہ کلکتہ اور اہل کلکتہ کے آنسو تھے۔اس کے ایک ایک شعر سے حزن وملال ٹپکتا ہے۔مرثیہ ملاحظہ ہو:

آہ از وفات شبلی شیوا بیان ما	خوں می چکد زناصیہ داستان ما
غیر از متاع درد مخواہ از دکان ما	ماخستگاں خنجر جور زمانہ ایم
ہے ہے چو روئے کفر سیہ شد جہان ما	اسلامیان بہ ماتم شبلی نشستہ اند
کز رفتنش برفت اثر داستان ما	زین بزم آں مورخ بالغ نظر گذشت
شد پائمال جور زخزاں گلستان ما	آں نو بہار گلشن صدق وصفا نماند
بامنزل آشنا نہ شود کاروان ما	آں خضر پے خجستہ کجا رفت ظاہر است
شد بے چراغ مجلس عشرت نشان ما	آں نکتہ دان بزم تغزل کجا شتافت
ایراں بہ رشک بود زہندوستان ما	از قند پا رسی کہ زلب ہاش می چکید

صد حیف آں ادیب اریب از میاں بہ رفت
وحشت نہ ماند لذت کام ودہان ما(۳۹)

علامہ شبلی کے کلکتہ سے ربط وتعلق کی داستان اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتی جب تک امام الہند مولانا ابوالکلام آزاد سے ان کے مراسم وتعلق کا ذکر نہ کیا جائے،لیکن یہ داستان اس قدر طویل ہے کہ اس پر ایک اہل قلم نے کتابچہ شائع کرایا ہے،اس لئے اس داستان ربط وتعلق کا اختصار سے ذکر کیا جاتا ہے۔

امام الہند نے۱۹۰۳ءمیں جب کلکتہ سے۱۴برس کی عمر میں ماہنامہ لسان الصدق جاری کیا

تو اس کی سرپرستی کے لئے جو شخصیت سب سے آگے آئی وہ علامہ شبلی نعمانی کی شخصیت تھی۔ خود مولانا ابوالکلام آزاد نے لسان الصدق کے محسنین میں ان کا نام سرفہرست لکھا ہے۔ علامہ شبلی اس زمانہ میں ناظم سررشتہ علوم وفنون حیدرآباد کے عہدہ پر فائز تو تھے ہی انجمن ترقی اردو کے سکریٹری بھی تھے، چنانچہ انہوں نے نہ صرف انجمن کی رپورٹیں اور خبریں لسان الصدق میں اشاعت کے لئے بھیجیں بلکہ ایک خط لکھ کر تمام اراکین انجمن کو لسان الصدق کی طرف متوجہ کیا اور اسے انجمن ترقی اردو کا آرگن قرار دے دیا۔ (۴۰) علامہ شبلی کے اس التفات کی وجہ سے نہ صرف لسان الصدق کے خریداروں کی تعداد بڑھ گئی بلکہ اہل ذوق خود آزاد کی طرف ملتفت ہوئے۔ غالباً آزاد سے اہل علم کا یہ پہلا عمومی التفات تھا۔

۱۹۰۴ء میں لسان الصدق بند ہوا تو مولانا آزاد نے علامہ شبلی کی خواہش پر چند ماہ ماہنامہ الندوہ کے جوائنٹ ایڈیٹر کے فرائض انجام دیئے اور علامہ شبلی کے ساتھ لکھنؤ ہی مقیم رہے۔ یہاں دونوں کی ہر وقت کی یکجائی نے ان کے تعلقات میں اور پختگی بلکہ جذباتیت پیدا کردی۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ تعلقات اتنے گہرے ہوگئے کہ مدۃ العمر اس کے شیشے میں بال نہیں آیا۔ مولانا آزاد نے اپنی خودنوشت میں اس دور کی محفلوں کا بڑی حسرت سے ذکر کیا ہے۔ (۴۱)

مولانا آزاد علامہ شبلی سے بے حد متاثر ہوئے۔ بعد میں علمی وادبی سے بڑھ کر فکری لحاظ سے بھی وہ علامہ شبلی کے نمائندہ قرار پائے۔ عالم خوندمیری نے مولانا ابوالکلام آزاد ہی کو علامہ شبلی کا اصل وارث قرار دیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس کا خود انہوں نے کبھی کھل کر اعتراف نہیں کیا، البتہ وہ علامہ شبلی کے کارناموں کے بے حد مداح تھے۔ ان کی تصنیف وتالیف، خطابت اور ان کی تحریکات بالخصوص تحریک وقف علی الاولاد وغیرہ کی انھوں نے بے حد تعریف وتحسین کی ہے جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

مولانا ابوالکلام آزاد نے الہلال جاری کیا تو علامہ شبلی نے اس میں قومی، ملی اور فکاہیہ نظمیں لکھیں جو بے حد پسند کی گئیں اور یہ الہلال کا بے حد اہم حصہ قرار پائیں۔ الہلال کلکتہ کو یہ شرف بھی حاصل ہے کہ علامہ شبلی کے بعض علمی وعملی منصوبوں جیسے دارالمصنّفین کے قیام اور سیرۃ النبیؐ کی تالیف وغیرہ کا آوازہ اسی کے صفحات سے بلند ہوا، جو علامہ شبلی کی آزاد اور الہلال سے

بڑھی ہوئی دلچسپی کا پتہ دیتا ہے۔

کلکتہ کے حوالہ سے ان دونوں بزرگوں کے مراسم کی ایک داستان مکاتیب شبلی میں بھی موجود ہے۔ یہاں اس کی ایک جھلک پیش کی جاتی ہے۔ علامہ شبلی ایک خط میں لکھتے ہیں:

''اوائل جنوری (۱۹۱۰ء) میں کلکتہ آنا اور چند روز رہنا چاہتا ہوں لیکن آپ نے بمبئی کی طرح فیاضیاں شروع کیں تو ٹھہرنا مشکل ہوگا۔'' (۴۲)

علامہ شبلی ایک بار مولانا آزاد سے مل کر آئے تو ان کو لکھا کہ ''کلکتہ کی پر لطف گھڑیاں اب دیکھئے کب نصیب ہوں۔'' ۹ رجون ۱۹۱۰ء۔ (۴۳) مولانا آزاد نے ایک بار غالباً محلّہ مٹیا برج میں کسی مکان میں قیام کی پیش کش کی تھی، مگر پھر شاید وہ مل نہ سکا۔ علامہ شبلی نے ایک خط میں اس کے بارے میں استفسار کیا ہے اور دلچسپ بات یہ ہے کہ مٹیا برج کو انھوں نے برج خاکی سے تعبیر کیا ہے۔ ایک بار علامہ شبلی نے مولانا آزاد کو ندوہ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کا دعوت نامہ بھیجا تو انہوں نے کچھ عذر پیش کیا، چنانچہ علامہ شبلی نے نہایت جذباتی انداز میں ان کو لکھا کہ

''ان باتوں سے کام نہیں چلتا، اگر آپ اس موقع پر (لکھنؤ) نہ آئے تو میں قیامت تک کلکتہ نہ آؤں گا، بلکہ بعد قیامت بھی۔ میرے برابر کا کمرہ بالکل خالی ہے اور آپ کے لئے محفوظ ہے۔ اکثر احباب آرہے ہیں اور آچکے ہیں۔

دیر ویراں سہی کعبہ مرا آباد رہے
یعنی مومن ہوں چلا جاؤں گا میں یاد رہے (۴۴)

اس خط سے علامہ شبلی کے جذباتی تعلق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ایک اور خط میں انہوں نے مولانا آزاد کو عالم السرائر لکھا ہے، ظاہر ہے یہ انداز نگارش دونوں کی حد سے بڑھی ہوئی شیفتگی کا غماز ہے۔

الہلال کے اسٹاف میں علامہ شبلی کے دو عزیز شاگرد مولانا سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] اور مولانا عبد السلام ندوی [۱۸۸۳ - ۱۹۵۸ء] بھی شامل رہے۔ ۱۸ رنومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی نے وفات پائی اور ۱۸ رنومبر ۱۹۱۴ء ہی کو الہلال کا آخری شمارہ شائع ہوا۔ اس آخری شمارہ میں مولانا آزاد نے علامہ شبلی کی ایک تصویر شائع کر کے بس دو لفظ ہی ماتمی لکھے، شاید ضبط کا یارانہ

رہا۔البتہ علامہ شبلی کی وفات سے اہل کلکتہ بہت رنجیدہ ہوئے اور مسلم انسٹی ٹیوٹ ہال میں ایک ماتمی جلسہ کیا۔جس کی صدارت سید حسن امام [۱۸۷۱-۱۹۳۳ء] نے کی۔مولانا آزاد بھی اس جلسہ میں شریک ہوئے۔اس تعزیتی جلسہ کی روداد راقم کو دستیاب نہ ہوسکی۔البتہ مولانا آزاد نے اس موقع پر جو تقریر کی تھی اس کا خلاصہ البلاغ (۱۷ر۲۴ر دسمبر ۱۹۱۵ء) میں شائع ہوا ہے۔یہاں اس کے چند اقتباسات نقل کئے جاتے ہیں۔مولانا آزاد فرماتے ہیں:

ہم ایک ایسے انسان کے غم میں اشکبار ہیں جو ایک فقیر بے نوا تھا،جس کو کسی طرح دنیوی عزت حاصل نہ تھی۔جو نہ کبھی بڑے بڑے ایوانوں میں رہا اور نہ چاندی سونے کے خزانے اپنے وارثوں کے لئے جمع کئے۔البتہ اس نے دنیوی شہنشاہوں کی جگہ چالیس سال تک سلطان علم کی خدمت گذاری کی۔

آپ اعلان پڑھ چکے ہیں کہ میرا موضوع ''مولانا شبلی کی حیات علمی وادبی'' ہے لیکن حیران ہوں کہ ڈیڑھ دو گھنٹہ کی صحبت کے اندر چہل سالہ علمی زندگی کے متعلق آپ کو کیا بتا سکتا ہوں۔اس قسم کے علمی موضوعوں کے لئے بہت کافی وقت کی ضرورت ہے۔ہمارے سامنے ایک ایسی زندگی ہے جو یکسر تصنیف وتالیف میں بسر ہوئی اور جس کی تصنیف وتالیف کا میدان نہایت وسیع تھا۔اگر ایک فن کا تذکرہ ہوتا تو اس کے لئے بھی ایک مختصر صحبت کافی نہیں ہوتی۔یہاں تو مختلف علوم کی تصنیفات ومباحث کے مسائل درپیش ہیں اور جن میں بعض ایسے علوم بھی ہیں جن کا ذوق باہم متضاد اور مختلف ہے۔انھوں نے ایک زندگی میں ایک ہی وقت کے اندر تاریخ،سیرت، کلام،حدیث اور ادب وشعر کے متعلق تصنیفات مرتب کی ہیں۔

مولانا شبلی مرحوم کو اگر ہم ایک ہی وقت کے اندر مختلف علوم کے مطالعے میں منہمک پاتے ہیں تو اس کی قدر شناسی سے انکار نہیں کرنا چاہئے۔انہوں نے ایک ہی زندگی میں متعدد زندگیوں کے کام انجام دئے۔(۴۵)

ممکن ہے اس کے علاوہ بھی کلکتے میں اور ماتمی جلسے ہوئے ہوں ،لیکن راقم کو اس کی تفصیلات دستیاب نہ ہوسکیں ،تاہم اوپر جو اقتباسات نقل کئے گئے ہیں وہ یہ واضح کرنے کی لئے کافی ہیں کہ کلکتہ سے علامہ شبلی کو کسی سے کسی درجہ کم انس نہیں تھا، بلکہ بعض جزئی واقعات کے لحاظ سے شبلی کی محبت غالب سے بدر جہا بڑھی ہوئی ہے اور اس کی نوعیت بالکل مختلف ہے۔شبلی کلکتہ پر ،کلکتہ کے ادباء وشعراء پر،اس کی علمی مجالس پر اور اس کے علمی وتعلیمی اداروں پر فدا تھے اور ان کا کلکتہ سے تعلق اسی فدائیت کا نتیجہ تھا۔

حوالے

(۱) معارف اپریل ۱۹۳۷ء،ص ۲۸۶

(۲) مکاتیب شبلی ج ۲ص ۱۸۰

(۳) مکاتیب شبلی ج ۲ص ۱۸۰۔۱۸۱

(۴) ایضاً ج ۲ص ۱۸۱

(۵) مکاتیب شبلی ج ۱ص ۲۰۳

(۶) مکاتیب شبلی ج ۲ص ۲۲

(۷) ایضاً ج ۲ص ۲۸

(۸) ایضاً ج ۱ص ۲۱۳

(۹) ایضاً ج ۲ص ۶۹

(۱۰) ایضاً ج ۱ص ۲۱۸

(۱۱) ایضاً ج ۱ص ۲۷۰

(۱۲) مکتوبات شبلی ص ۱۹۶

(۱۳) مکاتیب شبلی ج ۲ص ۱۹۱

(۱۴) مکتوبات شبلی ص ۹۴

(۱۵) مکاتیب شبلی ج ۱ص ۲۵۱

(۱۶) ایضاً ص ۲۱۷

(۱۷) مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۶۵

(۱۸) ایضاً ج ۱ ص ۱۷۳

(۱۹) ایضاً ج ۲ ص ۱۷

(۲۰) ایضاً ج ۱ ص ۲۶۴

(۲۱) مکتوبات شبلی ص ۲۰۰

(۲۲) مکتوبات شبلی ص ۱۲۴

(۲۳) باقیات شبلی ص ۷۶

(۲۴) ایضاً ص ۸۴

(۲۵) مکاتیب شبلی ج ۲ ص ۷

(۲۶) ایضاً ج ۲ ص ۱۸۱

(۲۷) ایضاً ج ۲ ص ۷۹

(۲۸) رپورٹ کاروائی انجمن وقف علی الاولاد ص ۳

(۲۹) ایضا ص ۱۱ و ص ۱۹ و مقالات شبلی ج ۸ ص ۲۸

(۳۰) رپورٹ کاروائی انجمن وقف علی الاولاد ص ۱۶۔۱۸

(۳۱) مقالات شبلی ج ۸ ص ۲۸۔۲۹

(۳۲) مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۲۵۴

(۳۳) ایضاً ج ۲ ص ۱۴۰

(۳۴) ایضاً ج ۲ ص ۱۹۶

(۳۵) مکاتیب شبلی ج ۱ ص ۱۸۸

(۳۶) ایضاً ج ۱ ص ۲۹۳

(۳۷) بحوالہ حیات وحشت ص ۴۷

(۳۸) دیوان وحشت ص ۱۳۴ - ۱۳۵، ستارہ ہند کلکتہ

(۳۹) حیات شبلی ص ۱۶۷

(۴۰) آزاد کی کہانی ص ۳۰۴

(۴۱) ایضاً

(۴۲) مکاتیب شبلی ج ا ص ۶۵۳

(۴۳) ایضاً ج ا ص ۲۵۷

(۴۴) ایضاً ج ا ص ۲۶۲

(۴۵) البلاغ ۱۷ و ۲۴/ دسمبر ۱۹۱۵ء

ooo

[۱۲]

تصانیف شبلی کے دو دہلوی ناشرین

علامہ شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] عالم دین، ادیب وانشاء پرداز، محقق ومصنف اور مفکر کی حیثیت سے دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ان کی عالمانہ، محققانہ اور مورخانہ تصنیفات نے بے حد مقبولیت پائی۔ یہی وجہ ہے کہ ہندوستان کے متعدد مشہور مطابع نے ان کی کتابیں اہتمام سے شائع کیں۔ان کے تراجم دنیا کی مختلف زبانوں اور مختلف ملکوں مثلاً ایران، افغانستان، سعودی عرب، مصر، بیروت، ترکی، پاکستان وغیرہ کے اہم اور مشہور مطابع سے شائع ہوئے۔اس کی تفصیل ''کتابیات شبلی'' (مطبوعہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ) میں دیکھی جاسکتی ہے۔

عہد شبلی میں علی گڑھ، لاہور، لکھنؤ، امرت سر اور دہلی وغیرہ کے مطابع نے علامہ شبلی کی کتابوں کو اپنے اپنے طور پر اہتمام سے شائع کیا۔کچھ نے اجازت سے اور متعدد نے بلا اجازت ہی شائع کرنے کی جسارت کی اور منافع کمایا۔علامہ شبلی ان اشاعتی سرگرمیوں سے ہمیشہ بے پروا رہے۔ ابتدائی دور یعنی علی گڑھ کے زمانہ قیام کی تصنیفات جس میں مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، المامون، الجزیہ، کتب خانہ اسکندریہ اور سیرۃ النعمان وغیرہ شامل ہیں۔ان کے جملہ حقوق انھوں نے علی گڑھ کالج کو دیدئے تھے۔تاریخ بدءالاسلام تو انھوں نے علی گڈھ کالج کے نصاب ہی کے لئے لکھی تھی۔اپنی ان تصنیفات سے انھوں نے ایک پیسہ نہیں لیا۔حتیٰ کہ وہ اپنے احباب کو بھی کتابیں خرید کر تحفہ دیتے تھے۔ایک مرتبہ سرسید احمد خاں [۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] نے بہت کہا کہ جتنی ضرورت ہو لے لو مگر وہ نہ مانے اور کتابیں خرید کر احباب کو بھیجیں۔اسی طرح سوانح مولانا روم اپنے دوست نواب محسن الملک کو حیدرآباد سے خرید کر نذر کی۔

علامہ شبلی کے تاریخی مقالات کو بھی بڑی مقبولیت ملی اور اسے متعدد مطابع نے کتابی

صورت میں شائع کیا۔تصانیف شبلی کے ناشرین کی فہرست بہت طویل ہے ۔ان میں وکیل ٹریڈنگ کمپنی امرت سر خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ اس نے علامہ شبلی کی متعدد کتابیں اور تاریخی مقالات کو ایک عرصہ تک شائع کیا۔اس میں رسائل شبلی ،اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر ،سوانح مولانا روم، جہاں گیر اور تزک جہاں گیری اور زیب النساء وغیرہ قابل ذکر ہیں ۔اس کے علاوہ دہلی میں دو اشخاص جنہوں نے تصانیف شبلی کو بہت اہتمام سے ایک عرصہ تک شائع کیا اور منافع کمایا وہ مولوی سید ظہور الحسن موسوی اور مولوی سید قربان علی بسمل ایڈیٹر اردوئے معلیٰ دہلی ہیں ۔ذیل میں ان دونوں ناشرین اور ان کی سرگرمیوں کا ذکر مقصود ہے۔

○ سید ظہور الحسن موسوی دہلوی :

سید ظہور الحسن موسوی دہلوی کے حالات راقم کو دستیاب نہ ہو سکے۔ان کا قیام دہلی میں تھا اور وہ اپنے نام کے ساتھ دہلوی بھی لکھا کرتے تھے ۔کئی کتابوں کے سرورق پر ان کے نام کے ساتھ دہلوی لکھا ہوا ہے ۔ان کے پریس کا نام قومی پریس تھا جو دہلی کے محلّہ چھتہ لال میاں میں واقع تھا۔اس پریس سے متعدد اہل علم کی کتابیں طبع ہوئیں ۔ان میں علامہ شبلی اور مولوی عبدالحلیم شرر کی تصنیفات خاص طور پر قابل ذکر ہیں ۔

سید ظہور الحسن موسوی کا پریس چھتہ لال میاں میں اور کارخانہ احسن التجارت کٹرہ نظام الملک زیر جامع مسجد واقع تھا۔ پریس اور کارخانہ علاحدہ علاحدہ ہونے سے خیال ہوتا ہے کہ غالباً ان کا کاروبار طباعت واشاعت کافی پھیلا ہوا تھا۔

اس زمانہ میں علی العموم مالک مطابع بڑے عالم فاضل ہوتے تھے ۔مولوی سید ظہور الحسن موسوی بھی بڑے فاضل اور اہل قلم تھے ۔ان کے قلم سے کئی کتابیں نکلیں اور کئی کتابوں کو انھوں نے مرتب کیا۔ان کی جو کتابیں ہاتھ آئیں وہ یہ ہیں :

۱-تاریخ دربار دہلی

۱۲ردسمبر ۱۹۱۱ء کو دہلی میں جارج پنجم کی تاج پوشی ہوئی تھی ۔اس کتاب میں اس تقریب کی مفصل روداد قلم بند کی گئی ہے چونکہ وہ خود اس تقریب میں شریک تھے،اس لئے یہ روداد چشم دید ہے۔۱۸۴رصفحات پر مشتمل اس روداد میں نقشے اور تصاویر بھی دی گئی ہیں ۔امراء اور رؤسا کے

علاوہ جن بڑے اور اہم لوگوں نے اس میں شرکت کی ان کی فہرست بھی دی گئی ہے۔ علماء میں صاحب تفسیر حقانی مولوی عبدالحق حقانی اور علامہ شبلی کا بھی نام شامل ہونے والوں میں درج ہے۔ سید ظہور الحسن موسوی نے اسے اپنے پریس کے بجائے ہلالی پریس دہلی سے طبع کرایا ہے۔ سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ قیاس ہے کہ ۱۹۱۳ء میں یہ کتاب شائع ہوئی۔ پوری کتاب اگرچہ روداد ہے، مگر جا بجا انگریزی حکومت کی سخت وفاداری سے وحشت ہوتی ہے۔ تاہم مصنف کی اردو سادہ اور دلچسپ ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''دہلی نے عروج و اقبال سطوت و جبروت کے ہزاروں نمونے دیکھے، تاریخ گذشتہ میں جو کچھ گذرا، اس کے در و دیوار پر لکھا ہوا ہے۔ اس کے ہزاروں کھنڈروں کا ہر ہر افتادہ پتھر بجائے خود ایک صفحہ تاریخ ہے اور زبانِ حال سے جیسی دلچسپ داستان کہن یہ سنا رہا ہے ہندوستان کا کوئی شہر نہیں سناتا، لیکن اس کی آخری اقبال مندی کے آگے جس کا تذکرہ ان اوراق میں کیا گیا ہے، سارے دنیا کے شہروں کی شان و شوکت سمٹ گئی اور اب سچ یہ ہے کہ دنیا کا کوئی شہر خواہ کیسا ہی بڑا ہو اس کی برابری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔'' (۱)

۲-تذکرہ خواتین دکن

۴۴ صفحات کا یہ رسالہ سید ظہور الحسن موسوی نے ۱۹۱۵ء میں مرتب کیا۔ اس میں ملکہ خونزہ ہمایوں، بہادر سلطانہ، چاند بی بی اور مخدومہ جہاں کے حالات قدرے تفصیل سے لکھے گئے ہیں، یہ رسالہ ہلالی پریس دہلی میں طبع ہوا ہے۔

۳-صد پارہ دل

یہ عبدالحلیم شرر کی تصنیف ہے۔ اس میں مشاہیر عالم کے واقعات قلم بند کئے گئے ہیں۔ اس کے سرورق پر سید ظہور الحسن موسوی کا نام مرتب کی حیثیت سے درج ہے۔

۴- ازواج النبی

جیسا کہ نام سے واضح ہے اس میں ازواج مطہراتؓ کے مقدس حالات و سوانح قلم بند کئے گئے ہیں۔ مخالفین اسلام نے ازواج مطہرات پر جو اعتراضات کئے تھے ان کے جوابات بھی

دئے گئے ہیں۔اس کی زبان اور اسلوب نگارش سادہ اور دلکش ہے۔

۵-گاڑھے خاں کی سرگذشت

یہ فروری ۱۹۲۳ء میں رنگین پریس دہلی سے شائع ہوئی ہے۔اس کا تعارف خود مصنف کے قلم سے ملاحظہ ہو۔اس سے سیدظہورالحسن موسوی کی نثر کا بھی کسی قدر اندازہ ہوگا۔وہ لکھتے ہیں:

''ناظرین حال میں ایک صاحب نے ایک رسالہ بنام گاڑھے خان نے ململ جان کو طلاق دیدی، چھاپ کر شائع کیا تھا اور اچھا لکھا تھا مگر اس میں ہمارے خیال کے نزدیک کچھ کمی رہ گئی تھی، لہذا ہم نے بھی یہ رسالہ گاڑھے خاں کی سرگذشت کے نام سے لکھا ہے۔گو طرز بیان قریب قریب ایک ہے، مگر اس میں تلازمے بہت زیادہ ہیں، گویا بالکل ایک نئی جداگانہ کتاب ہے، بعض الفاظ کے معنی نیچے نوٹ میں لکھے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ تمام کتاب میں کوئی لفظ ایسا نہیں آنے دیا ہے جس سے گورنمنٹ کو یا حکام گورنمنٹ کو حرف گیری کا موقع ملے۔'' (۲)

۶-تاریخ افاغنہ

یہ کتاب میری نظر سے گذری ہے۔مصنف نے سرورق پر کتاب کا تعارف اس طرح کرایا ہے:

''احمد شاہ درانی والیٔ افغانستان کے مفصل حالات زندگی ،آغاز سلطنت ہندوستان پر متواتر حملے اور اس کے فرزند تیمور شاہ اور بیدار بخت، پوتے زماں شاہ کے عہد سلطنت کے تمام واقعات نہایت تحقیق سے بیان کئے گئے ہیں۔''

۱۸۴صفحات کی کتاب ہے۔سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔یہ بھی مہتاب پریس دہلی سے شائع ہوئی ہے۔کتاب کا انتساب میجر نواب محمد اکبر خاں رئیس اعظم ہوتی مردان کے نام ہے۔

۷-مجموعہ نظم شبلی اردو مع مختصر سوانح

کلیات شبلی مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی کی دارالمصنّفین سے اشاعت سے پہلے علامہ شبلی کے کلام کے متعدد مجموعے شائع ہوئے۔جس میں ظفر الملک علوی کا مرتب کردہ مجموعہ'' کلام شبلی'' خاص طور پر قابل ذکر ہے۔انھیں مجموعہ ہائے کلام میں سے ایک یہ بھی ہے۔یہ علامہ شبلی کی دینی

اور اخلاقی نظموں کا مجموعہ ہے ۔آخر میں مولانا عبدالحلیم شرر اور مولوی سید احمد دہلوی مصنف ''فرہنگ آصفیہ'' کے وہ وفیاتی مضامین جوانھوں نے علامہ شبلی کی وفات پر لکھے تھے شامل کیا گیا ہے۔علامہ شبلی کے عقائد کے بارے میں شاہ عبدالسلام نے ان سے جو استفسار کیا تھا اور علامہ شبلی نے اس کا جو جواب دیا تھا ان دونوں تحریروں کو بھی شامل کیا گیا ہے۔اس مجموعہ کلام کے متعدد ایڈیشن سید ظہور الحسن موسوی نے قومی پریس سے شائع کیئے۔

اس کے علاوہ سید ظہور الحسن موسوی نے علامہ شبلی کی درج ذیل کتابیں شائع کیں:

۱-سیرۃ النعمان: رنگین پریس دہلی ۱۳۴۱ھ،ص ص ۱۶۲،طبع دوم قومی پریس دہلی،۱۹۰۴ء ص ص ۲۷۴ (سرورق پر لکھا ہے کہ ''حسب اجازت سید حسن شاہ صاحب مہتمم اتحاد لکھنؤ)،علامہ شبلی کی زندگی ہی میں ان کی کتاب کی اشاعت کی اجازت کسی اور شخص سے لی گئی یہ بات سمجھ میں نہیں آئی۔

۲-الفاروق: قومی پریس دہلی،۱۹۰۸ء حصہ اول ص ص ۲۷۱۔حصہ دوم ص ص ۲۴۸

۳-سفرنامہ روم ومصروشام: مطبع تحفۂ جنت دہلی،۱۳۳۵ھ ص ص ۱۶۰۔طبع دوم مہتاب پریس دہلی ۱۹۲۸ء ص ص ۱۴۲

۴-الغزالی

۵-سوانح مولانا روم (بنام حیات مولانا روم)

۶-مقالات شبلی۔رحمانی پریس دہلی،۱۹۲۳ء

۷-المامون: رحمانی پریس دہلی،۱۳۳۴ھ،ص ص ۱۵۱،اس میں الجزیہ بھی شامل ہے،ص ص ۸، طبع دوم ادریس المطابع دہلی،ص ص ۱۲۰،سنہ اشاعت درج نہیں۔

۸-بیان خسرو

۹-اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر

۱۰-حیات سعدی : خواجہ برقی پریس دہلی،سنہ ندارد، ص ص ۴۸

۱۱-حیات حافظ : رنگین پریس دہلی،۱۹۲۳ء ص ص ۴۸

۱۲-حیات خسرو : پریس اور سنہ ندارد، ص ص ۲۱

۱۳-مجموعہ شبلی اردو مع مختصر سوانح: مہتاب پریس دہلی،سنہ ندارد،ص ص ۶۰

۱۴-آغاز اسلام
۱۵-سوانح عمری فردوسی: مطبع مجتبائی دہلی، سنہ ندارد، ص ۶۳
۱۶-مثنوی صبح امید: رنگین پریس دہلی، سنہ ندارد، ص ص ۲۴
۱۷-سوانح فیضی
۱۸-نظامی گنجوی

سوانح فردوسی، سوانح فیضی، نظامی گنجوی، حیات سعدی، حیات حافظ، حیات خسرو اور بیان خسرو وغیرہ شعرالعجم کے تذکروں کو علاحدہ نئے نام سے شائع کیا گیا ہے، یعنی شعرالعجم کے شائع ہوتے ہی حریص پبلشرز نے اس کے حصے بخرے کردئے۔ یہ کتابچے راقم کی نظر سے گذرے ہیں۔ بعض کے عکس ذاتی کتب خانے میں محفوظ بھی ہیں۔

سید ظہور الحسن موسوی علمی، ادبی اور تعلیمی اداروں سے بھی دلچسپی لیتے تھے۔ دلی عرب سوسائٹی کے سرپرستوں میں ایک نام سید ظہور الحسن موسوی کا بھی ہے۔ موسوی مرحوم محض تاجر ہی نہ تھے ایک قومی اخبار "قومی رفیق" دہلی کے مالک بھی تھے۔ جسے انھوں نے ۱۹۰۲ء میں جاری کیا تھا اور جو کم از کم ۱۹۰۵ء تک جاری رہا۔ اس کا تعارف انھوں نے درج ذیل الفاظ میں کرایا ہے۔

"ایک نہایت عجیب وغریب اور بے انتہا دلچسپ قابل قدر پندرہ روزہ اخبار جس میں لائق فائق جادونگاروں اور معرکۃ الآرا انشاء پردازی کے شہسواروں کی پُر جوش اور پُر لطف، قیمتی مورخانہ واخلاقی مضامین ہمیشہ درج ہوا کرتے ہیں۔ ہر نمبر میں شاہانِ اسلام کے کارنامے اور پُر فخر واقعات یا معزز طبقہ کے اکابر واسلاف کے معنی خیز حالات کے علاوہ تذکرہ خواتین ہند کے دو جز کاغذ کے پیمانے پر ہر نمبر کے ساتھ سلسلہ وار شائع ہوا کرتے ہیں، جو بالکل ایک نئی اور تازہ ترین تصنیف کتاب ہے اور جس میں اول تاجدار ہند بابر بادشاہ سے لے کر آخری فرماروایانِ ہند تک تمام مشہور اور نامور بیگمات کے مفصل حالات، اردو انشاپردازی کی خاص شان اور نہایت دل گیر عبارت میں لکھے گئے ہیں اور نیز اس میں پردہ کے مخالفوں کو دنداں شکن جواب دیئے جاتے ہیں۔ پورے تین جز جنوری ۱۹۰۲ء سے جاری ہے۔" (۳)

○ منشی سید محمد قربان علی بسمل دہلوی

منشی سید محمد قربان علی بسمل دہلوی دوسرے شخص اور مالک مطبع ہیں جنہوں نے علامہ شبلی کی تصنیفات کثرت سے شائع کیں۔ راقم الحروف نے ان کے حالات تلاش کرتے ہوئے دہلی کی شخصیات پر لکھی جانے والی بیشتر کتابیں مطالعہ کر ڈالیں مگر ان کے متعلق ایک حرف ہاتھ نہیں آیا، جو کچھ مدد ملی وہ ان کے مطبع شاہ جہانی پریس دہلی سے شائع ہونے والی کتابوں سے ملی۔ خیال ہے کہ وہ دہلوی نہیں تھے بلکہ دہلی میں آ بسے تھے اور محض دہلوی لکھتے تھے۔ شاید اسی بنا پر تذکرہ نگاروں نے انھیں نظر انداز کیا ہو۔

ان کے نام سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ شاعر تھے اور بسمل تخلص کرتے تھے۔ البتہ راقم کو ان کی کوئی تخلیق دستیاب نہیں ہوئی۔ لیکن وہ پختہ مشق اہل قلم اور ادیب ضرور تھے۔ ان کی صلاحیت بھی معمولی نہ تھی، بلکہ بڑے عالم و ادیب معلوم ہوتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ تھی کہ وہ دہلی کے مشہور رسالہ اردوئے معلیٰ کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ انھوں نے ادارت کا فریضہ کب سے کب تک انجام دیا اور اس میں کیا کیا لکھا، چونکہ اس دور کے اردوئے معلیٰ کا کوئی شمارہ دستیاب نہیں ہوا، اس لئے اس کی تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

بسمل دہلوی نے غالباً سید ظہور الحسن موسوی کے اخیر دور میں کاروبار طباعت و اشاعت شروع کیا تھا اور اپنا شاہ جہانی پریس کٹرہ گوکل داس میں قائم کیا تھا۔ اس لئے کہ شاہ جہانی پریس کی زیادہ تر مطبوعات وہی ہیں جو قومی پریس سے طبع ہوئی تھیں۔ تصانیف شبلی کے علاوہ چند معلوم کتابوں کے نام یہ ہیں:

بحر ذخار [م: ۱۹۲۱ء]، افاضات حمید [م: ۱۹۲۶ء]، الہارون، رباعیات عمر خیام، تحفۃ الہند، کبیر جنم ساکھی، سوانح عمر خیام، حالات سرمد، رباعیات سرمد، رقاصہ [۱۹۲۵ء]، مرقع عبرت، نجیب الطرفین، سیر خرابات، چمنستان سخن وغیرہ۔

بسمل دہلوی نے جو کتابیں شاہ جہانی پریس سے شائع کی ہیں یا شاہ جہانی پریس کے لئے دوسرے مطابع سے طبع کرائی ہیں، ان پر دیباچے بھی لکھے ہیں۔ بعض دیباچوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بڑے باذوق تھے اور علم و ادب پر گہری نگاہ رکھتے تھے۔ اکبر حیدری کے ایک ناول رقاصہ

کے بارے میں وہ لکھتے ہیں۔

''کتنا تکلیف دہ یہ خیال ہے کہ آج ہمارے پیشوا، ہمارے دینی رہنما ہمیں برباد کررہے ہیں۔ تباہی کی طرف لئے جارہے ہیں۔ رقاصہ کی سرگذشت جس قدر عبرت آموز ہو وہ کم ہے۔ ایک معصوم کا اپنے پیر کے ہاتھوں اپنی زندگی تباہ کرنا کتنا عبرتناک انجام ہے۔ شمس النساء بیگم اس افسانے کی ہیروزندہ سلامت موجود ہے۔ جن حضرات کو اس افسانہ کی سچائی میں شک ہو وہ تحقیق کرلیں اور انشاء اللہ یہ تمام واقعات حرف بہ حرف صحیح نکلیں گے۔'' (۴)

اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان کا مذاق ادب اور ذوق تحریر وتصنیف کس درجہ پختہ اور صاف ستھرا تھا۔ یقیناً وہ اپنے عہد کے ممتاز شخص رہے ہوں گے۔ ان کا عہد اور اس سے پون صدی قبل ہندستان کے علی العموم پریس مالکان اہل علم اور صاحب فضل وکمال ہی ہوتے تھے۔ بسمل صاحب انھیں میں سے ایک تھے۔

بسمل دہلوی تصوف آشنا بھی معلوم ہوتے ہیں، کیونکہ ان کی مطبوعات میں صوفیاء کی کتب اور رباعیات وغیرہ شامل ہیں۔ کتاب ''حضرت سلطان ابوسعید ابوالخیر'' پر التماس طابع وناشر کے تحت لکھا ہے کہ

''سب سے پہلے حضرت سرمد شہید کی رباعیوں کا منظوم ترجمہ شائع کیا جو بفضلہٖ تعالیٰ پبلک میں مقبول ہوا۔ پھر ۱۹۲۴ء میں حضرت حکیم نیشاپوری کی رباعیاں مع ترجمہ منظوم طبع کیں۔ اس کو بھی ملک نے بے حد پسند کیا۔ آج حضرت سلطان ابوسعید ابوالخیر رحمۃ اللہ علیہ کی رباعیوں کا ترجمہ بھی نظم میں شائع کیا جاتا ہے۔ حضرت ابوالخیر کی رباعیوں کا ترجمہ جناب مولوی مقصود صاحب مجددی رام پوری نے کیا ہے جو حضرت امام مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان سے منسلک ہیں۔ مجھے اس ترجمہ کی تعریف وتوصیف میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دیکھنے والے خود دیکھ لیں گے۔''

عاصی

قربان علی بسمل

ایڈیٹر اردوئے معلیٰ، دہلی (۵)

سید قربان علی بسمل دہلوی کے شاہجہانی پریس سے علامہ شبلی کے درج ذیل کتب ورسائل شائع ہوئے ہیں:

۱- الفاروق

۲- سیرۃ النعمان

۳- المامون

۴- سوانح مولوی روم: طبع اول شاہجہانی پریس دہلی، سنہ ندارد، ص ص ۱۴۳، طبع دوم ۱۹۲۶ء ص ص ۱۰۸- طبع سوم ۱۹۳۰ء ص ۱۰۸

۵- مقالات شبلی- شاہ جہانی پریس دہلی، سنہ ندارد، ص ص ۱۲۰، طبع دوم سنہ ندارد

۶- سفرنامہ روم ومصر وشام

۷- اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر

۸- رسائل شبلی

۹- بیان خسرو

۱۰- مجموعہ نظم شبلی اردو، شاہ جہانی پریس دہلی، ۱۹۲۹ء، ص ص ۱۰۴

۱۱- آغاز اسلام ترجمہ بدء الاسلام

۱۲- حیات سعدی

۱۳- الغزالی۔ شاہ جہانی پریس دہلی، ۱۹۲۳ء، ص ص ۱۶۴

موازنہ انیس و دبیر، شعر العجم، الکلام، علم الکلام، ان چار کتابوں کے سوا علامہ شبلی کی تقریباً تمام کتابیں سید قربان علی بسمل نے شاہ جہانی پریس دہلی سے شائع کر لی تھیں۔ حالانکہ یہ وہ دور ہے جب دار المصنفین قائم ہو چکا تھا اور مطبوعات کا بھی آغاز ہو چکا تھا۔ ۱۹۱۶ء میں معارف پریس بھی قائم ہو چکا تھا، تاہم شاہ جہانی پریس دہلی علامہ شبلی کی تقریبا تمام کتابیں چھاپتا رہا۔ چونکہ یہ تفصیل معلوم نہ ہوسکی کہ یہ شاہجہانی پریس کب تک قائم رہا۔ ورنہ یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی کی کس سنہ

تک علامہ شبلی کی کتابیں دہلی میں ناشرین بلا اجازت شائع کرتے رہے، تاہم یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ دہلی کے بعض ناشرین آج بھی بلا اجازت دارالمصنّفین کی کتابیں شائع کر کے اسے نقصان پہنچاتے رہتے ہیں۔ان بے درد ناشرین کو یہ بھی خیال نہیں آتا کہ دارالمصنّفین کے مالی استحکام کا بس یہی ایک سہارا ہے۔دارالمصنّفین نے اپنی کتابوں سے ملت کی ذہنی اور دماغی تربیت کی ہے۔ دارالمصنّفین کو نقصان پہنچانا گویا ملت کو نقصان پہنچانا ہے۔

دارالمصنّفین سے کلیات شبلی اردو کی اشاعت سے پہلے دہلی لکھنؤ اور لاہور سے شبلی کی نظموں کے کئی مجموعے شائع ہوئے۔اس میں ایک مجموعہ کے مرتب و ناشر سید قربان علی بسمل دہلوی بھی ہیں۔انھوں نے اولاً سید ظہور الحسن موسوی کا مرتب کردہ مجموعہ نظم شبلی اردو شائع کیا۔بعد ازاں خود انھوں نے ایک مجموعہ نظم شبلی مرتب کر کے شائع کیا۔اس کے اخیر میں علامہ شبلی کے مختصر حالات لکھے ہیں اور مولوی سید احمد دہلوی[۱۸۴۶-۱۹۱۸ء] کا وفیاتی مضمون اور وجاہت حسین جھنجھانوی کی نظم ''رہنما سامنے ہے نقش قدم شبلی کا'' کو شامل کیا ہے۔

بسمل دہلوی نے علامہ شبلی کے مقالات کا بھی ایک مجموعہ ''مقالات شبلی'' شائع کیا تھا بلکہ اس کے دو سے زائد ایڈیشن شائع کئے۔اس میں علامہ شبلی کے درج ذیل مقالات شبلی ہیں۔

۱۔ مسلمانوں کی علمی بے تعصبی
۲۔ موبدان مجوس اور سلطنت تیموریہ
۳۔ علوم جدیدہ
۴۔ الملل والنحل اور ابن حزم ظاہری
۵۔ ہندوستان میں اسلامی حکومت کا اثر تمدن پر
۶۔ عبدالرحیم خان خاناں اور مآثر رحیمی
۷۔ ابن رشد
۸۔ برج بھاشا اور مسلمان
۹۔ معتزلہ اور اعتزال
۱۰۔ منطق یونانی کی غلطیاں
۱۱۔ ہمایوں نامہ اور گلبدن بیگم
۱۲۔ جہانگیر اور تزک جہاں گیری
۱۳۔ علامہ ابن تیمیہ

بسمل دہلوی کی فہرست مطبوعات میں ''شعر العجم'' کا نام شامل نہیں ہے۔تاہم اس کے کم از کم دو مضامین انھوں نے کتابچے کی شکل میں شائع کئے ہیں۔ایک حیات سعدی اور دوسرے

بیان خسرو۔ حیات سعدی دستیاب نہ ہو سکی۔ البتہ بیان خسرو میں انھوں نے ذیلی سرخیاں لگائی ہیں۔ علامہ شبلی کے ایک خط کا اقتباس بطور دیباچہ نقل کیا ہے۔ یہی اس میں بظاہر ایک نیا کام نظر آیا ورنہ وہ ہو بہو شعرالعجم کی نقل ہے۔

سید قربان علی بسمل دہلوی کی مطبوعات اور خاص طور پر شبلی وشرر کی کتابیں عرصہ تک شاہ جہانی پریس دہلی سے چھپتی رہیں اور پڑھی جاتی رہیں۔ یہی سبب تھا کہ ان کے متعدد ایڈیشن سامنے آتے رہے۔ ان ناشرین نے اگرچہ مالی منفعت کے پیش نظر یہ کتابیں بلا اجازت شائع کیں، لیکن ان سے بہر حال اس دور میں علم وادب کو فروغ ملا۔

سید ظہور الحسن موسوی اور سید قربان علی بسمل دہلوی دونوں شبلی وشرر کے بڑے مداح تھے اور دونوں نے ان کی تصنیفات وتالیفات کی اشاعت میں زبردست حصہ لیا۔ بلکہ انھیں دور تک پھیلایا اور استفادہ آسان کیا۔ ان دونوں کا عرصہ اشاعت کم از کم ۱۹۰۲ء سے ۱۹۳۲ء تک ہے۔ اس قدر طویل عرصہ تک علم وادب کی خدمت کے باوجود افسوس دونوں زمانہ کی بے التفاتیوں کا حصہ بن گئے۔ تاہم دونوں کی شبلی شناسی کا تقاضا تھا کہ ان کا مطالعہ کیا جائے۔ امید ہے کہ آئندہ ان کے حالات بھی کہیں نہ کہیں دستیاب ہو جائیں گے۔

حوالے

(۱) تاریخ دربار دیباچہ ص۳

(۲) گاڑھے خاں کی سرگذشت، دیباچہ ص۲

(۳) سیرۃ النعمان صفحہ آخر، مطبوعہ قومی پریس دہلی، ۱۹۰۴ء

(۴) رقاصہ ص۱

(۵) حضرت سلطان ابوسعید ابوالخیر ص۱

○○○

[۱۳]

جہان شبلی

جہان شبلی کی وسعت کا اندازہ مجھے کتابیات شبلی کی جمع وترتیب کے زمانہ میں ہوا۔ ایران، افغانستان، ترکی اور مصر و بیروت سے تصانیف شبلی کے تراجم کی اشاعت گو بڑی بات ہے اور حیرت میں ڈالنے والی ہے، مگر مجھے اس پر حیرت نہیں ہوئی، لیکن جب دوشمبے (روس) میں سیرۃ النعمان اور ایران میں الکلام، علم الکلام اور سوانح مولانا روم کے ساتھ سیرۃ النبیؐ (بعنوان فروغ جاویداں) کے ترجمہ کی اشاعت کا ذکر ملا تو اس بات نے مجھے حیرت میں ڈال دیا کہ خدا جانے فکر شبلی اور تصانیف شبلی میں وہ کون سی جذب وکشش ہے کہ ان کا ذکر چہار دانگ عالم میں گونجا۔ خیر اب تو یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ تصانیف شبلی نے ایک عالم کو متاثر کیا، بلکہ مسلمان اہل علم ودانش کے ساتھ بعض یوروپین دانشوروں کو بھی متاثر کیا۔ عہد شبلی ہی میں ایک پادری جان میلکم نے اپنے مضمون میں ایک جرمن مستشرق کا قول نقل کیا تھا کہ

> ''اہل مغرب کے محققانہ وعالمانہ معیار کے لحاظ سے اگر کوئی دیسی تصانیف تحقیق وتدقیق کا پایہ رکھتی ہیں وہ علامہ شبلی کی تصانیف ہیں۔ گو یہ ایک گونہ اسلامی رنگ لئے ہوئے ہیں۔''(۱)

ای جی براؤن نے شعرالعجم کے سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اہل علم اس سے واقف ہیں۔ حال میں ان کے ایک اور خط (معارف اگست ۲۰۱۹ء) پر نظر پڑی جو انہوں نے مولانا سید سلیمان ندوی کو لکھا تھا، اس میں انہوں نے علامہ شبلی کی جلالت علمی کا نہایت احترام سے ذکر خیر کیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی متعدد غیر مسلم دانشوروں نے علامہ شبلی اور ان کی تحقیقات کی داد دی ہے۔

بہرحال ۲۰۱۱ء تک جہان شبلی سے متعلق جو معلومات دستیاب ہوئی تھیں وہ کتابیات شبلی

(مطبوعہ دارالمصنّفین، اعظم گڑھ ۲۰۱۱ء) میں آ گئی ہیں۔ اس کے بعد کتابیات کے سیکڑوں نئے حوالے ملے۔ جن میں مضامین ومقالات کے علاوہ مستقل کتابیں بھی شامل ہیں۔ ۲۰۱۴ء میں جشن شبلی صدی کے انعقاد کے بعد ملک و بیرون ملک مطالعہ شبلی میں خاصہ اضافہ ہوا ہے۔ یہاں ان کا ذکر مقصود نہیں بلکہ ۲۰۱۱ء سے پہلے جو کتابیں، تراجم اور تلخیصات لکھی گئی تھیں اور جو مجھے کتابیات شبلی کی اشاعت کے بعد ملیں، زیر نظر مقالہ میں محض ان کا تعارف مقصود ہے۔

۱۔ شعرالعجم کی اشاعت کے بعد اس میں مذکور شعراء کے حالات اور ان پر نقد و بحث کو متعدد ناشرین نے کتابچے کی صورت میں شائع کیا۔ مثلاً حیات سعدی، حیات خسرو، حیات حافظ، سوانح عمری فردوسی اور نظامی گنجوی وغیرہ۔ اس سلسلہ کا ایک کتابچہ ''حیات قاآنی'' بھی شائع ہوا تھا۔ اسے شیخ جان محمد الہ بخش تاجران کتب علوم مشرقیہ کشمیر بازار لاہور نے ۱۹۴۱ء میں شائع کیا تھا۔ اس میں حیات قاآنی کے ساتھ قاآنی کے منتخب قصائد بھی شامل کئے گئے ہیں اور اسی لئے اس کا نام ''منتخبات حکیم قاآنی'' رکھا گیا ہے۔ جمع وترتیب کا یہ کام کس نے انجام دیا اس کی صراحت نہیں ہے۔ یہ کتاب بڑی تقطیع کے ۱۰۵ر صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا عکس ہمارے کرم فرما خواجہ زاہد ندیم صاحب نے کراچی سے بھیجا ہے۔

۲۔ تصانیف شبلی کی متعدد تلخیصات شائع ہوئی ہیں، جن کا ذکر کتابیات شبلی میں آ چکا ہے۔ گذشتہ دنوں ہمارے کرم فرما جناب شبیر احمد میواتی نے شعرالعجم کی ایک تلخیص ''ابر کرم'' کا حصہ اول ملاحظہ کے لئے بھیجا ہے۔ یہ شعرالعجم حصہ اول کا سوال و جواب کی شکل میں خلاصہ ہے۔ اسے ملک نذیر احمد تاج بک ڈپو لاہور نے شائع کیا ہے۔ انشا پریس لاہور میں طبع ہوا ہے۔ سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔ چھوٹی تقطیع کے ۵۶ر صفحات پر مشتمل ہے۔ قیمت آٹھ روپیہ درج ہے۔ یہ تلخیص آقا بیدار بخت ایم.اے.ایم.او.ایل.ایچ.پی (پنجاب) ایم.آر.ایس. (لندن) ممبر اورینٹل فیکلٹی پنجاب یونیورسٹی، پرنسپل دارالعلوم السنہ شرقیہ لاہور نے کی ہے۔

آقا بیدار بخت نے شعرالعجم حصہ دوم کی بھی اسی انداز میں تلخیص کی ہے جو ''ابر کرم'' حصہ دوم کے نام سے شائع ہوئی ہے اور اسے بھی ملک نذیر احمد پروپرائٹر تاج بک ڈپو لاہور ہی نے شائع کیا ہے، مگر یہ تلخیص راقم کی نظر سے نہیں گذری ہے۔ اس کا ذکر ابر کرم حصہ اول کی پشت پر

فہرست مطبوعات جدیدہ میں کیا گیا ہے۔

ابر کرم حصہ اول سے تلخیص کا ایک نمونہ یہاں درج کیا جاتا ہے:

سوال: ا۔شعر کی تعریف کرو، یوروپین محققین کی رائے کا خلاصہ لکھواور بتاؤ کہ مصنف شعرالعجم نے اس کی کیا تصریحات کی ہیں؟

جواب: ا۔عام تعریف:۔شعر کلام موزوں کا نام ہے، جسے متکلم قصداً موزوں کرے، گویا اس کے لئے دو شرطیں ہیں:

(الف) موزونیت (ب) وزن

مگر آج کل اس تعریف سے اتفاق نہیں کیا جاتا۔

۲۔مصنف چہار مقالہ نظامی عروضی سمرقندی لکھتے ہیں۔شاعری اس کا نام ہے کہ مقدمات موصوعہ کی ترتیب سے اچھی چیز بدلنا اور بری چیز خوشنما ثابت کی جائے جس سے محبت اور غضب کی قوتیں مشتعل ہو جائیں۔

۳۔ یورپ کے محققین کی رائے (الف) جو چیز ہمارے جذبات یا احساسات کو برانگیختہ کر سکے، شعر ہے۔

اعتراض: اس تعریف کی بنا پر وعظ، تصویر اور تقریر شعر میں شامل ہو جاتے ہیں۔

۴۔منطقی تعریف: جو کلام اس قسم کا ہو کہ اس سے جذبات انسانی برانگیختہ ہوں اور اس کا مخاطب حاضرین نہ ہوں بلکہ انسان خود اپنا آپ مخاطب ہو، اس کا نام شاعری ہے۔

۵۔ارسطو کہتا ہے کہ شاعری ایک قسم کی مصوری یا نقالی ہے۔فرق یہ ہے کہ مصور صرف مادی اشیاء کی تصویر کھینچ سکتا ہے، بخلاف اس کے شاعر ہر قسم کے خیالات، جذبات اور احساسات کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔

۶۔مصنف جمہرۃ البلاغہ کی رائے میں شاعر کی طبیعت پر رنج یا خوشی یا غصہ یا استعجاب کے طاری ہونے کے وقت ایک خاص اثر پڑتا ہے۔ یہ اثر موزوں الفاظ کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے، اس کا نام شاعری ہے۔

مصنف شعرالعجم کی تصریحات: شعر صرف قافیہ اور وزن کا نام نہیں ہے بلکہ الفاظ، وزن، نغمہ اور رقص کے مجموعے کا نام ہے، لیکن ہر شعر میں ان تمام چیزوں کا پایا جانا ضروری نہیں۔ یہ تمام چیزیں تو جذبات کی کمال شدت کے وقت پیدا ہوتی ہیں، اس لئے بعض اشعار میں بعض خصائص پائے جاتے ہیں جو اسے شعر کے درجے تک لے آتے ہیں۔(۲)

۳۔شعرالعجم ہی کی طرح سیرۃ النبیؐ کے متعدد ابواب وفصول کو بھی کتابچوں کی شکل میں متعدد ناشرین نے شائع کیا۔ مثلاً آفتاب رسالت، نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد نے شائع کیا اور اخلاق نبی، ہجرت مدینہ وغیرہ گلاب پبلشرز لاہور وغیرہ نے شائع کیں۔اسی طرح کا ایک کتابچہ ''فتح مکہ'' بھی شائع ہوا ہے۔اسے اسلامی پبلشنگ کمپنی لاہور نے شائع کیا ہے۔ ۸۷؍صفحات پر مشتمل اس کتابچہ پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔عرض ناشر کے تحت عبدالحمید نظامی نے لکھا ہے کہ

''فتح مکہ، سیرۃ النبیؐ کے سلسلے کی ایک کڑی ہے۔فتح مکہ اسلامی تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرامؓ نے تبلیغ اسلام کے لئے جو تکالیف برداشت کیں اور کفار سے جنگیں لڑیں اس کا نتیجہ فتح مکہ کی صورت میں نکلا۔ مسلمان مجاہد ایک فاتح کی حیثیت سے اس شہر میں داخل ہوئے، جہاں سے انہیں ایک دفعہ ہجرت کرنا پڑی تھی۔فتح مکہ کے دوران کوئی ناخوشگوار واقعہ پیش نہ آیا اور تمام کفار کے گناہ معاف کر دئے گئے۔اس موقع پر نبی آخرالزماںؐ نے ایک تاریخی خطبہ دیا۔ اس کتاب میں فتح مکہ کے حالات بڑی تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔'' (۳)

عبدالحمید نظامی نے اس کی تصریح نہیں کی ہے کہ یہ سیرۃ النبیؐ کا ایک باب ہے۔شائع کرنے کی اور کوئی وجہ بھی نہیں بیان کی ہے۔سرورق پر اگر علامہ شبلی کا نام درج نہ ہو تو یہ معلوم کرنا بھی مشکل ہوگا یہ کس کے قلم سے ہے۔

۴۔علامہ شبلی کی دو تصانیف الفاروق اور سیرۃ النبیؐ کا پشتو زبان میں ترجمہ ہوا ہے جس کے کئی ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔سیرۃ النبیؐ کا ایک پشتو ترجمہ آخری پیغامبر کے نام سے بھی شائع ہوا ہے۔پشتو ہی میں سیرۃ کے ایک باب کو اخلاق نبیؐ کے نام سے نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد

نے شائع کیا ہے اس کا ذکر کتابیات شبلی میں موجود ہے۔حال میں اس کا ''نبوی اخلاق'' کے عنوان سے پشتو ترجمہ نظر سے گذرا۔ یہ ترجمہ بھی سیرۃ النبیؐ کی طرح مولانا عزیزالرحمٰن سیفی کے قلم سے ہے اور اسے صداقت خپر ندویہ تولنہ کندھار نے ۲۰۰۹ء میں شائع کیا ہے۔ یہ ترجمہ ۲۰۳صفحات پر مشتمل ہے۔اسے د محمد عمر، ارک بازار کندھار، افغانستان سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۵۔گذشتہ دنوں سیرۃ النعمان کا ایک پشتو ترجمہ بھی نظر سے گذرا۔مترجم کا نام محمد سعادت ہے۔پشاور سے شائع ہوا ہے۔۱۷۶صفحات پر مشتمل ہے۔

۶۔علامہ شبلی نعمانی کی تنقیدی کتاب موازنہ انیس و دبیر نے بڑی مقبولیت پائی۔اس کے بے شمار ایڈیشن شائع ہوئے۔اس پر پچاسوں مضامین لکھے گئے، اس کے جواب میں چار کتابیں لکھی گئیں۔اس کے جائزے پر مشتمل ڈاکٹر ارشاد نیازی نے ایک مبسوط کتاب لکھی ہے۔ان سب کا ذکر کتابیات شبلی میں موجود ہے۔اس سلسلہ کی دو نئی کتابیں دریافت ہوئی ہیں۔ایک کا نام ''موازنہ انیس و دبیر کا تنقیدی جائزہ'' ہے۔ یہ پانچ حصوں پر مشتمل ہے۔حصہ اول میں علامہ شبلی کی شخصیت اور تنقیدی نظریات کا جائزہ لیا گیا ہے۔دوسرے میں موازنہ کا تعارف اور شبلی کے طریقہ کار کی وضاحت ہے۔ تیسرے میں موازنہ کی تلخیص ہے۔ چوتھے حصہ میں موازنہ کے بارے میں ناقدین کی آراء جمع کی گئی ہیں۔اور آخری یعنی پانچویں حصہ میں موازنہ کا تنقیدی جائزہ ہے۔اپنے موضوع پر یہ ایک عمدہ کتاب ہے۔اس کے مصنف سید ظہورالاسلام ہیں۔

۷۔موازنہ انیس و دبیر کی مقبولیت کے پیش نظر ایک لکھنوی ادیب اختر حسن اختر لکھنوی نے اس کا ایک خلاصہ شائع کیا تھا۔اس کے بارے میں خود اختر لکھنوی نے لکھا ہے کہ ''کتاب کی تلخیص اس طور پر کی گئی ہے کہ کتاب کی کوئی ضروری بات چھوٹی نہیں۔'' اسے صدیق بک ڈپو لکھنؤ نے شاہی پریس لکھنؤ سے طبع کرایا ہے۔سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔۱۵۱صفحات پر مشتمل یہ خلاصہ راقم کی نظر سے گذر چکا ہے۔

۸۔سیرۃ النبیؐ کے جواب یا رد میں جو کتابیں لکھی گئیں ہیں ان میں تین کتابیں شیعہ اہل قلم نے لکھی ہیں۔التکمیل، فتنہ شبلی اور اسوۃ الرسول۔التکمیل دستیاب نہیں ہو سکی۔فتنہ شبلی سید اختر حسین کے قلم سے ہے۔۱۱۲صفحات پر مشتمل ہے۔مطبع اصلاح کھجوہ ضلع سارن سے طبع ہوئی ہے۔

اصلاً چھونے کے بھی لائق نہیں ہے۔

۹۔ اسوۃ الرسول چار جلدوں پر مشتمل ہے اور تمام جلدیں سیرۃ النبی کی رد میں لکھی گئی ہیں۔ سیرۃ النبیؐ جلد اول میں علامہ شبلی نے جو طویل مقدمہ لکھا ہے۔ اسوۃ الرسول کے مصنف نے اس کا تقریباً ڈھائی سو صفحات پر مشتمل جواب لکھا ہے۔ اس کے مصنف خان بہادر سید اولاد حیدر فوق بلگرامی کئی اور کتابوں کے بھی مصنف ہیں۔ انہوں آغاز ہی میں لکھا ہے کہ اس کے مخاطب صرف علامہ شبلی نعمانی ہیں۔ یہ کتاب نظامی پریس لکھنؤ سے طبع ہوئی ہے۔ میں نے بہت غور سے پڑھنے کی کوشش کی مگر طول بیانی اور قابل نفریں انداز تصنیف کی وجہ سے ہمت ہار گیا۔

۱۰۔ علامہ شبلی کے متعدد مقالات بھی کتابچے کی شکل میں ناشرین نے شائع کئے ہیں۔ متعدد رسائل کا ذکر کتابیات شبلی میں موجود ہے۔ ان کا ایک رسالہ زیب النساء بھی ہے۔ اس کو سب سے پہلے ۱۹۳۴ء میں بابائے اردو نے انجمن ترقی اردو ہند اورنگ آباد سے شائع کیا تھا۔ حال میں اس کا ایک اور ایڈیشن دستیاب ہوا ہے۔ جسے محمد حفیظ اللہ قریشی مالک قریشی بک ایجنسی لاہور نے جون ۱۹۲۷ء میں شائع کیا تھا۔ اس کا ایک نسخہ جناب شبیر احمد میواتی صاحب نے بھیجا ہے۔

۱۱۔ شعر العجم کے مضمون سعدی شیرازی کو کوئی پبلشرز نے حیات سعدی کے نام سے شائع کیا ہے۔ اس کا ایک نایاب ایڈیشن گذشتہ دنوں دیکھنے کو ملا، جسے مکتبہ حمیدیہ دہلی نے شائع کیا ہے۔ ۳۸ر صفحات کے اس کتابچہ پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔

۱۲۔ کتابیات شبلی میں علامہ شبلی کے ایک مقالہ جہاں گیر اور تزک جہاں گیری کا اندراج ہے، جو اولاً ''دکن ریویو'' حیدرآباد میں بالاقساط [جنوری تا مارچ ۱۹۰۴ء] شائع ہوا، بعدازاں فروری ۱۹۱۰ء میں الندوہ میں چھپا۔ بعد میں اسے ادبی دنیا لاہور نے کتابچہ کی شکل میں شائع کیا۔ اس کا ایک اور ایڈیشن دستیاب ہوا ہے جو وکیل ٹریڈنگ کمپنی امرت سر نے نول کشور اسٹیم پریس لاہور سے طبع کرا کے شائع کیا ہے۔ چالیس صفحات کے اس رسالہ پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔

۱۳۔ الفاروق کی کئی تلخیصات کا ذکر کتابیات شبلی میں آچکا ہے۔ حال میں اس کی ایک اور تلخیص دستیاب ہوئی ہے۔ ''کتابیات شبلی'' میں جن تلخیصات کا ذکر ہے یہ ان کے علاوہ ہے۔ اس کا نام ''سیرت الفاروق یعنی خلاصہ الفاروق'' ہے۔ تلخیص کرنے والے کا نام درج نہیں ہے۔ جیبی

سائز کے ۸۸؍صفحات پر مشتمل یہ تلخیص قریشی بک ہاؤس امرت سر سے ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی ہے۔ وزیر ہند پریس ہال بازار امرت سر میں طبع ہوئی ہے۔ تلخیص کا ایک نمونہ ملاحظہ ہو، ولادت عمرؓ کے تحت لکھتے ہیں:

''حضرت عمرؓ ہجرت نبویؐ سے ۴۰؍ برس قبل پیدا ہوئے۔ ان کے بچپن کے حالات کا پتہ نہیں چلتا، تاہم روایات سے اس قدر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی ولادت پر بہت خوشیاں منائی گئی تھیں۔

جب حضرت عمرؓ نے منزل شباب میں قدم رکھا تو نسب دانی، سپہ گری، پہلوانی اور مقرری سیکھنی شروع کی جو لازمہ شرافت خیال کی جاتی تھی۔ نسب دانی ان کو وراثت میں ملی تھی۔ چنانچہ جب وہ انساب کے متعلق بیان کرتے تو ہمیشہ اپنے باپ کا حوالہ دیتے۔ پہلوانی اور کشتی میں بھی کمال حاصل کر کے عکاظ کے میلوں، تماشوں میں بڑے بڑے میدان مارے، شہسواری میں بھی ان کا کمال مسلم ہے۔'' (۴)

۱۴۔ قدیم مصادر اور تراجمہ کتب کے ذکر پر مشتمل علامہ شبلی کا ایک مفصل مقالہ ''تراجم'' ہے، جو ''رسائل شبلی'' میں شامل ہے۔ دسمبر ۱۹۶۲ء میں مکتبہ حجاب کراچی نے اسے کتابی صورت میں ''اسلام کی عالم گیر خدمات'' کے نام سے شائع کیا تھا۔ حال میں اس کا ایک اور ایڈیشن دستیاب ہوا ہے، جسے بساط ادب لاہور نے شائع کیا ہے۔ اس کی کتابت منشی رحمت اللہ وزیر آبادی نے کی ہے۔ تاریخ کتابت ۶؍دسمبر ۱۹۶۸ء ہے۔ البتہ سنہ طباعت مذکور نہیں۔ غالباً ۱۹۶۹ء میں لاہور سے شائع ہوا ہے۔

۱۵۔ کتابیات شبلی میں تاریخ بدء الاسلام کا ایک ترجمہ حیات النبیؐ کے نام سے درج ہے اور مترجم کا نام حمید اللہ لکھا ہوا ہے۔ حیات النبیؐ کا ایک نسخہ ہمارے کرم فرما جناب شبیر احمد میواتی صاحب نے بھیجا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بدء الاسلام کا ترجمہ نہیں بلکہ تلخیص ہے اور اس کے ملخص کا نام حمید اللہ کے بجائے عنایت اللہ ہے، جو تاج کمپنی کراچی کے منتظم تھے۔ ۸۰؍صفحات پر مشتمل یہ تلخیص انتہائی دیدہ زیب کتابت وطباعت کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔ مختصر سا دیباچہ بھی ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے الفاروق کا بھی ایک خلاصہ ''سیرت عمرؓ'' کے نام سے

بچوں کے لئے شائع کیا تھا۔(۵)

۱۶۔کلیات شبلی مرتبہ مولانا سید سلیمان ندوی کی اشاعت سے پہلے علامہ شبلی کے اردو کلام کے کئی مجموعے شائع ہوئے تھے۔کتابیات میں ان کا ذکر موجود ہے مگر دو مجموعے بعد میں دستیاب ہوئے۔دونوں ایک ہی نام ''کلام شبلی'' کے نام سے شائع ہوئے ہیں۔ایک کے مرتب ظفر الملک علوی ایڈیٹر الناظر لکھنؤ ہیں، جسے انہوں نے الناظر بک ایجنسی لکھنؤ سے شائع کیا ہے۔اس کے دو ایڈیشن علی الترتیب ۱۹۱۶ء اور ۱۹۱۸ء میں شائع ہوئے۔ممکن ہے اس کے اور بھی ایڈیشن نکلے ہوں مگر وہ دستیاب نہیں ہوئے۔دوسرے مجموعہ کے مرتب غلام عباس ایم اے ہیں۔اسے مرغوب ایجنسی لاہور نے شائع کیا ہے۔اس پر سنہ اشاعت درج نہیں ہے۔غلام عباس ایم اے کی بھی تصدیق نہیں ہوسکی کہ آیا یہ وہی مشہور افسانہ نگار غلام عباس ہیں یا کوئی اور۔یہ مجموعہ ۱۳۰ر صفحات پر مشتمل ہے۔کریمی پریس لاہور میں طبع ہوا ہے۔غلام عباس نے علامہ شبلی کی مختصر سوانح بھی قلم بند کی ہے۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی علامہ شبلی کی سوانح پر گہری نظر نہیں تھی۔

۱۷۔مولانا ظفر علی خاں [۱۸۷۳-۱۹۵۶ء] کو علامہ شبلی سے شرف تلمذ حاصل تھا۔علامہ شبلی جب علی گڑھ میں استاد تھے تو وہ طالب علم۔کالج میں علامہ شبلی کے لئے دو مواقع پر تقریب کا انعقاد ہوا۔ایک بار جب انہیں شمس العلماء کا خطاب ملا اور دوسری بار جب وہ روم ومصر وشام کے سفر سے واپس آئے۔ان دونوں تقاریب میں مولانا ظفر علی خاں نے فارسی میں استقبالیہ نظمیں پیش کیں۔سفر روم ومصر وشام کے موقع پر انہوں نے جو نظم پیش کی تھی وہ انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ میں شائع ہوئی ہے اور اسے مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں بھی نقل کیا ہے [۶]، مگر شمس العلماء کا خطاب ملنے پر جو نظم پیش کی تھی وہ نایاب تھی۔مولانا ظفر علی خاں کے مجموعہ کلام میں بھی وہ شامل نہیں ہے۔حال ہی میں ہمارے کرم فرما اور مشہور مصنف پروفیسر احمد سعید صاحب نے اس کی نقل فراہم کی ہے، جو انہیں مظہر محمود شیرانی کے اثاثہ میں ان کے ہاتھ کی لکھی ہوئی ملی تھی۔اس علم دوستی کے لئے ہم ان کے بے حد ممنون اور شکر گذار ہیں۔

وہ نظم درج ذیل ہے۔

نظم

[ظفرعلی خاں بی اے کلاس]

نسیم خوزمی وزد مگر زبزم ذوالمنن کہ غنچہ ہائے دل شگفتہ می شود چمن چمن
ز بسکہ جایمال شد غم و الم ہم و حزن فزوں شدہ است اتحاد روح وجسم وجان وتن
ندید چشم دہر چنیں خجستہ انجمن
نشستہ است ہر کسے بہ بسط عیش شادماں بہ ہررگ است اہتزار وفرحتے عجب دواں
بخالقے کہ بحر فیض اوست وایماں رواں کہ امشب است آں شب سعید ومیمنت نشاں
ہما بر آید ازمیانش خایہ ارنہد زغن
زشمع ہائے عنبریں زلمپ ہائے مشک سا زجاجہ ہائے دلکش وچراغ ہائے خوش نما
زصنع روح پرور و زنقش ہائے جاں فزا ززینتے کہ در عرق بیاوردہ عروس را
شدہ است ایں مکاں خلدوش چو روضہ عدن
بہ حیرت است نرگس از جمال بے مثال او شدہ است تازہ شاخ گل زشبنم وصال او
شقائق است ہم سپند عارض کمال او بسے زسرو ناز عشوہ زاست پایمال
بہ بوئے او تصدق است یاسمین ونسترن
نہادہ شد بنائے ایں چنیں خجستہ منزلے زبہر آں کہ فیض او ہمے رسد بہ عالمے
بقادر قدیر زاید از حساب منتے کہ زائران کعبہ ہز زہر طرف بسے
بیاید از طواف ایں حریم علم وفن
خوش آں کسے کہ نام نامی اش بہ آب سیم وزر درخشد اندریں مکاں نوشتہ ہمچو ماہ وخور
مبارک است آں کسے کہ گشتہ است بہرہ ور زمیوہ ہائے شاخ آں بہار آفریں شجر
کہ در ریاض کالجش نشاند ہمت سدن

سکوت رو دہد بہ عندلیب ہا فصاحتش　　ہزار داستاں را خجل کند بلاغتش
کجاست وایلے کہ می گزد دم طلاقتش　　کجاست سیسرو کہ بیند آمدہ سلاستش
چو نغمہ سنج می شوند بلبلان یونین

زہے نصیب ما کہ یونین بیاورد بہم　　زافسران کالج و زطالبان عام ہم
بریں نمط بہ جشن ہا کہ ہست رشک بزم جم　　بہ ماچہ بیم باشد و چہ اندوہ و چہ باک وغم
چو یافتیم شبلی و بک آرنلڈ و ماریسن

جہان شبلی سے متعلق یہ چند سرسری معلومات دستیاب ہوئیں جنہیں نذر قارئین کیا گیا۔ یقین ہے ابھی اور بھی معلومات ہاتھ آئیں گی۔ ظاہر ہے یہ ۲۰۱۱ء سے پہلے کی معلومات ہیں۔ بعد کی تفصیلات اگر پیش کی جائیں تو وہ کئی سو صفحات میں آئیں گی۔ طوالت کے خوف سے ان سے صرف نظر کیا جاتا ہے۔

حوالے

(۱)　شبلی شناسی کے اولین نقوش ص ۲۲۳
(۲)　ابر کرم حصہ اول ۳-۴
(۳)　فتح مکہ ص ۵
(۴)　سیرت الفاروق یعنی خلاصہ الفاروق ص ۵
(۵)　حیات النبیؐ دیباچہ ص ۲
(۶)　حیات شبلی ص ۲۷۹-۲۸۰

○○○

[۱۴]

علامہ شبلیؒ سے متعلق سید سخی احمد ہاشمی کے نام چند غیر مطبوعہ خطوط

سندھ یونیورسٹی کے سابق استاذ پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی [۱۹۲۵ - ۱۹۹۵ء] ان اہل علم اور ارباب کمال میں تھے جنہیں علامہ شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کی ذات سے بڑی عقیدت تھی اور جنہوں نے مطالعۂ شبلی میں نمایاں طور پر حصہ لیا، لیکن اپنی نیکی اور طبعی شرافت کی وجہ سے اس کا کہیں ذکر نہیں کیا۔

پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی سندیلہ، اتر پردیش کے رہنے والے تھے۔ ۱۹۲۵ء میں وہیں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم لکھنو میں خاتون منزل میں رہ کر حاصل کی۔ میٹرک پاس کر کے اکاؤنٹ ڈپارٹمنٹ میں ملازم ہو گئے۔ تقسیم ہند کے بعد یہ محکمہ کراچی منتقل ہوا تو وہ بھی کراچی چلے گئے۔ وہاں انہوں نے تعلیم کا سلسلہ پھر سے شروع کیا۔ چنانچہ ۱۹۵۲ء میں بی اے، ۱۹۵۴ء میں ایم۔اے اردو اور ۱۹۵۶ء میں تاریخ اسلام میں ایم اے کیا۔ بعد ازاں سردار بہادر کالج حیدر آباد سندھ میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں [۱۹۱۲ - ۲۰۰۵ء] کی کوشش سے لکچرر مقرر ہوئے۔ کچھ دنوں بعد اسی عہدہ پر سندھ یونیورسٹی میں آ گئے۔ تعلیم اور تدریس سب میں ان کے مشفق استاذ اور مشہور صوفی و اہل قلم پروفیسر غلام مصطفیٰ خاں کی رہنمائی انہیں میسر رہی۔

پروفیسر غلام مصطفیٰ خاں نے ایک شب علامہ سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] کو خواب میں یہ فرماتے ہوئے سنا کہ حیات شبلی کا دوسرا حصہ تم لکھ دو (۱)، چنانچہ انہوں نے پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی کو علامہ شبلی کی حیات و خدمات پر پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کے لئے آمادہ کیا اور خود ہی ''شبلی کا ذہنی ارتقاء'' موضوع منتخب کیا۔ ہاشمی صاحب نے انتہائی محنت سے یہ مقالہ لکھا جس پر

سندھ یونیورسٹی نے انہیں پی ایچ ڈی کی سند عطا کی۔

پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی نے اپنے مقالہ کی تکمیل کے لئے بڑے جتن کئے۔ ہندوستان کے مختلف شہروں اعظم گڑھ، لکھنؤ، حیدرآباد اور علی گڑھ کے سفر کئے۔ مولوی ابوالبقا ندوی کے ساتھ علامہ شبلی کے وطن بندول بھی گئے۔ تلامذہ شبلی اور متعدد اہل علم اور ارباب کمال سے ملاقاتیں کی۔ خاص طور پر ان شبلی شناسوں سے خط و کتابت کی جو علامہ شبلی پر علمی و تحقیقی کام کر چکے تھے۔ خانوادہ شبلی اور ان کے بعض اعزہ سے بھی خط و کتابت کی۔ اس سلسلہ میں انہوں نے جن سے ملاقات یا نصف ملاقات کی ان کے نام انہوں نے لکھے ہیں جو یہ ہیں:

مولانا عبدالماجد دریابادی، مولوی مسعود علی ندوی، مولانا عبدالباری ندوی فلسفی، مولوی جواد علی خاں ندوی، مولانا عبدالواحد کان پوری، مولوی حفاظت علی ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولوی عبدالسلام قدوائی ندوی، پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی، مولوی نصیر الدین ہاشمی، مولانا سعید انصاری، وقار خلیل، محمد اکبرالدین صدیقی، مرزا احسان احمد بیگ، مولوی عبدالحکیم اعظمی بندولی، مولوی ضیاء الدین اصلاحی، مولوی مشتاق حسین، ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی، عبداللطیف اعظمی، پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی، ڈاکٹر ابن فرید، پروفیسر کبیر احمد جائسی وغیرہ۔

(شبلی کا ذہنی ارتقاء ص ۱۹)

اسی دلچسپی اور محنت و لگن کی وجہ سے وہ انتہائی اہم مقالہ لکھنے میں کامیاب ہوئے۔ علامہ شبلی کی شخصیت اور کارناموں پر جو چند اہم کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی کا مقالہ ''شبلی کا ذہنی ارتقاء'' بھی شامل ہے اور آج بھی وہ مطالعہ شبلیات میں بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ اس کے مطالعہ سے بیک نظر علامہ شبلی کی شخصیت کا ایک مکمل مرقع سامنے آجاتا ہے۔ اس کی اشاعت کے لئے وہ بے حد فکر مند رہے مگر افسوس کہ موت نے انہیں مہلت نہیں دی۔ وفات کے بعد ان کے استاذ پروفیسر غلام مصطفیٰ خاں کی کوششوں سے یہ مقالہ ۱۹۹۶ء میں مجلس یادگار ہاشمی کراچی سے شائع ہوا۔ بلاشبہ یہ مقالہ شبلیات میں ایک گراں قدر اضافہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ انہوں نے اسی مقالہ پر بس نہیں کیا بلکہ وہ علامہ شبلی کی شخصیت اور فکر و فن پر مضامین و مقالات لکھتے رہے۔ جن کے عناوین یہ ہیں:

۱۔حالات شبلی۔ادبی آئینے
۲۔شبلی کے قصائد کا تاریخی جائزہ، مجلّہ صریر خامہ سندھ، قصیدہ نمبر، شمارہ ۶، ۱۹۶۷ء
۳۔شبلی کی قومی شاعری، مجلّہ صریر خامہ سندھ، قومی شاعری نمبر، شمارہ ۴، ۱۹۶۶ء
۴۔مولانا شبلی اور ترکی، مجلّہ صریر خامہ سندھ، تنقیدی ادب نمبر، شمارہ ۵، ۱۹۶۷ء
۵۔شبلی ایک مخالف انگریز۔ادبی آئینے، مکتبہ شاہد کراچی، ۱۹۷۴ء
۶۔مولانا شبلی کا مجوزہ دارالعلوم۔ادبی آئینے، مکتبہ شاہد کراچی، ۱۹۷۴ء

ان عناوین سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انہوں نے کس قدر اہم موضوعات کا انتخاب کیا۔ بلاشبہ پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی صاحب نے یہ مقالات بڑی محنت و تحقیق سے لکھے ہیں اور موضوعات کا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔

ان کے علاوہ علم و ادب کے دیگر موضوعات پر انہوں نے جو تحقیقی مضامین و مقالات لکھے تھے ان سب کو یکجا ''ادبی آئینے'' کے نام سے ۱۹۷۴ء میں مکتبہ شاہد کراچی سے شائع کیا۔ ان مضامین کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ ''ادبی آئینے'' پر سندھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو نے انہیں ڈی لٹ (D. Litt) کی سند عطا کی۔(۲)

اس کے علاوہ بھی انہوں نے کئی علمی و ادبی کام انجام دئے، چودھری وزیر حسن نشتر سندیلوی [۱۸۹۷ - ۱۹۶۸ء] کا دیوان ''لمعات نشتر'' ۱۹۶۸ء میں اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔ اسی طرح ۱۹۶۹ء میں شاہ راشد علی کی کتاب روح العبادات کو اپنی زیر نگرانی شائع کرایا۔ ۱۹۷۰ء میں طلبہ کے لئے فسانہ عجائب کا ایک انتخاب بھی شائع کیا۔

پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی صاحب کا ایک کارنامہ طلبہ کی تعلیم و تربیت بھی ہے۔ وہ بڑے اچھے استاد تھے اور بڑی محنت و لگن سے پڑھاتے تھے۔ ان کی زیر نگرانی کئی تحقیقی مقالے لکھے گئے۔ برصغیر کے نامور اہل قلم، محقق، مصنف اور آزاد شناس ڈاکٹر ابوسلمان شاہجہاں پوری [پ: ۳۰ر جنوری ۱۹۴۰ء] انہی کے لائق شاگرد ہیں اور سرسید احمد خاں [۱۸۱۷-۱۸۹۸ء] کے رسالہ تذکرہ خانوادہ ولی اللّٰہی کی تحقیق و تدوین کر کے انہیں کے زیر نگرانی پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی ہے۔ پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی صاحب انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ پی ایچ ڈی کا مقالہ لکھنے کے

زمانہ میں انہوں نے اہل علم وادب سے جو خط وکتابت کی تھی اور اس سلسلہ کے جو خطوط ان کے پاس محفوظ رہ گئے تھے، اسے انہوں نے گرامی قدر ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری کے حوالہ کر دیا تھا۔ چنانچہ گذشتہ ۲۳/برس سے وہ خطوط ڈاکٹر صاحب موصوف کے پاس محفوظ رکھے ہوئے تھے۔ ان میں علامہ شبلی سے متعلق جو خطوط تھے ان کے مشورہ اور اجازت سے ہمارے کرم فرما، علم دوست اور مصنف جناب شبیر احمد میواتی صاحب نے مجھے عنایت کئے ہیں۔ اس علم دوستی بلکہ قدر دانی کے لئے میں جناب ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری اور جناب شبیر احمد میواتی صاحب کا بے حد ممنون ہوں۔ ان خطوط کی تفصیل یہ ہے:

۱۔	پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی	۱/خط
۲۔	خواجہ حمید الدین شاہد	۱/خط
۳۔	مولوی حسین احمد زبیری	۱/خط
۴۔	ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی	۱/خط
۵۔	پروفیسر ہارون خاں شروانی	۱/خط
۶۔	ڈاکٹر ابن فرید	۲/خط
۷۔	مختار احمد	۱/خط

علامہ شبلی کے حوالہ سے یہ غیر مطبوعہ خطوط بے حد اہمیت کے حامل ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہاشمی صاحب نے شبلیات کے تشنہ تحقیق پہلوؤں کی تلاش وجستجو اور فراہمی معلومات کے لئے خطوط لکھے تھے۔ اس کے جواب میں مکتوب نگاروں نے علامہ شبلی کی سوانح اور ان کی فکر ونظر پر روشنی ڈالی ہے۔

جن اہل علم کے خطوط پیش کئے جا رہے ہیں وہ بھی بے حد اہمیت کے حامل اشخاص ہیں۔ اس لئے مکاتیب کے اندراج سے پہلے مکتوب نگاروں کا تعارف بھی دیا جا رہا ہے اور خاص طور پر علامہ شبلی سے متعلق ان کی کاوشوں کی تفصیل بھی قلم بند کی جا رہی ہے۔ خطوط میں توضیح طلب امور کے لئے اخیر میں تعلیقات وتوضیحات بھی دی جا رہی ہیں۔

خط نمبر-۱ : پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی

پروفیسر سید نجیب اشرف ندوی [۱۹۰۰ - ۱۹۶۸ء] اردو کے ممتاز ادیب ونقاد، مورخ و مترجم اور محقق ومصنف تھے۔ ان کے قلم سے کئی اہم کتابیں مقدمہ رقعات عالم گیر، رقعات عالم گیر حصہ اول اور لغات گجری وغیرہ نکل کر مقبول ہوئیں۔ خاص طور پر مقدمہ رقعات عالمگیر ان کا بڑا عظیم الشان کارنامہ ہے۔

وہ بہار کی مردم خیز بستی دیسنہ کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد ۱۹۰۹ء میں ندوہ لکھنؤ آئے اور چار برس تک زیر تعلیم رہے۔ یہیں انہیں علامہ شبلی سے شرف تلمذ ہوا۔ (۳) مخالفین کی ریشہ دوانیوں سے تنگ آ کر ۱۹۱۳ء میں جب علامہ شبلی ندوہ سے مستعفی ہوئے تو نجیب اشرف ندوی نے بھی ندوہ کو خیر باد کہہ دیا اور پٹنہ چلے گئے۔ وہاں انہوں نے ۱۹۱۹ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس زمانہ میں تحریک ترک موالات زوروں پر تھی، چنانچہ قومی جذبات سے سرشار ہو کر تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لینے لگے۔ ۱۹۲۰ء میں مولانا سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] نے دارالمصنّفین اعظم گڑھ بلا کر رفیق مقرر کیا۔ دارالمصنّفین سے وہ [دوٹرم میں] تقریباً دس برس وابستہ رہے اور بڑی محنت وتحقیق سے رقعات عالمگیر کی ترتیب وتدوین کی اور اس پر انتہائی عالمانہ مقدمہ لکھا، جسے دارالمصنّفین نے ''مقدمہ رقعات عالمگیر'' کے نام سے علاحدہ کتابی صورت میں شائع کیا۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ یہ مقدمہ نہ صرف دارالمصنّفین کی اہم مطبوعات میں شامل ہے بلکہ یہ تاریخ عالم گیر میں ایک مستند اضافہ ہے۔

ان کے علاوہ ماہنامہ معارف میں بڑے عمدہ اور تحقیقی مقالات لکھے۔ تلخیص وتبصرہ اور اخبار علمیہ بھی وہ لکھتے رہے۔ مطبوعات جدیدہ کے تحت متعدد کتابوں پر تبصرے بھی لکھے۔ مدیر نگار نیاز فتح پوری [۱۸۸۴-۱۹۶۶ء] کی علمی بددیانتیوں کا پردہ سب سے اول انہیں نے چاک کیا تھا۔ ان کی علمی اٹھان سے متاثر ہو کر کم سنی کے باوجود سید صاحب نے انہیں معارف کے مرتبین میں شامل کیا۔ پھر وہ فارسی کے لکچرر ہو کر احمد آباد چلے گئے۔ ایک سال بعد اسمٰعیل یوسف کالج بمبئی سے بطور اردو لکچرر وابستہ ہوگئے اور پھر پوری زندگی وہیں بمبئی میں گذار دی۔ ۵/دسمبر ۱۹۶۸ء کو بمبئی ہی میں انتقال کیا۔

وہ عرصہ تک انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے ڈائرکٹر اور اس کے سہ ماہی رسالہ

نوائے ادب کے مدیر رہے۔ اس میں بھی انہوں نے بڑے علمی وادبی اور تحقیقی مقالات لکھے جن کا ایک مجموعہ حال ہی میں ''مقالات نجیب اشرف'' کے نام سے پروفیسر عبدالستار دلوی نے انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ ممبئی سے شائع کیا ہے۔

بمبئی میں رہ کر انہوں نے لغات گجری مرتب کی جو اپنے موضوع پر ایک اہم کاوش ہے۔ اس کا خیال بھی انہیں دارالمصنّفین میں حافظ محمود شیرانی کی کتاب پنجاب میں اردو پر تنقید وتبصرہ لکھتے ہوئے آیا تھا۔ لیکن یہاں وہ رقعات عالم گیر کا دوسرا حصہ مرتب نہیں کر سکے۔ اس کا سبب انہوں نے یہ بتایا کہ اس کام کے لئے مزار شبلی کا نظروں کے سامنے ہونا ضروری ہے۔ ظاہر ہے اسے استاذ سے بڑھی ہوئی عقیدت کے سوا اور کیا نام دیا جاسکتا ہے۔ یہاں انہوں نے ایک بڑا اہم اور مفصل مقالہ ''شبلی اور بمبئی'' کے عنوان سے لکھا، جو اسماعیل یوسف کالج ممبئی کے سالانہ مجلّہ میں شائع ہوا۔ اس کا علمی حلقوں میں کافی ذکر ہوا، مگر اب یہ مجلّہ اور مقالہ دونوں نایاب ہیں۔

الناظر لکھنؤ کے انعامی مقابلہ میں حصہ لے کر علامہ شبلی ایک بہترین انشا پرداز کے عنوان سے مفصل مقالہ لکھا جو الناظر ہی میں شائع ہوا۔

علامہ شبلی سے شاگردی، ندوہ میں تعلیم، دارالمصنّفین کی دس سالہ رفاقت کی وجہ سے ان کا شمار دبستان شبلی کے ممتاز اہل قلم اور شبلی شناسوں میں ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر سید نجی احمد ہاشمی نے اپنے مقالہ کے سلسلہ میں ان سے خط وکتابت کی۔ اس سلسلہ خط وکتابت کا محض ایک خط دستیاب ہوا ہے، جو یہ ہے:

انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ

۹۲۔ دادا بھائی نوروجی روڈ بمبئی۔ ۱

۲۴/نومبر ۱۹۶۲ء

محبّ محترم   سلام شوق

مکرمت نامہ ملا۔ میرا اپنا خیال تو یہ ہے کہ آپ کو اگر شبلی پر کام کرنا ہے اور اچھا اور مفصل کام کرنا ہے تو آپ کو کچھ دنوں اعظم گڑھ، کچھ دنوں لکھنؤ، کچھ دنوں علی گڑھ اور اگر ہو سکے تو ایک ایک دن بمبئی اور حیدرآباد میں رہنا چاہئے۔ اعظم گڑھ میں

مولانا مسعود علی ندوی (۴)، مرزا احسان احمد بیگ (۵) اور کئی ایک اور بزرگ جن سے مولانا کے عزیزانہ اور خاندانی تعلقات ہیں موجود ہیں، پھران کے مسودات ہی نہیں بلکہ ان کا لکڑی کا پیر (۶) اور دوسرے تبرکات بھی وہاں موجود ہیں، (۷) سب سے بڑھ کر تو یہ بات ہے کہ وہ وہیں آسودۂ خواب ہیں۔ اگر آپ نے دیر کی تو شاید یہ چند ہستیاں بھی نہ رہیں گی۔

آپ کا پہلا گرامی نامہ جس میں مقالہ کا خاکہ تھا کاغذات میں گم ہو گیا ہے۔ اس لئے اگر آپ زحمت فرما کر دوبارہ لکھیں تو میں انشاء اللہ فوراً اس سلسلہ میں اپنی حقیر رائے پیش کر سکوں گا۔ آپ نے ندوہ کے سلسلہ میں اس واقعہ کو تو لیا ہوگا کہ ایک جمعہ کو مولانا (شبلی) ہم سب طلبہ کو ساتھ لے کر نئی عمارت جہاں بن رہی تھی پہنچے اور اس کے حدیث کی تعلیم کے لئے جو کمرہ تھا، اس کی تعمیر میں ہم سب نے مٹی گارا وغیرہ راج گیر کو دیا اور مزدوری کا کام کیا۔ اسی طرح جنگ طرابلس و بلقان میں ان کی جو حالت تھی، اس کو صرف وہی لوگ بیان کر سکتے ہیں جنہوں نے ان کو دیکھا ہے۔ لیکن آپ شاید اپنے مقالہ کو واقعات کی کھتیونی نہیں بنانا چاہتے ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ ایک مصنف کا نفسی مطالعہ اس وقت تک مکمل نہیں ہوسکتا جب تک اس کے ہر عمل اور ذاتی اور عامی سے متعلق اس کا ردعمل نہ معلوم ہو۔

بڑی خوشی ہوئی کہ آپ ایک علمی ادارہ کے ساتھ منسلک ہیں اور آپ کو اپنے کاموں کے لئے صحیح فضا ہی نہیں ملے گی بلکہ آپ کی محنت کی صحیح داد بھی ملے گی۔ جناب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب سے مجھے اس وقت سے نیاز [حاصل] ہے جب کہ میں ناگپور کی آل انڈیا اردو کانفرنس کے لئے ناگپور گیا تھا۔ جناب شاہ نعیم صاحب (۸) اور عزیزی ڈاکٹر مسز خان (۹) کا اضافہ بہت مبارک ہے۔ شاہ صاحب تو نعم الحبیب ہیں اور عقیلہ (۱۰) ماشاء اللہ اسم بامسمی ان تینوں کو میرا سلام مسنون پہنچا دیجئے۔ جی تو چاہتا ہے ایک مرتبہ آکر اردو کے معماروں سے نیاز حاصل کروں لیکن شاید یہ ابھی مقدر نہیں ہے۔

خوش قسمتی سے کاغذات میں آپ کے گرامی نامہ کی تلاش کے سلسلہ میں مولوی سید عبدالرحیم کا پتہ مل گیا۔ وہ یہ ہے:

مولوی سید عبدالرحیم صاحب بالقابہ

22/3, Bihar Colony,Masan Road Karachi-2

دیوان ظہیر فاریابی کی طرح اسمٰعیل کالج کے کعبہ علم سے رسالہ کی یہ کاپی بھی اس مشورہ کی کہ......

درکالج بدزداگر بیابی

شکار ہوگئی۔(۱۱)

شعرالعجم (۱۲) میں مولانا نے عمر خیام پر جو کچھ لکھا ہے اس کا یہ ترجمہ ہے۔ میں اپنے ایک [دوست] کو لکھتا ہوں وہ اس قسم کی پرانی کتابوں کی تجارت کرتے ہیں، وہ آپ کے لئے یہ نسخہ ضرور پیدا کریں گے۔

پہلے تو بہار کے زلزلہ میں پھر دوسرے ذاتی زلزلے میں میرے کتب خانہ کی بہت سی کیا تقریباً ساری نایاب تحریریں اور کتابیں برباد ہوگئیں۔

میرا خیال ہے کہ وہ خطوط یا تو خود محترمہ (عطیہ) بیگم صاحبہ کے پاس ہوں گے یا پھر مولوی امین زبیری مرحوم کے کاغذات میں۔(۱۳)

۶۰ء ادیب (۱۴) کے پرچے نکلوا کر پڑھوں گا اور پھر اس سلسلہ میں جو بات ذہن میں آئے گی لکھوں گا۔

میری طرف سے مسز خان کو کہہ دیجئے کہ گھر میں ہر شخص ان کو بہت یاد کرتا ہے اور وہ ڈاکٹر نذیر صاحب (۱۵) کا پتہ لکھیں۔

امید کہ مزاج گرامی بعافیت ہوگا۔ آپ لوگ نوائے ادب (۱۶) کو کبھی کبھی یاد کرلیا کیجئے کہ لسانی وادبی تعلق کے لئے یہ بہت ضروری ہے۔

آپ کا

نجیب اشرف ندوی

خط نمبر-۲ : خواجہ حمید الدین شاہد

خواجہ حمید الدین شاہد [۱۹۱۹-۲۰۰۱ء] اردو کے ممتاز اہل قلم، مصنف، محقق، مدون، صحافی اور شاعر تھے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور [۱۹۰۵-۱۹۶۲ء] کے دست راست، ادارہ ادبیات اردو کے مہتمم، ماہنامہ سب رس حیدرآباد کے مدیر اور دکنیات کے ماہر اور اردو کے بڑے شیدائی تھے۔ انہوں نے اردو کی بڑی خدمات انجام دیں۔ حیدرآباد کے مختلف کالجوں میں اردو، ہندی کی تدریس کے علاوہ متعدد کتابیں لکھیں اور مرتب کر کے شائع کیں۔ سرگذشت ادارہ ادبیات اردو، یادگار صفی، ارمغان امجد، اردو میں سائنسی ادب، حیدرآباد کے شاعر حصہ اول، تذکرہ لکشمی نارائن شفیق، تذکرہ خوش دہاں وغیرہ ان کی اہم کاوشیں ہیں۔ متعدد ادبی وتنقیدی مضامین بھی ان کے قلم سے نکلے، جن کے دو مجموعے ''ادبی مطالعے'' اور ''نقوش ادب'' شائع ہوئے۔

وہ حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ یہیں تعلیم وتربیت ہوئی۔ یہیں اردو و ہندی کے استاد رہے۔ ۱۹۵۹ء میں بوجوہ کراچی ہجرت کر گئے، لیکن ان کے دل سے حیدرآباد کی یادیں محو نہ ہوئیں۔ کراچی میں انہوں نے اپنے مکان کا نام ''ایوان اردو'' رکھا۔ وہاں اگرچہ انہوں نے اردو لغت بورڈ، اردونامہ وغیرہ کی ادارت کی، تاہم سبکدوشی کے بعد کراچی سے ماہنامہ سب رس جاری کیا اور اپنی آخری سانس تک جاری رکھا۔

پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی نے انہیں ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد میں محفوظ علامہ شبلی کے غیر مطبوعہ خطوط اور بعض دوسری تحریروں کے حصول کے سلسلے میں خط لکھا تھا جس کے جواب میں انہوں نے یہ خط لکھا ہے:

اردونامہ (سہ ماہی)

۶۷۲۔اردو منزل جمشید روڈ کراچی۔۵ ٹیلیفون ۴۲۱۶۳

مکرمی سلام مسنون۔مزاج گرامی

آپ کا عنایت نامہ ملے بہت دن ہوگئے۔ میری صحت ٹھیک نہیں تھی، اس لئے جواب دینے میں تاخیر ہوگئی۔ امید کہ آپ کوئی خیال نہ فرمائیں گے۔ محترم

پروفیسر شروانی (۱۷) صاحب کا کرم ہے کہ انہوں نے مجھے اس قابل سمجھا۔

محترمی نصیرالدین صاحب ہاشمی (۱۸) سے بہتر اور کوئی نہیں۔ آپ ان ہی سے مواد حاصل فرمائیں۔ ادارۂ ادبیات اردو، خیرت آباد، حیدرآباد دکن میں علامہ شبلی مرحوم کے خطوط ہیں۔ آپ پروفیسر عبدالمجید صاحب صدیقی نائب صدر ادارہ کو لکھیئے گا کہ ان خطوط کی نقلیں کروا کے عنایت فرمائیں اور شبلی سے متعلق جو کچھ مواد ادارہ میں ہو اس سے آپ کو مطلع کریں۔ (۱۹) رسالہ ''صبا'' نے آج سے چار پانچ سال قبل ''شبلی نمبر'' شائع کیا تھا۔ آپ اسے ضرور منگوایئے۔ پتہ درج ذیل ہے:

جناب سلیمان اریب صاحب ایڈیٹر رسالہ ''صبا'' بیچلرس کوارٹرز، معظم جاہی مارکٹ، حیدرآباد دکن (آندھراپردیش)

آپ کے مقالے کا خاکہ جامع اور مکمل ہے۔ خدا کرے جلد سے جلد یہ کام آپ مکمل کرلیں۔ مخلص

خواجہ حمیدالدین شاہد

خط نمبر-۳: مولوی حسین احمد زبیری میرٹھی

مولوی حسین احمد زبیری مارہروی خاندان زبیری کے ایک ممتاز فرد تھے۔ اصل وطن مارہرہ تھا۔ میرٹھ میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ اسلامیہ اسکول اٹاوہ اور علی گڑھ میں تعلیم پائی تھی۔ بڑے عالم وفاضل شخص تھے۔ ان کا علمی کارنامہ دو جلدوں میں ''خاندان زبیری کنبوی'' کی تالیف ہے۔ اس کا ایک ضمیمہ بھی انہوں نے لکھا ہے۔ یہ تینوں کتابیں علی الترتیب ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئیں۔

مولوی حسین احمد زبیری کنبوی مارہروی کے حالات ان کے برادر اصغر نے ان کی کتاب ''خاندان زبیری کنبوی'' میں لکھے ہیں، مگر اس میں تاریخیں درج نہیں کی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تاریخ پیدائش اور سنہ فراغت تعلیم وغیرہ معلوم نہ ہوسکے۔

چونکہ یہ خانوادہ زبیری کے ایک فرد تھے اور ممکن ہے ان کا محمد امین زبیری سے کوئی تعلق

بھی رہا ہو۔ غالباً اسی بنا پر مولوی عقیل احمد (۲۰) نے پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی کو ان سے رابطہ کرنے کا مشورہ دیا۔ ان کے خط سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ علامہ شبلی کی شخصیت، تصنیفات اور ان کے علمی کارناموں کے ساتھ ان پر ہونے والے علمی کاموں سے بھی بخوبی واقف تھے۔ محمد امین زبیری [۱۸۷۰-۱۹۵۸ء] کی شبلی مخالف کتابوں پر بھی ان کی نظر تھی، تاہم انہوں نے پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی کو بڑے صائب مشورے دئے ہیں۔ ان کا خط درج ذیل ہے:

از شہر میرٹھ محلّہ خیر نگر چوک حاجی ممتاز علی خان

۲۲ر جولائی ۱۹۶۳ء

عزیزم سلمہ۔ وعلیکم السلام

آپ کا ۱۴ر جولائی (۱۹۶۳ء) کا تحریر کردہ خط مجھے ۱۷ر جولائی [۱۹۶۳ء] کو ملا۔ جس سے یہ معلوم ہو کر مسرت ہوئی کہ آپ مولانا شبلیؒ پر تحقیقاتی کام کر رہے ہیں۔ آپ نے اپنی کتاب ''شبلی کا ذہنی ارتقاء'' کے متعلق جو باب تجویز فرمائے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا نظریہ ایک ٹھوس کتاب لکھنے کا ہے۔ خدا مبارک کرے آمین۔ ہمارے عزیز مولوی عقیل احمد صاحب کو تسامح ہو گیا ہے، کیونکہ میں نے مولانا صاحب کے متعلق کبھی کوئی مواد جمع نہیں کیا، نہ ہی اس جانب کسی طرح کی کوشش کی ہے۔ میری منزل مقصود اور رہی ہے۔ البتہ مولانا صاحب کے متعلق کوئی تحریر یا کتاب سامنے آ گئی تو اسے دلچسپی کے ساتھ ضرور پڑھ لیا، کیونکہ وہ ہماری قوم کے ایک ایسے بزرگ ہیں۔ جنہوں نے اس دور کے مسلمانوں کو اسلامی تاریخ اور ناموران اسلام سے روشناس کرنے میں بڑا کام کیا ہے۔ یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی کہ آپ مولانا شبلی مرحوم کے حالات کے لئے ادھر ادھر کیوں سرگرداں ہیں۔ ان کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور خود ان کی تالیفات اس قدر گوناگوں ہیں جن کے مطالعہ سے ان کی زندگی کے ہر ہر پہلو پر بھرپور روشنی پڑ گئی ہے۔ سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ خود ان کے شاگرد رشید سید سلیمان صاحب ندوی نے تقریباً نو سو صفحات میں ''حیات شبلی'' کے نام سے ان کی زندگی [کی] بھرپور عکاسی کر دی ہے۔

صرف اس کے پڑھ لینے سے آپ کے سوالات کے بہت کچھ جوابات مل سکتے ہیں۔ اس کتاب میں جو بات مابہ النزاع سمجھی گئی ہے وہ یہ ہے کہ ندوی صاحب نے مولانا شبلی کے سامنے سرسید احمد خاں کو سبک سر کرنے کی کوشش کی ہے۔ حال آنکہ دنیا جانتی ہے کہ اگر مولانا شبلی کو سرسید کی صحبت نہ ملتی تو ان میں اور دوسرے کٹھ ملاؤں میں کوئی فرق نہ رہتا۔ اس نکتۂ زیر بحث کو سامنے رکھ کر مولوی محمد امین صاحب زبیری نے پوری حیات شبلی کو کھنگالتے ہوئے اس کا ایسا تجزیہ کیا ہے جو اردو کی تاریخ میں اپنی آپ نظیر ہے۔ انہوں نے تبصرہ کے نام سے تقریباً ڈھائی سو صفحات پر حیات شبلی کے مختلف ایسی کتاب لکھ دی ہے جو دیکھنے کی چیز ہے۔ اس کے علاوہ مقالات شبلی جو دو جلدوں میں ہے۔ (۲۱) خطوط شبلی، [مہدی حسن] افادی کے خطوط، شبلی کی رنگین زندگی، عطیہ بیگم کے نام خطوط محررہ مولوی محمد امین صاحب وغیرہ ایسی کتابیں ہیں جو ان کے مزاج کے سمجھنے کے لئے بہت کافی ہیں، نیز شعر العجم، موازنہ انیس و دبیر اور ان کی نظمیں ان کے جوش وولولوں اور رجحان طبیعت کو پوری طرح عیاں کرتی ہیں۔ اسی پر سیرۃ النبی صلعم اور الفاروقؓ وغیرہ وغیرہ کو اور مقالات شبلی کو بھی تصور کیا جاسکتا ہے۔ یہاں یہ بتا دینا بھی ضروری ہے کہ موازنہ انیس و دبیر کے سلسلہ میں کسی صاحب نے جن کی کتاب کا نام بھی مجھے یاد نہیں ہے، ایک کتاب لکھی تھی جس میں دبیر پر مولانا کے محاکمہ کا جواب دیا گیا تھا، اس کا دیکھنا بھی ضروری ہے۔ (۲۲) یہ ایسی کتاب ہے جس کا علم ذرا سی کوشش میں آپ کو ہو جائے گا۔ اب سوال ان کتابوں کے حصول کا رہا تو ان کتابوں کو آپ کی یونیورسٹی میں ہونا چاہئے۔ یہ ضرور وہاں ہوں گی۔ اتفاقاً اگر وہاں نہ ہوں تو پھر انجمن اردو کراچی اور اردو کالج کے کتب خانوں میں یہ ضرور آپ کو مل جائیں گی۔ ایک گر کی بات یہ ہے کہ بہت سی باتیں جو ضخیم کتابوں میں نہیں ہوتیں وہ اکثر معیاری رسالوں میں مل جاتی ہیں۔ اس کے لئے اعظم گڑھ کا معارف اور اعظم گڑھ کا ادارہ (دارالمصنّفین) آپ کی مدد کر سکیں گے۔ اگر آپ کے یہاں رسالوں کی پرانی جلدیں ہوں تو ان کی ورق گردانی ضروری

سمجھئے۔ مولانا عقیل صاحب کو علم ہے کہ میرا کتب خانہ حیدرآباد دکن میں ہے۔ میرے چھوٹے بھائی امداد احمد زبیری بی اے علیگ کا تبادلہ ۱۹۵۶ء میں حیدرآباد سے بمبئی سکریٹریٹ میں ہو گیا تھا۔ میں وظیفہ لینے کے بعد ان کے پاس تھا مگر جب وہ بمبئی چلے گئے تو میں میرٹھ آ گیا۔ اب تمام کتابیں وہیں مقفل ہیں۔ جب سے برادر عزیز کا اور میرا حیدرآباد جانا نہیں ہوا۔ اگر کوئی مواد آپ کے مفید مطلب ہو سکتا تھا تو شاید وہاں ہوگا۔ اس لئے اس بارے میں آپ مجھے معذور جانیں۔ میں خود اس طرح کی خاندانی تالیفات میں مشغول ہوں کہ مجھے ان کے لئے ادھر ادھر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں نے پانچ برس حیدرآباد میں رہ کر خاندان زبیری کنبوی نام سے دو ضخیم جلدیں اور ایک ضمیمہ لکھا اور الزبیر یعنی سیرت سیدنا حضرت زبیر حواری رسول اللہ صلعم کہ وہ بھی ضخیم ہے لکھی، یہ کتابیں تو طبع ہو چکی ہیں۔ ان کے علاوہ سیرت سیدنا عبداللہ بن حضرت زبیر و حضرت مصعب بن زبیر اور حضرت عروہ بن زبیر اور حضرت بہاء الدین زکریا سہروردی ملتانی، مخدوم شیخ سماؤ الدین ملتانی دہلوی، حضرت مخدوم شیخ جمال، نواب شہباز خان سپہ سالار و گورنر شاہنشاہ اکبر اور دوسرے بہت سے بزرگوں کے سوانح حیات لکھی ہیں۔ غرضیکہ اس طرح کے بہت نام ہیں جن میں میری مشغولیت رہی ہے۔ مجھے امید ہے کہ اگر آپ نے میرے لکھے ہوئے پر عمل کیا تو آپ کی کتاب کے لئے پورا پورا مواد آپ کو آپ کے حسب منشاء فراہم ہو جائے گا۔ توقع ہے کہ آپ گاہے گاہے اپنی خیریت اور کام کی رفتار سے مجھے مطلع کرتے رہیں گے۔

فقط حسین احمد

خط نمبر-۴: ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی

ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی [۱۹۱۵ - ۱۹۹۸ء] پہلے شخص ہیں جنہوں نے علامہ شبلی کے کارناموں پر مقالہ لکھ کر شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ یہ مقالہ

شبلی ایک دبستان کے نام سے ۱۹۵۷ء میں مکتبہ عارفین ڈھاکہ سے شائع ہوا۔ ۵۷ر برس بعد شبلی صدی[۲۰۱۴ء] کے موقع پر دارالمصنّفین اعظم گڑھ نے اس اہم کتاب کو دوبارہ شائع کر دیا ہے۔

ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی ردولی [ضلع بارہ بنکی] کے تعلقہ دار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ردولی اور لکھنؤ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ آئے اور یہاں سے بی اے، ایم اے اور پی ایچ ڈی کی اسناد لیں۔ ازاں بعد غالباً ۱۹۵۱ء میں ڈھاکہ یونیورسٹی کے شعبہ اردو میں استاذ مقرر ہوئے۔ ۱۹۶۹ء صدر شعبہ نامزد ہوئے۔ ۱۹۷۵ء میں ملازمت سے سبکدوشی کے بعد کراچی آ گئے اور بقیہ زندگی یہیں گذاری۔ ۲۲ر مارچ ۱۹۹۸ء کو کراچی میں وفات پائی۔

آفتاب احمد صدیقی نے گو کم لکھا تاہم قلم سے اپنا رشتہ ہمیشہ استوار رکھا۔ زمانہ طالب علمی میں علی گڑھ میگزین میں مضامین لکھے۔ اس کے ایڈیٹر بھی رہے۔ ان کے مضامین و مقالات ملک کے متعدد رسائل میں شائع ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی کے رسالہ ''خاور'' ڈھاکہ میں بھی انہوں نے مضامین لکھے ہیں۔ ان کی دو کتابیں ''گلہائے داغ'' اور ''صہبائے میر'' بھی شائع ہوئیں۔ علامہ شبلی پر تحقیقی مقالہ لکھنے کے بعد بھی وہ ان پر رسائل میں مضامین و مقالات لکھتے رہے۔ علامہ شبلی سے متعلق ان کے مضامین کی فہرست یہ ہے:

۱۔ شبلی، مقالات یوم شبلی، مرتبہ عبیداللہ خاں، اردو مرکز لاہور، ۱۹۶۱ء
۲۔ شبلی کا اسلوب نگارش، خاور، ڈھاکہ، نومبر ۱۹۵۲ء
۳۔ شبلی اکبر کی نظر میں، ادیب علی گڑھ شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۰۶ء
۴۔ شبلی و حالی کا تقابلی مطالعہ، ماہنامہ مہر نیم روز کراچی، نومبر ۱۹۵۶ء
۵۔ شعر العجم، ماہنامہ خاور، ڈھاکہ، فروری ۱۹۵۲ء
۶۔ شبلی متکلم، البصیر چنیوٹ، شبلی نمبر، جون- دسمبر ۱۹۵۷ء
۷۔ موازنہ انیس و دبیر پر ایک نظر، ماہنامہ خاور ڈھاکہ، مئی ۱۹۵۲ء

علامہ شبلی کی شخصیت اور فکر و فن پر تحقیقی مقالہ اور مسلسل مضامین لکھنے کی وجہ سے وہ اپنے عہد میں ایک بڑے شبلی شناس خیال کئے جاتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی نے ان سے بھی رابطہ قائم کیا، جس کے جواب میں انہوں نے یہ خط لکھا ہے۔ یہ خط ڈھاکہ یونیورسٹی

سے لکھا گیا ہے۔

ڈیپارٹمنٹ آف اردو اینڈ پرشین
ڈھاکہ یونیورسٹی

۲۱/۴/۱۹۶۰ء برادر مکرم

السلام علیکم۔ عنایت نامہ ملا۔ لفافہ میں لفافہ دیکھ کر بڑی کوفت ہوئی۔

شبلی کے ذہنی ارتقاء پر کام کرنا مبارک، ضرور کیجئے۔ اچھی اور کام کی چیز ہوگی۔ حالؔی کے ذہنی ارتقاء (۲۳) پر جو کام ہو چکا ہے، اسے تو آپ نے دیکھا ہی ہوگا۔ اس کی خوبیوں سے فائدہ اٹھایئے اور خامیوں سے بچیئے۔ شبلی پر اب بھی بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ ضرورت فکر و تامل کی ہے۔ سوچنے اور غور کرنے کی ہے۔ تحقیق و تلاش کے اس دور میں دوسروں کے اقوال و آرا کو غیر معمولی اہمیت دی جانے لگی ہے۔ حالانکہ اصل چیز جو دیکھنے کی ہے وہ مصنف اور اس کے قلم سے چھوڑے ہوئے نقوش ہوتے ہیں۔ ___ ذہنی ارتقاء پر کام کرنے کے لئے اور بھی ضروری ہے کہ آپ صرف شبلی کے ہو رہیں۔ ان کے دل کی دھڑکنیں سنیں۔ ان کے علمی اور عملی کارناموں پر ''نگاہ'' رکھیں۔ اپنی نگاہ کو دوست کی نہیں، خورد کی نہیں، عقیدت و محبت یا نفرت کی نہیں، انصاف اور ناقد کی بنائے رکھئے۔ شبلی علی گڑھ جانے سے پہلے کیا تھے، کیسے تھے۔ جانے کے بعد کیا سے کیا ہو گئے، اور کہاں سے کہاں پہنچ گئے؟۔ درحقیقت انہیں سوالات کا حل آپ کی کتاب کا موضوع ہے۔ سرسیدؒ کی مقناطیسی شخصیت سے کون واقف نہیں۔ جو ان سے ملا انہی کا ہو کر رہ گیا۔ انہی کے رنگ میں رنگ گیا اور انہی کے دماغ سے سوچنے اور سمجھنے پر مجبور ہو گیا۔ صرف ایک شبلی ہی ایسے نظر آتے ہیں جو علی گڑھ کے تعطر رنگ و بو میں اپنے ہوش و حواس قائم رکھ سکے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی شخصیت سرسید کی شخصیت میں ''ضم ہو جانے سے'' بچ گئی۔ یہی شبلی کی ''بڑائی'' ہے۔ لیکن یہاں یہ بات بھولنے کی نہیں کہ یہ ''بڑائی'' سرسید اور علی گڑھ کے ماحول کا ہی طفیل ہے۔ شبلی علی گڑھ نہ گئے ہوتے تو ان کی ساری زندگی

''مناظروں'' کی نذر ہوگئی ہوتی۔اوران میں وہ وسعت نظر پیدا نہ ہوتی جوان کے بعد کے کارناموں کا امتیازی نشان ہے۔اور جس نے انہیں شبلی بنایا۔حالی رہبر کے بغیر ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھاتے ،لیکن جب رہبر مل جاتا ہے توان کی رفتار دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔رہبر راستے ہی میں رہ جاتا ہے اور وہ منزل مقصود پر پہنچ جاتے ہیں۔''مسدس'' لکھنے کی تحریک کس نے کی تھی؟ شاعری کی اصلاح کی طرف ان کی توجہ کو مبذول کرنے والا کون تھا؟ ایک جگہ سرسید نے انہیں راہ دکھائی۔دوسری جگہ آزاد نے۔لیکن جدید شاعری کا بانی آج کون کہا جاتا ہے؟ یہی وہ موقع ہے جہاں حالی کی عظمتوں کے اعتراف میں گردنیں جھک جاتی ہیں۔لیکن شبلی کو''خضر'' کی تلاش کی ضرورت کبھی پیش نہیں آئی۔وہ خود ہی اپنی منزل متعین کرتے ہیں۔اور منزل تک پہونچنے کے لئے راستہ بھی نکال لیتے ہیں۔حالی میں سب کچھ ہے لیکن ''خوداعتمادی''نہیں۔شبلی کی''خوداعتمادی''ہی سب کچھ ہے۔

شبلی پر مقالہ لکھ کر میں نے ڈگری بیشک لے لی تھی،لیکن اس بات کے اعتراف میں مجھے ذرا تامل نہیں کہ میں نے اس وقت شبلی کو صحیح معنوں میں سمجھا ہی نہیں تھا۔یہی وجہ ہے کہ دوستوں اور عدووں کے مسلسل تقاضوں کے باوجود میں نے اسے''شائع''نہیں کیا۔اس وقت میں نے صرف (علامہ) شبلی کو پڑھا تھا۔شبلی کی حقیقی عظمت کا احساس اس وقت ہوا جب میں نے''دوسروں'' کو بھی پڑھا۔میں نے اپنے مقالہ میں''شبلی'' کو جو مقام دیا تھا۔شبلی اس سے کہیں زیادہ بلند اب نظر آتے ہیں۔

شبلی پر میری ایک کتاب''شبلی ایک دبستاں'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔یہ پہلا حصہ ہے۔دوسرا زیر ترتیب ہے۔پہلے آپ شبلی کی تصانیف پھر''حیات شبلی''مصنفہ سید سلیمان ندوی مرحوم پڑھیں۔حیات شبلی کو اس نظر سے دیکھیں کہ وہ ایک شاگرد رشید کی تصنیف ہے۔اس کے فوراً بعد''ذکر شبلی''مصنفہ محمد امین زبیری کو پڑھیں۔اس میں''خودستائی''بہت ہے۔اور ساتھ ساتھ شبلی کو''گھٹانے'' کی کوشش

کی گئی ہے۔اس بات کو بھی نظر انداز نہ کیجئے گا کہ شبلی کے خلاف ایک تحریک بڑے زور وشور سے شروع ہوئی تھی۔ پنجاب سے لے کر دکن تک ''کہیں کہیں'' یہ شعلے بلند ہوئے۔ اور بجھ بھی گئے، لیکن ''شبلی جہاں تھے وہیں رہے۔'' آگ امین زبیری مرحوم نے لگائی تھی۔تیل عطیہ بیگم کی فیاضی نے مہیا کر دیا تھا۔ ہوامحترم ڈاکٹر عبدالحق نے دی تھی لیکن نتیجہ کیا ہوا، اس کا فیصلہ آپ خود کر لیجئے گا۔

شبلی کی اولین اردو تحریر کا نمونہ ضرور دیکھئے۔''ظل الغمام فی مسئلۃ القراۃ خلف الامام'' کا مسودہ دارالمصنّفین میں ہے۔ یہ رسالہ مولانا شبلی نے اردو میں سپرد قلم کیا تھا۔اسکات المعتدی [عربی] دوسری تصنیف ہے۔ یہ دونوں علی گڑھ جانے سے پہلے لکھی گئی تھیں۔

یونیورسٹی کل سے بند ہو رہی ہے۔ نرسوں انشاءاللہ میں یہاں سے ہندوستان روانہ ہو جاؤں گا۔عدیم الفرصتی بہت ہے۔اس لئے تفصیلی خط نہ لکھ سکا۔ وہاں کا میرا پتہ یہ ہوگا۔ ردولی۔ضلع بارہ بنکی۔ یوپی

فقط، مخلص

آفتاب احمد صدیقی

خط نمبر-۵: پروفیسر ہارون خاں شروانی

خانوادہ شروانی نے جس قدر گہرا تعلق علامہ شبلی نعمانی کی ذات گرامی سے رکھا شاید ہی کسی اور خانوادے نے رکھا ہو، اس کا آغاز حبیب شبلی مولانا حبیب الرحمٰن شروانی [۱۸۶۶ - ۱۹۵۰ء] سے ہوا۔ نواب مزمل اللہ خاں شروانی [۱۸۶۵ - ۱۹۳۸ء] نے متعدد مواقع پر ان کے اداروں ندوہ اور دارالمصنّفین کا مالی تعاون کیا۔ محمد مقتدی خاں شروانی [۱۸۸۰-۱۹۶۸ء]، نے بھی علامہ شبلی سے بے حد تعلق رکھا۔ ان کا مفصل مقالہ ''شبلی کا قیام علی گڑھ'' خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ علامہ شبلی کی وفات پر نواب مزمل اللہ خاں کی صاحبزادی ز.خ.ش نے بڑا دلدوز مرثیہ لکھا۔ ان کی وفات کے بعد انہی کی محبت میں اس خانوادے نے ان کے جانشین مولانا سید سلیمان ندوی اور

دارالمصنّفین سے گہرا ربط وتعلق رکھا۔ مولوی عبیدالرحمٰن خاں شروانی اور ہمارے کرم فرما پروفیسر ریاض الرحمٰن خاں شروانی نے بھی اس سلسلہ کو باقی رکھا۔ غالبًا اسی خیال سے پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی نے پروفیسر ریاض الرحمٰن شروانی اور پروفیسر ہارون خاں شروانی سے اپنے مقالہ کے سلسلہ میں خط وکتابت کی۔ پروفیسر ہارون خاں شروانی اگرچہ بڑے اہل علم تھے، برسوں حیدرآباد سے تعلق رہا اور مختلف موضوعات پر کئی کتابیں ان کے قلم سے نکلیں، لیکن ان کا اصل موضوع سیاسیات تھا اور وہ علامہ شبلی سے برائے نام واقف تھے، جیسا کہ ان کے خط سے بھی ظاہر ہوتا ہے۔

مصطفیٰ منزل

حمایت نگر، حیدرآباد۔ دکن۔ا　　　　مورخہ ۱/۵/۱۹۶۵ء

مخدومی ومکرمی۔ السلام علیکم

آپ کا ۵؍جنوری کا خط مجھے مل گیا تھا۔ دیر میں جواب دینے کی معافی چاہتا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ جس قدر مواد سرسید اور ان کے رفقاء کے متعلق آپ چاہتے ہیں وہ سب کتاب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو روڈ کراچی میں دستیاب ہو جائے گا۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب کے پاس بڑا مکمل مواد تھا۔ وہ اسی کتاب خانے میں ہوگا۔ سرسید کی آخری زندگی کے حالات کی بابت بہت کافی تفصیل مولانا حالی کی کتاب ''حیات جاوید'' میں دی ہوئی ہے۔ یہ کتاب اور سرسید کا سفرنامہ پنجاب دونوں کتابیں آپ کو اس کتاب خانے میں مل جائیں گی۔ سرسید کا سفرنامہ پنجاب تو انتہائی کم یاب بلکہ نایاب ہے۔ وہ آپ کو اس کتاب خانے میں اور ممکن ہے کسی دوسرے کتاب خانے میں مل جائے لیکن اس کتاب خانے میں یقیناً ہوگا۔ مولانا شبلی کے متعلق میری کوئی خاص معلومات نہیں، سوائے ان کی بعض تصانیف کے جو محض سرسری طور پر میں نے دیکھی ہیں، مگر حیات جاوید میں بھی ان کے متعلق مواد مل جائے گا جو شاید آپ کی نظر سے نہ گذرا ہوا۔

''حیدرآباد کے ادیب'' اور حیدرآباد کے شاعر'' کے نام سے دو جلدیں تین سال ہوئے نکلی تھیں۔ ان کے نسخے انجمن ترقی اردو بورڈ، کراچی میں ملیں گے۔ وہاں

حمیدالدین شاہد صاحب آپ کی بہت کچھ رہنمائی کردیں گے۔

آپ کا مقالہ میرا خیال ہے کہ شبلیات میں ایک قابل قدر اضافہ ہوگا۔ اس بارے میں اگر آپ دارالمصنّفین اعظم گڑھ، یوپی سے خط وکتابت بھی کریں تو وہاں سے مولانا شبلی کی حیات کی بابت معتد بہ رہنمائی حاصل ہوجائے گی۔

بندہ

ہارون خاں شروانی

خط نمبر-۶،۷: ڈاکٹر ابن فرید

ڈاکٹر ابن فرید [۱۹۲۵-۲۰۰۳ء] اردو کے ممتاز ادیب اور نقاد تھے۔ شعروادب پر ان کی وسیع وعمیق نظر تھی۔ ان کے قلم سے متعدد ادبی وتنقیدی مضامین اور کتابیں نکلیں۔ چہرہ پس چہرہ، میں ہم اور ادب، ادب دادطلب، ان کی اہم ادبی وتنقیدی کتابیں ہیں۔

ڈاکٹر ابن فرید کی علامہ شبلی اور ان کے افکار وخیالات پر بھی گہری نظر تھی۔ اس حوالہ سے ان کا بڑا کارنامہ یہ ہے کہ ۱۹۲۶ء سے ۱۹۶۰ء تک امین زبیری، مولوی عبدالحق، ڈاکٹر وحید قریشی اور شیخ محمد اکرام وغیرہ نے علامہ شبلی کی شخصیت کو مطعون کرنے کی جو مہم چلا رکھی تھی اس کا پہلا محققانہ جائزہ انہیں کے قلم سے سامنے آیا۔ ان کے مقالے کا عنوان ''شبلی چوں بہ خلوت می رود'' ہے جو ماہنامہ ادیب علی گڑھ کے شبلی نمبر [ستمبر ۱۹۶۰ء] میں شائع ہوا ہے۔ ان کی کتاب ''میں ہم اور ادب'' میں بھی یہ محققانہ مقالہ شامل ہے۔

ڈاکٹر ابن فرید کو نفسیاتی تنقید پر دست رس حاصل تھی، اس کے لئے وہ ہندوستان کے اردو حلقوں میں معروف تھے، چونکہ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی کتاب ''شبلی کی حیات معاشقہ'' نفسیاتی تنقید میں مہارت کے زعم ہی میں لکھی تھی، اس لئے اس کا جائزہ ایک نفسیاتی نقاد ہی کو زیب دیتا تھا، چنانچہ انہوں نے بڑے مدلل انداز میں ڈاکٹر وحید قریشی کی مذکورہ کتاب اور اس کے نارروا مشمولات کی بے وقعتی ثابت کی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈاکٹر وحید قریشی نے اپنی ہی کتاب کو کتب خانوں سے ضائع کرانے کی کوشش کی۔(۲۴) اور پھر اس طرح کی تنقیدوں کا سلسلہ گویا ختم ہوگیا۔

ڈاکٹر ابن فرید نے علامہ شبلی کے بھائی بیرسٹر مہدی حسن اور ان کے خطوط لندن پر جو مضمون لکھا ہے اس سے علامہ شبلی اور ان کے خانوادے کی تاریخ وتذکرہ سے ان کی گہری واقفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔علامہ شبلی کے حوالہ سے ان کی ایک بڑی اہم کاوش ماہنامہ ادیب علی گڑھ کا شبلی نمبر بھی ہے۔اسے انہوں نے بڑی محنت اور سلیقہ سے مرتب کیا ہے۔شبلیات میں اس اہم،مبسوط اور ضخیم نمبر کی حیثیت ایک بنیادی ماخذ کی ہوگئی ہے۔بجا تھا کہ پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی اپنے تحقیقی مقالے کی تسوید وتدوین کے لئے ان سے رابطہ کر کے معلومات اخذ کرتے۔ہاشمی صاحب کے نام ڈاکٹر ابن فرید کے دو نادر اور غیر مطبوعہ خطوط دستیاب ہوئے ہیں۔اور دونوں خطوط بڑی اہمیت کے حامل ہیں۔دوسرا خط تو ایک مضمون کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔اس میں بے حد اہم مباحث آ گئے ہیں۔دونوں خطوط درج ذیل ہیں:

[۱]

ماہنامہ ادیب علی گڑھ

۱۹۶۳/۳/۱۳ء باسمہ تعالی

گرامی قدر السلام علیکم

آج ایک عرصہ کے بعد اتنی فرصت میسر آسکی ہے کہ آپ کے خطوط کا قدرے تفصیل کے ساتھ جواب دے سکوں۔امید ہے کہ میری اس جبری بے اعتنائی کو آپ نظر انداز فرمائیں گے اور میرے عذر کو قبول فرمائیں گے۔اب ذرا یہ امید ہو چلی ہے کہ انشاء اللہ دو چار ماہ میں تھیسس سے نجات مل جائے گی،چنانچہ کام کی زیادتی کے باوجود سکون سا محسوس ہو رہا ہے۔آپ میرے حق میں دعا فرماتے رہئے۔ممکن ہے آپ کا خلوص کام کر جائے۔

آپ کی مطلوبہ کتابوں کے سلسلہ میں ابھی جا کر معلومات حاصل کروں گا، ان کی قیمتیں معلوم کروں گا کہ کم از کم شبلی سے متعلق کتابیں بھیجی جانی شروع بھی ہو جائیں۔اس عرصہ میں آپ رقم کی ادائیگی کا انتظام شروع کر دیں تا کہ جس کتاب والے کو میں بیچ میں ڈال رہا ہوں وہ معاملہ کی صفائی کا معترف رہے۔میری

مصروفیت کی وجہ سے جو تاخیر ہوئی ہے اس کے لئے ایک بار پھر معافی کا خواستگار ہوں۔ آپ کے مقالہ کے ابواب کے عنوانات دیکھنے کا شرف حاصل ہوا۔ ماشاءاللہ بہت جامع ترتیب ہے، مجھ جیسا عامی اس میں حرف گیری بھی نہیں کرسکتا۔ البتہ چند باتیں میرے ذہن میں آرہی ہیں اگر ان پر غور فرمائیں تو عنایت ہوگی۔ آپ نے شبلی کی سوانح نگاری اور سیرت نگاری کے فنون کو الگ باب نہیں بنایا ہے، حالانکہ یہ وہ صلاحیتیں ہیں جن کی وجہ سے شبلی کو عربی ممالک، ترکی و یورپ میں بھی ''انداز دگر'' کا اعتراف حاصل ہوا۔

خاندانی حالات کے سلسلہ میں شبلی کے منجھلے بھائی محمد مہدی حسن پر میں نے ایک مضمون گذشتہ سال جون میں لکھا تھا جو آج کل دہلی میں شائع ہونے والا ہے۔ اشاعت کی منظوری کو بھی آٹھ نو ماہ ہو چکے ہیں دیکھئے کب شائع ہو۔ بہرحال جیسے ہی شائع ہوگا ایک نسخہ آپ کی خدمت میں ارسال کروں گا۔ اس سے کچھ نئی باتیں آپ کو معلوم ہوں گی۔

علامہ شبلی کی جو منظومات انسٹی ٹیوٹ گزٹ منتقلی میں شائع ہوئی ہیں۔ ان کے تلاش کرنے کی فی الوقت فرصت نہیں ہے، جیسے ہی تھیسس سے نپٹوں گا انشاءاللہ یہ کام خود کر دوں گا۔ لیکن اس کے لئے آپ کو اگست یا ستمبر تک انتظار کرنا پڑے گا۔

آپ کے شاگرد صاحب کے اقبال پر مقالے اب تک موصول نہیں ہوئے ہیں اور نہ آپ کا مذکورہ خط۔ پروفیسر وحیدہ نسیم صاحبہ (۲۵) کی غزل اور نظم میں یہاں ایک نئے جریدے سہ ماہی ''صدف'' گیا کے لئے ارسال کر دوں گا۔ ان کا پتہ بھی انہیں لکھ دوں گا۔ ادیب میں تو ایسی چیزیں شائع نہیں ہوتیں، آپ کو علم ہی ہے، البتہ ادیب کا ایک شمارہ اور خط ضرور ارسال کروں گا۔ جہاں تک میری معلومات کام کرتی ہیں فتح پور تحصیل میں ہماری کوئی رشتہ داری نہیں ہے۔ پھر بھی یہ تعلق کیا کم ہے کہ وہ بارہ بنکی کی ہیں۔

علی گڑھ کے جو بزرگ شبلیؒ کے زمانہ کے زندہ ہیں ان کا پتہ درج کر رہا ہوں۔

امید ہے کہ آپ انہیں براہ راست خط لکھیں گے۔ مولوی محمد مقتدیٰ خاں صاحب شیروانی، شیروانی پریس، علی گڑھ شہر۔ (یوپی) احمد اسحٰق نعمانی اب علی گڑھ میں نہیں ہیں۔ ان کے حالیہ پتہ کا بھی مجھے علم نہیں ہے۔ (۲۶)

شجرہ نسب کے سلسلہ میں آپ شبلی کالج کے پرنسپل صاحب کو خط لکھیں۔ (۲۷) ویسے میں بھی ان کے خاندان کے ایک صاحب کو خط لکھ رہا ہوں جواب آنے پر مطلع کروں گا۔

علامہ شبلی کے والد نے انصاریوں میں شادی نہیں کی تھی۔ خاندان باہر شادی تو ہوسکتی ہے، لیکن برادری باہر شادی نہیں ہوئی تھی۔ انصاریوں کا یہ خاندان بھی روتارابرادری سے تھا۔ روتاروں میں لوگ مختلف اسم نسبتی لکھتے ہیں۔ مثلاً خان [وحید الدین خاں، اقبال سہیل خاں] مرزا [مرزا احسان احمد بیگ] اسی طرح کچھ خاندان خود کو انصاری بھی لکھتے ہیں۔ شبلی کے سوتیلے بھائی مظفر (۲۸) سے ایک لڑکی تھی، جن کا مدینہ یا مکہ شریف میں انتقال ہوا۔ وہ لاولد تھی۔

ان کے خاندان کا غدر میں انگریزوں کی حمایت میں رویہ رہا ہے۔ اس کی تفصیل معلوم کر کے لکھوں گا۔ میرا جہاں تک خیال ہے اعظم گڑھ کی کوئی تاریخ شائع نہیں ہوئی ہے۔ علامہ شبلی اپنی برادری کی تاریخ لکھنا چاہتے تھے لیکن لکھ نہ سکے۔ [ملاحظہ ہو مکتوب، شبلی نمبر]

باوجود کوشش یہ خط بہت عجلت میں لکھ رہا ہوں۔ اگر اب بھی کچھ باتیں دریافت طلب ہوں تو تحریر فرمائیں۔ وقت نکال کر جواب تحریر کروں گا۔

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔ والسلام

ابن فرید

پس تحریر: - آپ کا کارڈ وقت پر مل گیا۔ میں کل صبح ہی کتب فروش سے کہہ آیا تھا کہ وہ انجمن ترقی اردو کی کتابیں دوپہر تک منگوالے تاکہ میں دوسرے دن ڈاک سے بھیج دوں۔ اس نے فہرست انجمن بھیج دی تھی کہ دفتر میں آپ کا خط موصول ہوا۔

چنانچہ شام کو اسے منع کر دیا۔

کتابیں نہ ارسال کرنے کا کوئی سوال نہیں پیدا ہوتا تھا کیونکہ اس کا کام آرڈر کی تعمیل مجھے کرنی تھی اور کتابیں بھیجنا میری ذمہ داری تھی۔ میں نے یہ معاملہ ہی نہیں رکھا تھا کہ آپ سے براہ راست لین دین کرے۔ اس صورت میں واقعی آپ کو پریشانی ہوتی۔ اب سوال رقم کی ادائیگی کا ہے۔ ادیب کا اکاؤنٹ بینک میں نہیں ہے۔ میرا ذاتی اکاؤنٹ ضرور ہے۔ اسی طرح متعلقہ کتب فروش کا اکاؤنٹ بھی بینک میں نہیں ہے۔ جامعہ اردو کے اکاؤنٹ میں روپیہ جمع کرانے کے بعد میرے لئے حاصل کرنے میں بڑی دشواری ہوگی۔ بہرحال اگر میرے نام سے ڈرافٹ بن سکے تو میں ادیب کے پیڈ پر بل بنوا کر بھیج سکتا ہوں۔ اب آپ اپنے فیصلے سے مطلع کریں۔ صریر خامہ (۲۹) موصول ہو چکا ہے۔ غالب والے مقالہ کی اشاعت کا خیال رکھا جائے گا۔ اطمینان رکھیں۔

کبیر صاحب (۳۰) بحمداللہ بخیریت ہیں۔ آج کل امتحان کی تیاری میں غیر معمولی طور پر مصروف ہیں۔ صرف دو ہفتے اور باقی ہیں۔ خدا کرے کہ اس سال بھی ان کی سابقہ کامیابی باقی رہے اور وہ فیکلٹی میں اول آسکیں۔

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے اور کتابوں کے سلسلہ میں جلد از جلد جواب سے نوازیں گے۔ کبیر صاحب سلام علیک کہتے ہیں۔ والسلام

ابن فرید

۱۹۶۳/۳/۱۴ء

---

[۲]

ماہنامہ ادیب علی گڑھ

۱۹۶۳/۴/۲۷ء　　　　باسمہ تعالیٰ

گرامی قدر۔ السلام علیکم

اب آپ کا خط ایسا نہیں ہوتا کہ قلم اٹھایا اور جواب حاضر، بلکہ کچھ گانٹھ کا مضبوط بننا پڑتا ہے۔ اس کے لئے نہ وقت ملتا ہے اور ذہن ساتھ دیتا ہے۔ اپنے کام کی وجہ سے آج کل ادب سے تقریباً لاتعلق ہو چکا ہوں۔ اس وجہ سے جواب اس روانی کے ساتھ لکھنا محال ہو جاتا ہے جیسا کہ پہلے تھا۔ آپ کی شرط محال ہے۔ کسی فرم کا حساب یہاں نہیں ہے۔ اب مئی میں آپ یہاں آنے والے ہیں۔ بہتر یہ ہو کہ آپ لکھنؤ کے کسی دوکاندار سے گفتگو کر لیں جس کا حساب بینک میں ہو۔ اس کے نام کتابیں یہاں سے طلب کرا لیجئے، اور وہ رقم کی ادائیگی آپ کی یونیورسٹی سے کرا لے۔

میں نے سوانح نگاری کے سلسلہ میں جو بات لکھی تھی اس پر اب تک قائم ہوں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ حالی نے بیوگرفی کی ابتداء اردو میں کی، شبلی کو اولیت حاصل نہیں ہے، اور اس میں بھی کوئی شک نہیں ہے کہ حالی نے ادبی اور شبلی نے تاریخی سوانح لکھی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود شبلی کو سوانح نگاری میں اولیت حاصل ہے۔ آپ کو اس متضاد بیان پر حیرت ضرور ہوگی، لیکن حقیقت یہ ہے کہ شبلی کے معاملہ میں افراط و تفریط سے بے حد کام لیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ شبلی نے بھی اپنے معاملہ میں کچھ ایسا ہی کیا ہے۔ مثلاً حیات جاوید کا تمسخر اڑایا ہے۔ بہر حال ضرورت اس امر کی ہے کہ صحیح محاسن یا خدمات کا تعین کیا جائے۔

سوانح نگاری کے فن پر میرا مطالعہ بہت محدود ہے۔ اساسی کتابیں میں نے نہیں پڑھی ہیں۔ اردو میں الطاف فاطمہ کا ایم اے کا مقالہ طبع ہو گیا ہے جو میری نظر میں پوچ ہے۔ ڈاکٹر سید شاہ علی کا مقالہ (۳۱) میں نے نہیں دیکھا ہے۔ اس کی تعریف ضرور سنی ہے۔ لیکن ابھی اتنی گنجائش پیدا نہیں ہو سکی ہے کہ خرید وں۔ انہوں نے شبلی کے بارے میں کیا لکھا ہے مجھے اندازہ نہیں۔ الطاف فاطمہ کو تو سلیقہ سے یہ بھی نہیں معلوم کہ سوانح نگاری کیا ہے۔ انگریزی میں اس موضوع پر بڑی اچھی کتابیں ہیں۔ خاص طور پر مندرجہ ذیل کتابیں پڑھنے سے تعلق رکھتی ہیں:

1. Aspects of Biography - Andre Maurois

2. English Biographies - Waldo H. Dunn

3. Development of English Biographies - Harold Nicolson

4. Modern Short Biographies and Autobiographies - Marston Balch

اس تفصیل کے بعداب میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں شبلی کی اولیت کا کیوں قائل ہوں۔ Donald A. Stauffer نے بیوگرفی کے دو Common forms متعین کئے ہیں:

1. Devotional in Purpose

2. Historical in Purpose

پہلی ہیئت کی بیوگرفی کی تعریف اس نے اس طرح کی ہے:

In the voluminous hagiographical collections and legendaries, the qualities of a Christian saint, reduced to a pattern, were illustrated in each particular life through a series of actions and miracles.

دوسری ہیئت کی تعریف وہ یوں کرتا ہے:

In the secular world, only the life of a man in high position was recorded, and the biography events of a King appeared as the succession of during his reign, plus a brief summary of his traits in the form of a Character Sketch.

ان دونوں تعریفوں کی روشنی میں شبلی کی سوانح کا فن متعین کرنے میں بڑی

دشواری ہوگی، لیکن اگر اس طرح سوچا جائے کہ شبلی نے Devotional سوانح Historical انداز میں لکھی ہیں تو اندازہ ہوگا کہ شبلی کا میدان حالی سے بالکل مختلف ہے۔ یہاں اختلاف ادبی اور تاریخی کا نہیں بلکہ فن اور ہیئت کا ہے۔ جدید سوانحی فن کے پیش نظر حالی کی سوانح Romantic Subjectivity کی حامل ہیں جن کے اندر ہم Intimate Biography کی ہیئت ملتی ہے، لیکن شبلی کے سارے افراد ان کے دور کے نہیں ہیں۔ ذاتی مشاہدہ، ربط، رشتہ کچھ بھی نہیں۔ صرف Heroworship نے ان کو اس فن کے لئے آمادہ کیا اور انہوں نے Heroes of Islam کا سلسلہ شروع کیا۔ اس جذباتی تعلق کا نتیجہ تھا کہ وہ Devotional سوانح کی طرف راجع تو ہوئے لیکن دیو مالا سے اپنا دامن آلودہ نہیں کیا۔ انہیں اگر آپ مغربی فن سوانح نگاری کا مقلد کہنا ہی چاہتے ہیں تو Stauffer کی تقسیم کے مطابق Scholarly Biography کا علمبردار کہہ سکتے ہیں۔ اس قسم کی تعریف وہ ان الفاظ میں کرتا ہے:

The exact, dispassionate marshalling of verifiable details.

شبلی کی تمام سوانح کا انداز یہی ہے۔ ورنہ اگر آپ مشرق کی روایت کو بھی کوئی اہمیت دینے کے لئے تیار ہیں تو سیرت ابن ہشام وغیرہ کو کیوں نظر انداز کرتے ہیں۔ ایسی صورت میں حالی کی اولیت مغرب سے مستعار لینے میں اور شبلی کی اولیت مشرقی فن کی نشاۃ ثانیہ میں ہے۔ حقائق کی روشنی میں دیکھئے تو اسماء الرجال کے فن کے متعارف ہونے سے پہلے انگریزی کیا مغرب کے کسی ادب میں بیوگرفی کا وجود نہیں تھا۔ مغرب نے بیوگرفی عربوں سے اندلس کے راستے سے سیکھی ہے۔ اب وہ اس کے بانی بن گئے ہیں۔ اپنی عصبیت کی بنا پر ہر فن کے موجد خود بن بیٹھے ہیں۔ حالی ان کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں۔ شبلی ان سے استفادہ کرتے ہیں لیکن مشرقی روح کو اسماء الرجال کے اصول پر سوانح میں زندہ کرتے ہیں۔ راوی، روایت،

درایت اورقرائن کومعیار بناتے ہیں۔اس میدان میں حالی کہاں ہیں؟

اب آپ غور کیجئے تو اندازہ کریں گے کہ شبلی کا اعتراض حیات جاوید کے سلسلہ میں درشت ضرورتھا،لیکن اتنا غلط بھی نہیں۔

فن سوانح نگاری کے بارے میں یہ میرا سطحی مطالعہ ہے جس سے میں نے اپنا زاویہ نظر مستنبط کیا ہے۔آپ کا کیا خیال ہے۔؟ آپ مناسب سمجھیں تو ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب (۳۲) سے بھی اس موضوع پر تفصیلی گفتگو کریں اور دیکھیں کہ وہ کیا کہتے ہیں،ان کی رائے سے مجھے بھی آگاہ کیجئے۔

مہدی حسن والے مقالہ کے سلسلہ میں دوبار آج کل کے مدیر کولکھ چکا ہوں وہ ہر بار یہی لکھتے ہیں کہ میں جلد شائع کرنے والا ہوں۔نقل اس لئے ارسال نہیں کرسکتا کہ مجھے فرصت نہیں ہے اور کوئی صاحب اتنی قربانی کریں گے نہیں کہ اسے نقل کردیں۔اس لئے اتنا انتظار تو کرنا ہی پڑے گا کہ وہ شائع ہوجائے۔

وحیدہ نسیم صاحبہ کا ذکر تو آپ نے دوخطوط میں کیا ہے،لیکن ان کا پتہ آپ نے کسی خط میں نہیں لکھا ہے۔اب پرچا انہیں کیسے بھیجا جائے۔؟

شبلی کے سلسلہ میں اعظم گڑھ والوں کا یہی رویہ ہے،معلوم نہیں اس قدر خائف ہونے اور چھپانے بچانے کا کیا فائدہ۔میں نے مرزا احسان احمد صاحب کو تفصیلی خط لکھا،انہوں نے جواب دیا تو صرف اس قدر کہ حیات شبلی پڑھ لیجئے۔اب اگر حیات شبلی ہی سے ساری باتیں حل ہوجاتیں تو کوئی آپ سے کیوں پوچھتا۔

نانیہال کے سلسلہ میں سند تو اسی وقت ملے گی جب آپ بندول جائیں گے، ورنہ صرف زبانی باتوں پر اعتبار کیجئے۔شیوراج سنگھ (۳۳) کے بارے میں سند بھی روتاروں کے کسی بزرگ سے معلوم ہوگی۔میں نے اس امر کے بارے میں کہیں پڑھا تھا لیکن اب وہ حوالہ یاد نہیں ہے۔یاد آنا بھی مشکل ہے کیونکہ ذہن دوسرے میدان میں آبلہ پا ہے۔

آپ کو اب بھی غلط یاد ہے کہ عرشی صاحب (۳۴) نے سرسید کے خطوط

مرتب کئے ہیں۔(۳۵)انہوں نے غالب کے خطوط کونواب یوسف علی خاں(۳۶) اور نواب کلب علی خاں (۳۷) والیان ریاست رام پور کے نام ''مکاتیب غالب'' کے نام سے رام پور سے ۱۹۳۷ء میں شائع کیا تھا۔اب یہی مجموعہ دوبارہ شائع ہوا ہے۔

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے اوراس طویل خامہ فرسائی کے لئے اعتذار قبول کریں گے۔ بہت سی باتیں اپنی جگہ پر الجھی ہوئی ہوں گی ان کونظر انداز کر دیجئے گا اوراپنے کام کی باتیں انتخاب کر لیجئے گا۔

میری کچھ کتابیں پاکستان سے شائع ہوئی ہیں۔کیا ان پر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب ریڈیو پر تبصرہ کر دیں گے؟اگر یہ ممکن ہوتو میں ان کتابوں کے نسخے قاعدہ کے مطابق پبلشر سے ارسال کرادوں۔یعنی یہ بھی لکھئے کہ کتنے نسخے تبصرہ کے لئے ہر کتاب کے مطلوب ہوتے ہیں؟ امید ہے کہ اس استفسار کا جواب آپ نہ بھولیں گے۔خدا کرے آپ مع الخیر ہوں گے۔والسلام

ابن فرید

خط نمبر-۸: مختار احمد مرحوم

مختار احمد مرحوم وکیل ہائی کورٹ الہ آباد علامہ شبلی کے شاگرد اور رشتہ دار مولوی محمد سمیع صاحب کے صاحبزادے تھے۔ وہ اعظم گڑھ کے ایک موضع کونرہ گہنی کے رہنے والے تھے لیکن ان کا قیام الہ آباد میں تھا،مولوی محمد سمیع علامہ شبلی کے ابتدائی دور کے شاگرد اور بے تکلف دوست تھے۔علامہ شبلی کے متعدد خطوط اور بیاض انہی کے پاس محفوظ تھے جو انہوں نے مکاتیب شبلی کی تدوین کے زمانہ میں سید صاحب کے سپرد کئے تھے۔اس قدر تعلق کے باوجود ان کے حالات دستیاب نہیں،تاہم پروفیسر سید یحیٰ احمد ہاشمی کا یہ رابطہ بجا تھا کہ مختار احمد صاحب سے گھریلو اور نج کے تعلقات مل سکتے تھے مگر افسوس کہ مختار احمد صاحب مرحوم کسی طرح کی معلومات فراہم نہ کر سکے، جیسا کہ ان کے خط سے بھی واضح ہے۔خط درج ذیل ہے:

۱۹۶۳/۱۲/۳ء

مکرم بندہ تسلیم۔ والا نامہ صادر ہوا۔

علامہ شبلی مرحوم کی پہلی اہلیہ کا نام مجیدن بی بی تھا۔ دوسری اہلیہ مولوی محمد سمیع صاحب مرحوم کی عزیزہ ضرور تھیں، نام یاد نہیں ہے۔ سنہ شادی یاد نہیں۔ حامد بھائی مرحوم کے گھر سے چلے جانے کا حال بھی نہیں معلوم۔ اور نہ سبب معلوم۔ دوسری شادی و حامد بھائی مرحوم دونوں واقعات ایسے ہیں جو میرے بسلسلہ باہر بغرض حصول تعلیم کے ہوئے۔ لہذا جواب شافی نہ دے سکا۔ امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

حامد بھائی مرحوم کے پانچ لڑکیاں ہیں۔

مختار احمد۔ الہ آباد

ان چند خطوط سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی نے کس درجہ دلچسپی اور محنت و تحقیق سے مقالہ لکھنے کی کوشش کی، اس سلسلہ کے تمام خطوط محفوظ نہیں رہ سکے ہیں کیونکہ جن اہل علم سے خط و کتابت ہوئی ان کی تعداد کے مقابلہ میں خطوط کی تعداد بہت کم ہے، تاہم جو خطوط دستیاب ہوئے ہیں وہ علامہ شبلی کی فکر و نظر پر کسی اہم مقالہ سے کم حیثیت نہیں رکھتے۔ ○

تعلیقات و حواشی:

(۱) پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی، شبلی کا ذہنی ارتقاص ۱۱، مجلس یادگار ہاشمی کراچی، ۱۹۹۶ء

(۲) ایضاً ص ۱۲

(۳) ریاست علی تاج، سید نجیب اشرف ندوی حیات اور کارنامے، ص ۲۸، مکتبہ شعر و حکمت حیدر آباد، ۱۹۸۱ء

(۴) مولانا مسعود علی ندوی [۱۸۸۴-۱۹۶۷ء] معمار دارالمصنّفین اعظم گڑھ

علامہ شبلی نعمانی کے جن تلامذہ نے دارالمصنّفین کی تعمیر و ترقی کے لئے اپنی زندگی قربان کر دی ان میں مولانا مسعود علی ندوی کا نام بہت نمایاں اور مولانا سید سلیمان ندوی کے ساتھ لیا جاتا ہے۔ ان کا وطن بھیارہ ضلع بارہ بنکی تھا۔ ندوۃ العلماء سے تعلیم کی تکمیل کی۔ ۱۹۱۳ء میں علامہ شبلی ندوہ سے مستعفی ہو کر جب

اعظم گڑھ آئے اور دارالمصنّفین کے قیام کے لئے جدوجہد شروع کی تو سب سے پہلے مولانا مسعود علی ندوی ان کا ہاتھ بٹانے کے لئے اعظم گڑھ آئے۔شبلی منزل کو دارالمصنّفین کے قیام کے لئے انہوں نے پسند کیا اور پھر علامہ شبلی کی وفات کے بعد دارالمصنّفین کی تعمیر وترقی کے لئے مستقل طور پر اعظم گڑھ آ گئے۔ مدۃ العمر مہتمم کی حیثیت سے اس کی خدمت کرتے رہے اور پھر اسی کی خاک کا پیوند ہوئے۔ان کے سیاسی، سماجی خدمات بھی گونا گوں ہیں۔

(۵) مرزا احسان احمد [۱۸۹۶-۱۹۷۲ء] علامہ شبلی کے دوست مولوی مرزا محمد سلیم کے صاحبزادے تھے۔شبلی نیشنل اسکول اعظم گڑھ سے انٹرنس اور علی گڑھ سے بی اے، ایل ایل بی کی اسنادلیں،شعروادب کا بڑا عمدہ مذاق رکھتے تھے۔تاہم مدۃ العمر اعظم گڑھ میں وکالت کرتے رہے۔نثر میں مقالات احسان اور نظم میں پیام کیف اور پیام زندگی ان کی ادبی وشعری یادگاریں ہیں۔علامہ شبلی کے عزیز بھی تھے۔ان کے بھائی شوکت سلطان صاحب پرنسپل شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ علامہ شبلی کی پوتی تحسین جہاں مرحومہ سے منسوب تھے۔اس خانوادے نے دارالمصنّفین کی تعمیر وترقی سے بڑی دلچسپی لی اور بڑا تعاون کیا۔ یہ دونوں بھائی دارالمصنّفین کی انتظامیہ کے رکن تھے۔حاجی شوکت سلطان صاحب کے لائق فرزند ڈاکٹر سلمان سلطان صاحب آج بھی دارالمصنّفین کے فعال رکن ہیں اور اس کے لئے برابر فکرمند رہتے ہیں۔

(۶) لکڑی کا پاؤں: علامہ شبلی، شبلی منزل میں مقیم تھے اور شعرالعجم لکھ رہے تھے کہ ۷ار مئی ۱۹۰۷ء کو بھری بندوق ایک جگہ سے دوسری جگہ رکھتے ہوئے ان کی بہو سے دب گئی جس کی زد میں علامہ شبلی کی پنڈلی آ گئی اور ہڈیاں چور چور ہوگئیں، مجبوراً ڈاکٹروں کو وہ پاؤں کاٹنا پڑا، جب زخم اچھا ہوگیا تو علامہ نے بمبئی جا کر لکڑی کا پاؤں بنوایا، یہ پاؤں بہت وزنی تھا اس لئے چند ماہ کے بعد حیدرآباد جا کر دوسرا بنوایا، یہ دوسرا پاؤں افسرالملک نے بنوایا تھا، یہی پاؤں اب دارالمصنّفین کے میوزیم میں رکھا ہوا ہے۔افسرالملک نے جس دن یہ پاؤں علامہ شبلی کی خدمت میں پیش کیا اسی دن انہیں سر کا خطاب ملا، علامہ شبلی نے ان سے مذاح کیا کہ آپ نے مجھے پاؤں دیا تو اللہ نے آپ کو سر دیا۔

(۷) تبرکات شبلی: دارالمصنّفین کے میوزیم میں علامہ شبلی کی کتابوں کے متعدد مسودات اور خطوط وغیرہ محفوظ ہیں، ان کے علاوہ ان کے ملبوسات بھی ہیں جس میں قمیص، پائجامہ، شال اور شروانی وغیرہ شامل ہیں، جس سے ان کے ذوق اور نفاست پسندی وغیرہ کا اندازہ ہوتا ہے۔

(۸) شاہ نعیم: ڈاکٹر شاہ محمد نعیم ندوی [۱۹۱۴-۱۹۸۴ء] ادیب، محقق، ماہر تعلیم، صدر شعبہ اردو سندھ یونیورسٹی، انہوں نے شبلی کی علمی وادبی خدمات کے موضوع پر مقالہ لکھ کر سندھ یونیورسٹی سے ۱۹۷۱ء میں پی ایچ ڈی کی سند لی تھی۔

(۹) مسز خاں: تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

(۱۰) عقیلہ: تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

(۱۱) غالباً اسماعیل یوسف کالج ممبئی کے سالانہ مجلّہ کی طرف اشارہ ہے جس میں سید نجیب اشرف ندوی کا مشہور مقالہ ''شبلی اور بمبئی'' شائع ہوا تھا، جواب کہیں دستیاب نہیں۔

(۱۲) شعر العجم: علامہ شبلی کی انتہائی مشہور اور معرکتہ الآرا کتاب جو پانچ جلدوں پر مشتمل ہے اور جس میں فارسی شعر وادب کی تاریخ قلم بند کی گئی ہے۔ اس کے فارسی تراجم ایران اور افغانستان سے شائع ہو چکے ہیں۔

(۱۳) خطوط شبلی: فیضی خواتین کے نام علامہ شبلی کے خطوط جسے منشی امین زبیری نے خطوط شبلی کے نام سے شائع کیا تھا۔ پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی کو غالباً اصل خطوط کی تلاش تھی۔ نہ جانے کیوں انہوں نے عطیہ فیضی سے رابطہ نہیں کیا، حالانکہ اس وقت عطیہ فیضی وہیں کراچی ہی میں مقیم تھیں۔ اصل خطوط انہی کے پاس تھے، اس لئے کہ امین زبیری نے خطوط شبلی کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ اصل خط پر پنسل سے نشان لگا دیا گیا تھا جس پر وہ بہت برہم ہوئیں، اس سے واضح ہوتا ہے کہ اصل خطوط انہوں نے واپس کر دئے تھے۔ البتہ اب یہ معلوم نہیں کہ وہ خطوط کہاں محفوظ ہیں، ممکن ہے کراچی میں عطیہ کے اثاثہ میں ہوں۔

(۱۴) ادیب: جامعہ اردو علی گڑھ کا ترجمان، اس کا شبلی نمبر بے حد وقیع ہے۔

(۱۵) ڈاکٹر نذیر احمد: یہ کون صاحب تھے معلوم نہیں ہوسکا، غالباً مشہور فارسی داں اور اہل قلم ڈاکٹر نذیر احمد مراد ہیں لیکن وہ تو ہندوستان میں مقیم تھے؟ پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی سے ان کا پتہ معلوم کرنے سے شبہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی اور ڈاکٹر نذیر احمد تھے۔

(۱۶) نوائے ادب: انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی کا سہ ماہی ترجمان جو اب بھی پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ پروفیسر نجیب اشرف ندوی صاحب اس کے بانی مدیر تھے۔ موجودہ مدیر پروفیسر عبدالستار دلوی صاحب ہیں۔

(۱۷) پروفیسر ہارون خاں شروانی: آئندہ سطور میں ان کا تذکرہ آیا ہے۔

(۱۸) مولوی نصیرالدین ہاشمی [۱۸۹۵-۱۹۶۴ء] اردو اور دکنیات کے ممتاز اہل قلم، ادیب و نقاد اور کثیر التصانیف مصنف، ان کی مشہور کتابوں کے نام یہ ہیں:

حضرت امجد کی شاعری، دکنی ہندو اور اردو، حیدرآباد کی نسوانی دنیا، سلاطین دکن کی ہندوستانی شاعری، کتب خانہ آصفیہ کے اردو مخطوطات (دو جلدیں) کتب خانہ سالار جنگ کی قلمی کتابوں کی وضاحتی فہرست، تذکرہ دارالعلوم، مکتوبات امجد، خواتین دکن کی اردو خدمات، دکنی کلچر، فلم نما، دکن میں اردو، تذکرہ مولوی محمد مرتضیٰ، مدراس میں اردو، یورپ میں دکھنی مخطوطات، تاریخ عطیات آصفی، حیدرآباد ایجوکیشنل کانفرنس، خواتین عہد عثمانی، ملکہ حیات بخشی بیگم، دکھنی کے تحقیقی مقالات، وغیرہ۔

(۱۹) ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد میں علامہ شبلی کے چند خطوط اور بعض دوسری تحریریں محفوظ تھیں، خطوط نقوش لاہور کے مکاتیب نمبر میں شائع ہو گئے تھے۔ راقم نے انہیں مکتوبات شبلی میں شامل کر دیا ہے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنے ایک مضمون ''شبلی کے بارے میں چند غیر مطبوعہ اطلاعات'' میں اس کی تفصیل لکھی ہے۔ (صبا، حیدرآباد، شبلی نمبر ۱۹۵۸ء ص ۳۳-۳۹)

(۲۰) مولوی عقیل احمد: تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔

(۲۱) مقالات شبلی آٹھ جلدوں میں دارالمصنّفین نے شائع کئے ہیں۔

(۲۲) موازنہ انیس و دبیر کے جواب میں تین کتابیں ردالموازنہ، تردید الموازنہ اور المیز ان لکھی گئی ہیں۔ حیات دبیر میں بھی ان سے تعارض کیا گیا ہے۔

(۲۳) حالی کا ذہنی ارتقاء، مصنفہ پروفیسر غلام مصطفیٰ خاں، مکتبہ کارواں کراچی، ۱۹۶۶ء

(۲۴) ملاحظہ ہو تقدیم ''شبلی کی حیات معاشقہ'' ص ۱۶، ٹی اینڈ ٹی پبلشرز لاہور، طبع سوم، ۲۰۱۳ء

(۲۵) پروفیسر وحیدہ نسیم [۱۹۲۷ - ۱۹۹۶ء] ممتاز اہل قلم، ادیبہ، شاعرہ، افسانہ نگار اور ناول نویس تھیں۔ اودھ بارہ بنکی اور کاکوری کے مخدوم زادگان کے خاندان سے تھیں، لیکن حیدرآباد میں پیدا ہوئیں، وہیں تعلیم حاصل کی، ۱۹۵۲ء میں پاکستان منتقل ہو گئیں۔ اردو زبان اور عورت ان کا مشہور لسانی رسالہ ہے جس کا مقدمہ جوش ملیح آبادی [۱۸۹۸-۱۹۸۲ء] کے قلم سے ہے۔ شاہان بے تاج [تذکرہ صوفیا] نسوانی محاورے، لغات النساء وغیرہ علمی کتابیں ہیں، ان کے علاوہ دیپک محل، راج محل، گگن محل، داستاں در

داستاں، شبورانی، ایک لڑکی، ان کے ناول اور افسانوں کے مجموعے ہیں۔ ''موج نسیم'' کے نام سے شعری مجموعہ بھی شائع ہوا ہے۔

(۲۶) جناب احمد اسحاق نعمانی [پ: ۲۷؍ستمبر ۱۹۳۷ء] علامہ شبلی کے بھائی محمد اسحاق مرحوم وکیل ہائی کورٹ کے پوتے ہیں۔ علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی ہے، آرمی کی ملازمت سے سبکدوشی کے بعد ممبئی میں مقیم ہیں۔ دور طالب علمی میں ان کا مقالہ ''شبلی کی محرومیاں'' [علی گڑھ میگزین ۱۹۵۷ء ص ۷۶-۸۴] کافی موضوع بحث بنا تھا۔ ''مقالہ نما برائے شبلی'' سے کتابیات شبلی کا آغاز انہیں نے کیا تھا جو پہلے ماہنامہ آج کل دہلی میں شائع ہوا بعد ازاں ادیب علی گڑھ کے شبلی نمبر میں شامل ہوا۔

(۲۷) اس وقت شبلی نیشنل پی جی کالج اعظم گڑھ کے پرنسپل حاجی شوکت سلطان مرحوم تھے، جن سے علامہ شبلی کی ایک پوتی تحسین جہاں منسوب تھیں۔ شوکت سلطان صاحب مرحوم ''افکار سہیل'' کے مرتبین میں سے ہیں۔

(۲۸) ڈاکٹر ابن فرید کو سہو ہوا، علامہ شبلی کے سوتیلے بھائی کا نام مظفر نہیں محمد تھا، مظفر ان کے صاحبزادے کا نام تھا۔

(۲۹) صریر خامہ: تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔

(۳۰) پروفیسر کبیر احمد جائسی [۱۹۳۶ء-۲۰۱۳ء] ممتاز اہل قلم، ادیب و شاعر اور محقق و مترجم تھے، علی گڑھ میں پروفیسر رہے۔ ان کے قلم سے متعدد کتابیں نکلیں۔ وہ فارسی شعر و ادب کے بڑے اداشناس بلکہ اصلاً ایران شناس تھے۔ ایرانی مفسرین اور ان کی تفسیریں ان کی مشہور کتاب ہے جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ ادبی و تنقیدی مضامین کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں، وہ ایک بڑے خاکہ نگار بھی تھے۔ خاکوں کے بھی دو مجموعے شائع ہوئے۔ ان کا مجموعہ کلام بھی شائع ہوا۔ ڈاکٹر ابن فرید کے خاص احباب میں تھے۔ جس زمانے کا ذکر ہے وہ طالب علم تھے اور انتہائی محنت و تحقیق سے تحصیل علم میں مصروف تھے۔

(۳۱) ڈاکٹر سید شاہ علی: ممتاز اہل قلم اور ادیب و نقاد تھے۔ ''اردو میں سوانح نگاری'' ان کا بڑا اہم تحقیقی مقالہ ہے۔

(۳۲) ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں [۱۹۱۲-۲۰۰۵ء] بڑے عالم و فاضل شخص تھے۔ ان کے قلم سے تقریباً دو درجن بلند پایہ علمی و تحقیقی کتابیں نکلیں۔ چند اہم کتابوں کے نام یہ ہیں:

حالی کا ذہنی ارتقاء، فارسی پر اردو کا اثر، فارسی کے قدیم شعرا، علمی نقوش، سندھی اردو لغت، اردو سندھی لغت، تحریر و تقریر، حضرت مجدد الف ثانی، تحقیقی جائزے، وقائع تاریخی، چند منسوبات، باقیات باقی، اردو میں قرآن و حدیث کے محاورات، اقبال اور قرآن، معارف اقبال، مطالب القرآن، تاریخ اسلاف وغیرہ۔ انہوں نے متعدد کتابوں کے ترجمے بھی کئے اور بعض کتابوں کو مرتب کر کے شائع کرایا۔ تصوف و سلوک سے انہیں خاص مناسبت تھی۔ ان کا شمار صلحا و صوفیا میں کیا جاتا ہے۔ اس سے متعلق انہوں نے بعض کتابیں بھی لکھیں اور مرتب کیں۔

(۳۳) شیوراج سنگھ: علامہ شبلی کے جد امجد جو مشرف بہ اسلام ہوئے اور ان کا نام سراج الدین رکھا گیا، ان کا مزار بندول کے شروع میں ایک باغ میں واقع ہے۔ قبر پختہ ہے۔

(۳۴) امتیاز علی خاں عرشی [۱۹۰۴ء-۱۹۸۱ء] بڑے عالم و فاضل، اہل قلم اور محقق تھے۔ عربی، فارسی اور انگریزی پر بڑی قدرت حاصل تھی۔ ان زبانوں میں ان کی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، لیکن ان کا اصل میدان غالبیات تھا بلکہ غالبیات کے وہ بڑے ماہر تھے۔ خطوط غالب اور دیوان غالب کے محقق ایڈیشن ان کے یادگار کارنامے ہیں۔ وہ مدۃ العمر رام پور رضا لائبریری سے وابستہ رہے اور پھر اسی کی خاک میں آسودہ بھی ہوئے۔

(۳۵) خطوط سرسید، سرسید کے پوتے سر راس مسعود [۱۸۸۹-۱۹۳۷ء] نے مرتب کیا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ۱۹۲۴ء میں نظامی پریس بدایوں سے طبع ہوا تھا۔

(۳۶) نواب یوسف علی خاں: والی رام پور، غالب کے مکتوب الیہ

(۳۷) نواب کلب علی خاں: والی رام پور، غالب کے مکتوب الیہ

ooo

[۱۵]

علامہ شبلی کی چند غیر مدون تحریریں

علامہ شبلی نعمانی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کی نادر تحریروں کے مجموعہ ''نوادرات شبلی'' کی ۲۰۱۷ء میں اشاعت کے وقت خیال تھا کہ اب کوئی تحریر شاید ہی ملے، مگر یہ خیال خام ثابت ہوا اور بہت جلد چند اہم، قیمتی، نادر اور غیر مدون تحریریں قدیم کتب و رسائل سے دستیاب ہو گئیں اور کئی اور تحریروں کا سراغ بھی لگا۔ مثلاً:

۱۔ عہد سرسید میں ایم.اے.او.کالج علی گڑھ میں جو بک ڈپو قائم ہوا تھا، جسے ڈیوٹی شاپ بھی کہتے تھے، اس کے ایک ذمہ دار ایم.اے.او.اسکول کے استاد اور علامہ شبلی نعمانی کے دوست میر ولایت حسین [۱۸۶۲-۱۹۴۹ء] تھے۔ انہوں نے اپنے عہد میں ڈیوٹی شاپ کی ایک ''مختصر فہرست کتب'' شائع کی تھی، جس میں سرسید احمد خاں، ڈپٹی نذیر احمد اور مولانا حالی وغیرہ کی کتابوں کی تفصیلات درج تھیں۔ میر ولایت حسین نے اس فہرست پر علامہ شبلی سے مقدمہ لکھوایا تھا۔ (۱) یہ فہرست مولانا آزاد لائبریری کے عبدالسلام کلکشن (اردو) میں محفوظ تھی۔ جو تلاش بسیار بلکہ تمام تر کوششوں کے باوجود اب تک دستیاب نہیں ہو سکی ہے۔ چوں کہ اس میں سرسید، مولانا حالی اور ڈپٹی نذیر احمد وغیرہ کی کتابوں کا ذکر ہے، اس لئے خیال ہوتا ہے کہ علامہ شبلی نے ان شخصیات اور ان کی کتابوں کے بارے میں ضرور اظہار خیال کیا ہوگا۔

۲۔ ہمارے کرم فرما ڈاکٹر سید حسن عباس صاحب ڈائرکٹر رام پور رضا لائبریری کی اطلاع کے مطابق مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی نے صمصام الاسلام کے نام سے فتوح الشام واقدی کا منظوم اردو ترجمہ کیا تھا جو ۱۹۱۴ء میں آگرہ سے شائع ہوا تھا۔ اس کی تقریظ بھی علامہ شبلی کے قلم سے ہے، لیکن یہ منظوم ترجمہ اب تک دستیاب نہیں ہوسکا ہے۔ اسی نام سے فتوح الشام کا منظوم

اردو ترجمہ سید عبدالرزاق کلامی نے بھی کیا ہے۔ جو مطبع نول کشور لکھنؤ سے ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا ہے۔ اسے راقم الحروف نے دیکھا ہے۔ اس میں کئی تقریظات شامل ہیں۔ لیکن علامہ شبلی کی تقریظ شامل نہیں ہے۔ البتہ اس میں مولانا حمیدالدین فراہی [۱۸۶۴-۱۹۳۰ء] کے استاد مولوی محمد مہدی چتاروی [موضع چتارہ، اعظم گڑھ] کی منظوم اردو تقریظ شامل ہے۔ (۲) مولوی محمد مہدی چتاروی اعظم گڑھ کے قدیم علما میں ہیں۔ اس منظوم تقریظ سے ان کی شاعری کا بھی کسی قدر اندازہ ہوتا ہے۔

یقین ہے صمصام الاسلام کی تقریظ شبلی ایک نہ ایک دن ضرور دستیاب ہوگی۔ اس لئے کہ اس کی اطلاع ایک محقق ڈاکٹر سید حسن عباس نے ایک بڑے محقق مولانا امتیاز علی خاں عرشی [۱۹۰۴-۱۹۸۱ء] کے حوالہ سے فراہم کی ہے۔

اس عاجز کم مایہ نے اپنی کتاب ''آثار شبلی'' [مطبوعہ ۲۰۱۳ء] کے آخری باب میں جن نادر تحریروں کی نشاندہی کی تھی، اس میں مذکور بیشتر تحریریں ''نوادرات شبلی'' میں شامل ہوچکی ہیں۔ البتہ درج ذیل غیر مطبوعہ تحریروں کی اب بھی تلاش و جستجو ہے۔

۳۔ چند خطوط شبلی جو نواب جنجیرہ کے ذخیرہ میں محفوظ ہیں اور جنجیرہ کی ایک نمائش میں رکھے گئے تھے۔ اس کی اطلاع ہمارے دوست مولانا عبدالبر اثری نے دی تھی۔

۴۔ علامہ شبلی کے دوست اور حیدرآباد کے مشہور قانون داں سید ہمایوں مرزا [۱۸۷۰-۱۹۳۸ء] کی اہلیہ بیگم صغرا ہمایوں مرزا [۱۸۸۴-۱۹۷۴ء] بڑی ذی علم خاتون تھیں، انہوں نے متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ ان کی ایک کتاب ''مشیر نسواں'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ اس مطبوعہ کتاب پر بھی علامہ شبلی نے تقریظ لکھی تھی جو ۷/مارچ ۱۹۱۳ء کی مرقومہ ہے۔ یہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد کے ذخیرہ میں محفوظ تھی۔ (۳) مگر اب دستیاب نہیں۔

۵۔ اسی طرح ''تاریخ کوسگی'' مؤلفہ مولوی سید عبداللہ حسینی پر علامہ شبلی کی ۱۹۰۶ء کی لکھی ہوئی غیر مطبوعہ تقریظ بھی ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد میں محفوظ تھی۔ جس کا اب کسی کو علم نہیں۔ مذکورہ بالا دونوں تقاریظ کا ذکر ڈاکٹر محی الدین قادری زور نے اپنے ایک مضمون مطبوعہ ماہنامہ صبا حیدرآباد شبلی نمبر میں کیا ہے۔ (۴)

عدم دستیاب تحریروں کی یہ تفصیل ہے، البتہ گذشتہ دنوں مطالعہ کے دوران علامہ شبلی کی

درج ذیل غیر مدون اور نادر تحریریں دستیاب ہوئی ہیں:

۱۔ اردو کے ممتاز اور کہنہ مشق شاعر جناب ناوک حمزہ پوری کے والد سید غلام رسول قوس حمزہ پوری [۱۸۸۵-۱۹۶۳ء] بڑے عالم، فاضل، ادیب، شاعر اور اہل قلم تھے۔ مدۃ العمر دادِ سخن دیتے رہے۔ ان کی شاعری کے مداح حالی، شبلی اور ڈپٹی نذیر احمد تھے۔ ان کے کلام کے دو مجموعے قرینہ غزل اور قوس قزح ان کے صاحبزادے ناوک حمزہ پوری نے مع ترجمہ مرتب کر کے شائع کر دئے ہیں۔ ایک کتاب ''جلوہ گاہ پیغمبر'' بھی ان کی یادگار ہے۔ کئی کتابیں اور مجموعہ کلام غیر مطبوعہ ہیں اور بعض ضائع ہو گئے۔ (۵)

علامہ شبلی ۱۹۰۴ء میں دستار بندی کے موقع پر مولوی عبدالحق حقانی کے ساتھ ضلع گیا بہار تشریف لے گئے تھے۔ اس موقع پر قوس حمزہ پوری کی ان سے پہلی ملاقات ہوئی۔ پھر وہ ان کے ایسے گرویدہ ہوئے کہ ملاقات کے لئے لکھنؤ پہنچ گئے۔ ان دنوں علامہ شبلی ندوہ کے معتمد تعلیم تھے اور ان کا قیام امین آباد (لکھنو) میں تھا۔ لکھنؤ میں ان کی ملاقات حکیم عبدالعزیز [۱۲۷۱-۱۳۲۹ھ] کے دولت کدے پر ایک تقریب میں ہوئی۔ دوسرے دن وہ علامہ شبلی کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس ملاقات کی تفصیل ناوک حمزہ پوری کے قلم سے ملاحظہ ہو، وہ لکھتے ہیں:

> ''حضرت علامہ نے قوس سے ان کی چند غزلیں سنیں۔ ۲۵-۲۶ رسال کے نوجوان سے حضرت علامہ کو غالباً فارسی میں پختہ کلامی کی توقع نہیں رہی ہوگی۔ اس لئے قوس کا کلام سن کر انہیں یک گونہ تعجب ہوا۔ حضرت علامہ نے امتحاناً اپنی ایک غزل کا مطلع قوس کو دیا اور اس زمین میں ایک مطلع کہنے کی فرمائش کی:
>
> اے کہ گفتی رہ و رسم تو نہ ایں می باید
> ما ہمینیم کہ ہستیم و ہمیں می باید
>
> حضرت قوس نے محض تین چار منٹوں کے غور وفکر کے بعد یہ شگفتہ مطلع کہہ کر پیش کیا:
>
> جام مے در کف و در بر بت چیں می باید
> بندہ عشقم و دنیا و نہ دیں می باید

بقول حضرت قوس علامہ موصوف شعر سن کر پھڑک اٹھے۔ نہایت مسرور ہوئے۔ بار بار شعر کو پڑھتے تھے اور کلام کی فصاحت و بے ساختگی کی داد دیتے تھے۔

اس کے بعد قوس کو اپنی شاگردی کا شرف بخشا۔ دیوان قوس کو بغرض اصلاح رکھ لیا اور دو ماہ بعد حضرت قوس کے قیام لکھنؤ کے درمیان کلام قوس کی نوک پلک درست کر دی۔ دوران قیام جو تازہ کلام قوس نے کہا اسے بھی دکھلاتے رہے۔

ان دنوں علامہ کا دستور یہ تھا کہ دس بجے شب کے بعد منتہی تلامذہ (ندوہ) کو بصورت سوال و جواب یا کبھی بہ شکل لکچر درس دیا کرتے تھے۔ موقع سے فائدہ اٹھا کر حضرت قوس بھی اکثر اس جماعت میں شامل ہو جایا کرتے تھے اور بقول خود اس مختصر مدت میں بھی بے حد فیض اٹھایا۔''(۶)

دو ماہ قیام کے بعد قوس حمزہ پوری اپنے وطن حمزہ پور واپس آ گئے، تاہم دونوں میں مراسلت کا سلسلہ قائم رہا۔ ناوک حمزہ پوری نے اپنی کتاب ''قوس حمزہ پوری: ایک تعارف'' میں علامہ شبلی کا ایک خط بھی نقل کیا ہے جو ان کے پاس محفوظ ہے۔ یہ خط مکاتیب شبلی کے کسی مجموعہ میں شامل نہیں ہے۔ خط حسب ذیل ہے:

''عزیزی مولوی قوس سلمہ:

زندہ باشی و جاوداں باشی

حکیم عبدالعزیز مرحوم حج سے واپس آ کر کم و بیش سال بھر زندہ رہ کر واصل الی اللہ ہوئے۔ میں ان کے فاتحہ چہلم اور مجلس مولود شریف میں شریک ہوا تھا۔ ان کے بھائی حکیم عبدالحفیظ صاحب سے اگر رجوع کرنا چاہو تو لکھنؤ آ سکتے ہو۔ مولانا نذیر احمد اور مولانا حالی کے خطوط سے معلوم ہوا کہ دونوں صاحبوں نے تمہارے پاس کلیات قوس سے متعلق اپنی بیش بہا رائیں بھیج دی ہیں۔ کلیات سے عربی قصائد نکال ڈالو، جب ان کا اسلوب بیان بھی شعرائے عرب کے مطابق نہیں تو محض عربی کی عبارت سے کیا فائدہ؟ خدا تمہارے کلام کو حسن قبول بخشے۔ یہ کلام پند و نصائح کا خزینہ اور قومی خط و خال کا آئینہ ہے۔ غزلیات کی بندشیں کچھ سست ہیں لیکن اور

اصناف سخن ادب کی جان اور اخلاقی تعلیم کی زندہ تصویریں ہیں۔ دعا ہے کہ خدا تمہارے گلشن تخیل کو غالب کی جنت نظر اور فردوس گوش بنائے۔ آمین

شبلی

۷رنومبر۱۹۱۲ء(۷)

۲۔ اردو کے نامور ادیب نوبت رائے نظر[۱۸۶۶-۱۹۲۳ء] اور ان کے مشہور رسالہ ادیب الہ آباد سے اہل نظر بخوبی واقف ہیں۔ ادیب کی بڑی خدمات ہیں۔ اس کے مشمولات پر علامہ شبلی نے نوبت رائے نظر کو ایک خط لکھا تھا، چونکہ یہ خط علم وادب کی ترقی سے متعلق تھا اس لئے انہوں نے اس کا ایک اقتباس ادیب میں نقل کیا تھا جو درج ذیل ہے:

''ادیب کے حسن ظاہری میں کیا شک اور حسن معنوی میں بھی اردو کے کسی رسالہ سے کم نہیں۔ یا یوں کہئے کہ کوئی رسالہ اس سے بڑھ کر نہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اب ایک محدود دائرہ سے قدم آگے بڑھانا چاہئے۔ اب تک جو کچھ ہورہا ہے یا اپنی داستانیں ہیں یا یورپ کی نہایت سرسری معلومات۔ اس سے زبان کی ترقی کا قدم آگے نہیں بڑھتا۔ کوشش کی جائے کہ ہربرٹ اسپنسر اور ہکسلے وغیرہ کا فلسفہ اردو زبان میں آئے۔ انگریزی سے اردو میں جو کچھ منتقل ہورہا ہے اوچھے اور ادنیٰ درجہ کے معلومات ہیں۔ ان کو کہاں تک بار بار پڑھئے۔ یوروپین معلومات کے لحاظ سے آج سے دس برس پہلے ہم لوگ جہاں تھے اب بھی وہیں ہیں۔''(۸)

ان دونوں خطوط کے ملنے سے مکاتیب شبلی کی تعداد ۱۱۱۹ ہوگئی ہے۔

۳۔ اردو فارسی کے ممتاز اور قادر الکلام شاعر سید رضا علی وحشت [۱۸۸۱-۱۹۵۶ء] علامہ شبلی کے بڑے قدر دانوں میں تھے۔ ان پر انگریزی میں مضمون لکھا جو ۱۹۰۹ء میں کلکتہ کے اخبار مارننگ نیوز میں شائع ہوا۔ ایک بار مسلم انسٹی ٹیوٹ کلکتہ کے جلسہ میں ان کی دعوت پر علامہ شبلی شریک ہوئے۔ اس موقع پر انہوں نے فارسی میں استقبالیہ نظم پڑھی جس کے ہر شعر سے ان کی عقیدت شبلی کے جذبات ظاہر ہوتے ہیں۔ دونوں کے درمیان خط وکتابت بھی رہی مگر کوئی خط دستیاب نہیں ہے۔ وحشت کا پہلا دیوان شائع ہوا اور انہوں نے علامہ شبلی کی خدمت میں بھیجا تو

انہوں نے لکھا کہ:

''آپ کے کلام میں من حیث الاغلب جدت، ندرت اور پختگی ہوتی ہے۔
غالب اور مومن کی ترکیبیں اور طرز آپ سے خوب بن پڑتی ہیں۔''(۹)

۴۔ ۱۹۰۵ء سے کچھ پہلے جامع مسجد اعظم گڑھ میں حنفیوں اور اہل حدیثوں کے درمیان آمین بالجہر اور بالخفا کے تنازع کے پس منظر میں ایک اہل حدیث عالم شیخ قادر بخش نے مولانا خدا بخش سے ایک استفتاء تیار کرایا اور اسے مولوی محمد یعقوب الہ آبادی امام وخطیب جامع مسجد اعظم گڑھ اور علامہ شبلی کی خدمت میں پیش کیا اور فتویٰ مانگا، چنانچہ ان دونوں بزرگوں نے جو فتاوے دیئے انہیں اپنی ایک تحریر کے ساتھ ۱۹۰۵ء میں سعید المطابع بنارس سے طبع کرا کے جامع مسجد اعظم گڑھ کے مصلیوں میں تقسیم کیا۔(۱۰) چوں کہ یہ علامہ شبلی کا واحد دریافت فتویٰ ہے اور اس سے اہل حدیث مسلک کے بارے میں ان کی عہد شباب کی شدت میں واضح کمی محسوس ہوتی ہے۔اس لئے استفتاء کے ساتھ اسے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔شیخ قادر بخش کا استفتاء یہ ہے:

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

ما قولہم رحمہ اللہ تعالی۔ایک شخص اپنے کو امام ابوحنیفہؒ کا مقلد کہتا ہے اور مسائل اجتہادیہ میں جناب امام صاحب کا حکم تسلیم کرتا ہے اور نماز میں رفع یدین و آمین بالجہر بنظر اتباع سنت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے کرتا ہے، اس کو منع کیا جاتا ہے کہ تم اس مسجد میں جس میں ہم لوگ آمین بالخفا کرتے ہیں، رفع یدین و آمین بالجہر نہ کہا کرو۔ہم لوگوں کی نماز خراب ہوتی ہے تو کہتا ہے کہ میں اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت جان کر کرتا ہوں، نہ بہ نیت لہو ولعب کے۔ یہ فعل اس کا حدیث صحیح سے ثابت ہے یا نہیں۔اگر ثابت ہے تو ایسے شخص کے پیچھے نماز جائز ہوتی ہے یا نہیں۔آمین بالجہر کہنے والا جماعت میں شریک ہو کر آمین بالجہر کہے تو اس کے کہنے سے آمین بالخفا کہنے والے کی نماز فاسد ہوتی ہے یا نہیں اور اگر اس شخص کو اپنی جماعت میں نماز نہ پڑھنے دینا کیسا ہے اور جو لوگ اس کو مسجد و جماعت سے منع و باز

رکھتے ہیں، مستحق ثواب ہیں یا عذاب؟
اس کا جواب للہ حق، بلاتعصب و جانبداری کے بصراحت ارقام فرمایئے۔
فقط شیخ قادر بخش

جواب

آمین جو شخص بجہر کہتا ہے اس کے پیچھے نماز یقیناً درست ہے۔ نماز تو فاسق کے پیچھے بھی درست ہے اور آمین بجہر کہنے والا تو فاسق بھی نہیں ہے اور جماعت سے ایسے شخص کو الگ نہ کرنا چاہیئے اور اس شخص کے آمین بجہر کہنے سے دوسروں کی نماز میں کچھ اثر نہیں پڑتا اور جماعت سے ایسے شخص کو خارج کرنا گناہ ہے۔ ہاں اگر یہ معلوم ہو کہ یہ شخص بنظر تفریق جماعت و فساد انگیزی کے یہ فعل کرتا ہے تو اس کا خارج کرنا جماعت سے روا ہے اور حدیث میں آمین آہستہ و زور سے کہنا دونوں پر آیا ہے،
واللہ الموفق۔

محمد شبلی نعمانی بندولی (۱۱)

۵۔ ۴/ جنوری ۱۹۰۳ء کو ایجوکیشنل کانفرنس نے انجمن ترقی اردو کا شعبہ قائم کیا، علامہ شبلی نعمانی اس کے سکریٹری نامزد ہوئے، اس وقت اگرچہ علامہ شبلی ناظم سررشتہ علوم وفنون حیدرآباد کے عہدہ پر فائز تھے، تاہم انتہائی انہماک اور دلچسپی سے ترقی اردو کے لئے سرگرم ہوئے اور متعدد علمی منصوبے بنائے اور سب سے پہلے دستور العمل تیار کیا اور طبع کرا کے اہل ذوق بالخصوص ایجوکیشنل کانفرنس کے اراکین کے پاس ملاحظہ کے لئے بھیجا، یہ دستور العمل تلاش بسیار کے باوجود اب تک دستیاب نہیں ہوسکا ہے۔ دستور العمل تیار کرنے کے بعد اہل علم اور ارباب کمال کا انجمن سے رشتہ قائم کیا۔ ڈپٹی نذیر احمد [۱۸۳۶-۱۹۱۲ء]، ذکاء اللہ دہلوی [۱۸۳۲-۱۹۱۰ء] اور مولانا حالی [۱۸۳۷-۱۹۱۴ء] تو نائب صدر انجمن کی حیثیت سے وابستہ تھے ہی علامہ شبلی نے علامہ اقبال [۱۸۷۷-۱۹۳۸ء]، مولانا ابوالکلام آزاد [۱۸۸۸- ۱۹۵۸ء] اور مولانا ظفر علی خاں [۱۸۷۳-۱۹۵۶ء] وغیرہ متعدد جوہر قابل کو انجمن سے وابستہ کیا۔ مولانا آزاد اس وقت کلکتہ سے لسان الصدق نکال رہے تھے۔ لسان الصدق کو علامہ شبلی نے انجمن کا ترجمان قرار

دے دیا اور لکھا کہ

''مولوی ابوالکلام صاحب کی شرکت سے بنگال میں انجمن کی اشاعت کی قوی امید ہے کیوں کہ آپ نہایت ہمدردی سے انجمن کی اعانت فرما رہے ہیں اور ہر کام میں ہمدردی سے حصہ لیتے ہیں''۔(۱۲)

اخبار ہندوستانی میں بعض ہندو اہل قلم کی طرف سے انجمن پر یہ اعتراض کیا گیا کہ انجمن نے ہندوؤں کو نظر انداز کیا ہے اور انہیں خاطر خواہ نمائندگی نہیں دی گئی ہے تو علامہ شبلی نے سکریٹری کی حیثیت سے اس اعتراض کا یہ جواب لکھا کہ:

''یہ واقعہ کے خلاف ہے۔انجمن کے قواعد میں اس خیال کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا اور عملی تردید اس خیال کی یہ ہے کہ انجمن نے سب سے پہلا انعام جو تصنیف پر دیا ہے وہ ایک ہندو مترجم کو دیا اور ایک ایسی کتاب پر دیا جو ہندو قوم کے ساتھ مخصوص تھی یعنی کتاب ''پیغمبران ہند'' جس میں سری کرشن جی اور گوتم بدھ کا تذکرہ اور ہندو مذہب کے اصول وعقائد ہیں''۔(۱۳)

یہ اصل تحریر کا ایک اقتباس ہے۔اصل تحریر اخبار ہندوستانی میں شائع ہوئی تھی جواب تک دستیاب نہیں ہوسکی ہے۔بہرحال اس تحریر کی اشاعت کے بعد ہندو ادیب اور اہل قلم متوجہ ہوئے اور انجمن کے رکن بنے اور تعاون کیا۔

۶۔ علامہ شبلی نے انجمن کی طرف سے جن کتابوں اور ترجموں کی اشاعت کا منصوبہ بنایا تھا اس میں ایک یا دو کتابیں ان کے عہد نظامت میں شائع ہوسکیں۔اس میں ایک کتاب ''رہنمایان ہند'' بھی ہے۔اس کے مترجم نارائن پرشاد ورما ہیں۔یہ ۱۹۰۴ء میں انجمن ترقی اردو کی طرف سے شائع ہوئی۔اس کے آخری صفحہ پر ''انجمن ترقی اردو'' کے عنوان سے دفعہ وار اس کا دستور درج ہے۔چوں کہ انجمن کا دستور علامہ شبلی نے تیار کیا تھا،اس لئے قیاس ہے کہ یہ دستور بھی علامہ شبلی ہی کا تحریر کردہ ہے۔اسلوب نگارش کے لحاظ سے بھی یہ علامہ ہی کی تحریر معلوم ہوتی ہے۔یہ دستور العمل حسب ذیل ہے۔

دفعہ۔۱: اس انجمن کا مقصد اردو زبان کو علمی حیثیت سے ترقی دینا ہے۔

دفعہ۔۲: جو صاحب انجمن کی تیار کردہ کتابیں سال میں پانچ روپیہ قیمت تک کی خریدنا منظور کریں انجمن کے رکن اعانت قرار پائیں گے۔

دفعہ۔۳: جن بزرگوں نے تصنیف و تالیف کے ذریعہ سے اردو پر احسان کیا ہے یا وہ بزرگ جو انجمن کو معتد بہ مالی مدد دیں، یا کسی اور طریقہ سے انجمن کو معتد بہ فائدہ پہنچائیں، انجمن کے رکن اعزازی قرار پائیں گے۔

دفعہ۔۴: انجمن وقتاً فوقتاً ان عربی اور انگریزی کتابوں کی فہرست شائع کرے گی جو اردو میں ترجمہ کئے جانے کے قابل ہیں۔ اسی طرح ان مضامین کو متعین کرے گی جن پر تصنیف و تالیف کی ضرورت ہے۔ ان تصنیفات اور تراجم پر انجمن کی طرف سے معتد بہ صلہ مقرر کیا جائے گا، اس کے ساتھ مصنّفین کو تصنیف کے متعلق ہر قسم کی ہدایت اور اطلاعات سے مدد دی جائے گی۔

دفعہ۔۵: انجمن وقتاً فوقتاً اردو کی اعلیٰ درجہ کی تصنیفات کی فہرست شائع کرے گی تا کہ ملک میں عمدہ تصنیفات کا رواج ہو۔ (۱۴)

مذکورہ دفعات کے مطابق انجمن نے متعدد کام انجام دئے، جس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ البتہ یہ بات قابل ذکر ہے کہ آخری دفعہ کے مطابق علامہ شبلی نے مولوی محمد سجاد مرزا بیگ دہلوی[۱۸۷۶-۱۹۲۷ء] سے فہرست کتب مرتب کرنے کی خواہش کی تھی۔ (۱۵) چنانچہ انہوں نے انتہائی محنت سے یہ فہرست تیار کی جو علامہ شبلی کی وفات کے بعد ۱۹۲۳ء میں حیدرآباد سے ''الفہرست'' کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ اردو میں پہلا اشاریہ کتب ہے جو علامہ شبلی کے ایما پر تیار کیا گیا۔

۷۔ علامہ شبلی کو انجمنوں اور اداروں کے دستور العمل بنانے میں مہارت حاصل تھی اور انہوں نے متعدد دستور العمل بنائے۔ مدارس بھوپال، دارالعلوم حیدرآباد، ندوۃ العلماء، انجمن وقف علی الاولاد، انجمن ترقی اردو اور صیغہ حفاظت و اشاعت اسلام وغیرہ کا دستور العمل انہیں نے تیار کیا تھا۔ ان کے بنائے ہوئے بیشتر دستور العمل دستیاب نہیں ہیں۔ انجمن ترقی اردو کا جب انہیں سکریٹری نامزد کیا گیا تو اس کا بھی انہوں نے دستور العمل تیار کیا اور ممبران کے پاس بھیجا،

لیکن ابتک وہ کہیں دستیاب نہیں تھا۔حال میں اسے دارالمصنّفین کے ڈائرکٹر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب نے دریافت کیا ہے اور اسے ماہنامہ معارف جولائی ۲۰۱۹ء کے شمارہ میں شائع کیا ہے۔یہ ایک بڑی دریافت ہے۔ظلی صاحب کے شکریہ کے ساتھ اسے یہاں درج کیا جاتا ہے۔

دفعہ ا۔اس ''انجمن کا نام انجمن ترقی اردو'' ہوگا۔

دفعہ ۲۔یہ انجمن محض ایک علمی انجمن ہے۔اس لئے اس کو گورنمنٹ کے کسی معاملہ سے کسی قسم کا تعلق نہ ہوگا۔

دفعہ ۳۔اس انجمن کے عہدیدار حسب ذیل ہیں:

صدر انجمن : مسٹر آرنلڈ، پروفیسر گورنمنٹ کالج، لاہور

نائب صدر انجمن : شمس العلماء ڈاکٹر مولوی نذیر احمد صاحب، شمس العلماء مولوی محمد ذکاءاللہ صاحب، مولانا خواجہ الطاف حسین حالی صاحب۔

سکریٹری : شمس العلماء مولوی محمد شبلی نعمانی

اسسٹنٹ سکریٹری: مولوی حامد علی صدیقی سہارنپوری

دفعہ ۴۔علاوہ عہدیداران بالا کے اس انجمن میں تین قسم کے ارکان ہوں گے۔

انتظامی۔اعزازی۔اوراعانتی

انتظامی ارکان کے فرائض حسب ذیل ہوں گے۔

ا۔انجمن کے مقاصد میں مدد دینا اور انجمن کی ترقی کے متعلق مفید مشورہ اور صلاح دینا۔

۲۔سکریٹری کے جواب طلب خطوط کا جواب دینا،جس کی میعاد دو ہفتہ سے زائد نہ ہو۔

۳۔انجمن کے لئے وقتاً فوقتاً قواعد ودستورالعمل مرتب کرنا۔

۴۔سالانہ جلسوں میں شریک ہونا اور انجمن کی ترقی کے متعلق جو کچھ کارروائی ہو اس کو پیش کرنا۔

اعزازی ارکان وہ ہوں گے جو انجمن کو معتدبہ مالی یا علمی مدد دیں، نیز وہ حضرات جنہوں نے اس وقت تک اپنی تصنیفات وتالیفات سے اردو زبان کو فائدہ پہنچایا ہے۔

ارکان اعانت وہ ہوں گے جو سالانہ چندہ دیں یا جو اس بات کو منظور فرمائیں کہ انجمن کی

نگرانی اور اہتمام میں جو کتابیں وقتاً فوقتاً طیار ہوں گی ان کی نسبت وہ اجازت دیں کہ ان کے نام بذریعہ قیمت طلب پارسل بھیج دی جائیں، بشرطیکہ ان کی قیمت سال میں (پانچ روپیہ) سے زائد نہ ہو اور اس سے زائد کے لئے خاص ان کی منظوری حاصل کرنی ہوگی۔

دفعہ۵۔ یہ انجمن اردو زبان کی ترقی کے لئے حسب ذیل عملی طریقہ اختیار کرے گی:

ا۔اردو زبان میں جو کتابیں انشاپردازی اور مضمون کے لحاظ سے اعلیٰ درجہ کی تصنیف ہو چکی ہیں یا آئندہ ہوں گی ، ان کی فہرست وقتاً فوقتاً شائع کرتی رہے گی تا کہ ملک میں عمدہ تصنیفات کا رواج ہو اور ان کے نمونہ پر اعلیٰ تصنیفات کا حوصلہ پیدا ہو۔

۲۔وقتاً فوقتاً ان کتابوں کی فہرست شائع کرے گی جو انگریزی اور عربی زبان سے ترجمہ کرنے کے قابل ہوں۔

۳۔ان مضامین کو متعین کرے گی جن پر نئی تصنیفات طیار ہونی چاہئے۔

۴۔ایک فہرست زمانہ حال کے اہل قلم کی مرتب کرے گی جس سے یہ معلوم ہو سکے کہ ملک میں کس درجہ کے اہل قلم موجود ہیں اور ان کا مذاق کس کس قسم کی تصنیف و تالیف کی طرف مائل ہے۔

۵۔ مصنّفین کسی تصنیف کے متعلق اگر کوئی مشورہ یا تاریخی مواد کے متعلق اطلاع حاصل کرنی چاہیں گے تو تاامکان ان کو مدد دے گی۔

۶۔اگر کوئی صاحب کسی کتاب کی تصنیف یا ترجمہ کا معاوضہ چاہیں گے تو بشرط پسند ان کو معاوضہ دے کر اپنی طرف سے اس کتاب کو شائع کرے گی۔

۷۔ایک رجسٹر ایسے علم دوست حضرات کا طیار اور مرتب کرے گی جو یہ منظور کریں کہ انجمن جس کتاب کی سفارش کرے گی اس کو خرید لیا کریں گے۔

شبلی نعمانی

ناظم علوم وفنون حیدرآباد

(علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ ۲۱/مارچ ۱۹۰۳ء ص ۸، ۳۱/مارچ ۱۹۰۳ء ص ۸، بحوالہ ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، جولائی ۲۰۱۹ء ص ۴۷۱-۴۷۴)

۸۔مشہورادیب مولانا عبدالماجد دریابادی[۱۸۹۲-۱۹۷۷ء] کوعلامہ شبلی سے خصوصی تعلق تھااور وہ لکھنؤ میں علامہ شبلی کی مجلس کے خاص حاضر باشوں میں تھےاورانہیں اپنا معنوی استاد خیال کرتے تھے۔انہوں نے کننگ کالج لکھنؤ میں تعلیم پائی تھی۔۱۹۱۴ء میں کننگ کالج میں فلسفہ کے استاد کی ایک عارضی جگہ خالی ہوئی۔اس جگہ پرتقرر کے لئے مولانا عبدالماجد دریابادی نے کوشش کی۔اس سلسلہ میں انہوں نے علامہ شبلی سے بھی سفارشی خط لکھوایا تھا، جسے انہوں نے اپنی کتاب ''خطوط مشاہیر'' کے ایک حاشیہ میں نقل کیا ہے۔علامہ شبلی ان کے عہد شباب کے بارے میں کیا رائے رکھتے تھےاوران کے مستقبل کے لئے کس قدر فکر مند تھے،ان کی اس تحریر سے واضح ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''مولوی عبدالماجد صاحب بی.اے کو میں ایک مدت سے جانتا ہوں۔ان کے علمی خصوصاً فلسفیانہ مضامین میں نے کثرت سے پڑھے ہیں۔مجھ کو جہاں تک معلوم ہے کہ ہندوستان میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جونہایت دقیق فلسفیانہ مسائل کو اس خوبی سے ادا کرسکتا ہوجس طرح عموماً مولوی عبدالماجد صاحب کے مضامین میں پائے جاتے ہیں۔

میں انگریزی نہیں جانتا،لیکن مصروشام میں یورپ کا فلسفہ جس قدر عربی میں منتقل ہوا ہے سب میرے پیش نظر ہے۔میں بے تکلف کہہ سکتا ہوں کہ کسی عربی ترجمہ یا مستقل تصنیف میں بھی فلسفیانہ مسائل اس خوبی سے ادانہیں کئے گئے ہیں۔

مولوی صاحب موصوف بالطبع فلاسفر ہیں۔ان کا ذوق خالص علمی ذوق ہے۔وہ ہمہ وقت فلسفہ اور متعلقات فلسفہ کے مطالعہ میں مشغول رہتے ہیں اور یہ بالکل قطعی ہے کہ گووہ فلسفہ میں ایم.اےنہیں ہیں لیکن کثیرالتعداد ایم.اے سے بہتر ہیں، اگر وہ فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوں تو میں کالج کی خوش قسمتی سمجھوں گا۔

ان اوصاف کے علاوہ ان کے ذاتی اخلاق و عادات،متانت،سنجیدگی اور شرافت نسب کی بہتر سے بہتر شہادت دے سکتا ہوں۔ شبلی

۵/اپریل ۱۹۱۴ء(۱۶)

۹۔ شمس العلماء خان بہادر نواب عزیز جنگ ولا [۱۸۶۰-۱۹۲۴ء] تعلقہ دار حیدرآباد بڑے باکمال شخص تھے۔ مختلف علوم وفنون پر ان کی نظر تھی۔ شعر وادب کے بھی بڑے ادا شناس تھے۔ مدۃ العمر اردو و فارسی میں دادِ سخن دیتے رہے۔ کلیات نظم ولا اور دیوان ولا وغیرہ ان کے کئی مجموعے شائع ہوئے ہیں۔ سلیمان اریب نے ان کی پچیس کتابوں کا ذکر کیا ہے جو تاریخ وسیر، لغت، قوانین، کاشت کاری، مصطلحات دکن وغیرہ موضوعات پر ہیں۔(۱۷) ان سے ولا کی مختلف علوم پر عالمانہ درک وبصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

ولا نے علم وفن اور شعر وادب کے ساتھ عوامی خدمات بھی انجام دیں۔ حیدرآباد سے ایک اخبار عزیز الاخبار اور ایک رسالہ لسان الہند والعجم بھی جاری کیا۔ ایک پریس بھی عزیز المطابع کے نام سے قائم کیا تھا۔ غرض ولا اپنے عہد کے متحرک اور فعال شخص تھے۔

حالی وشبلی سے ان کے بڑے گہرے مراسم تھے۔ ان کی متعدد تصنیفات پر دونوں بزرگوں کے قلم سے تقریظات شامل ہیں۔ علامہ شبلی نے ان کی مشہور کتاب تاریخ النوائط پر تقریظ لکھی ہے جس کا ذکر گذشتہ سال ماہنامہ معارف میں آچکا ہے۔ حال میں ایک فارسی کتاب یادگار ولا پڑھتے ہوئے علامہ شبلی کی ایک اور تقریظ نظر سے گذری جو ولا کی کتاب سیاق دکن پر لکھی گئی ہے۔ سیاق دکن میں بقول مصنف ''سیاق عرب وعجم ودکن کی تاریخ اور اعمال سیاق واصطلاحات کی تعریف اور ترتیب حسابات اور اس کی تنقیح کا طریقہ تفصیل کے ساتھ بیان ہوا ہے۔''

سیاق دکن میں علامہ شبلی کی تقریظ شامل نہیں ہے بلکہ اسے یادگار ولا کے مصنف برق موسوی نے نقل کیا ہے۔ یہ تقریظ انگریزی میں ہے اور غالباً ترجمہ کرکے شامل کی گئی ہے۔ اس کے بارے میں برق موسوی نے کسی طرح کی تفصیل نہیں دی ہے۔ غالباً کتاب کے فارسی زبان میں ہونے کی وجہ سے اسے انگریزی میں منتقل کیا گیا ہے۔ یہی نہیں حالی، محسن الملک، عماد الملک اور سر رچرڈسن وغیرہ کی تقاریظ بھی انگریزی میں ہیں۔ تقریظ شبلی درج ذیل ہے:

When lightand superficial books are increasing in number on all sides in the country and even educated men following the trend of public taste seem largely inclined towards such contemptible

publications, it is extremely surprising to find a counted few engaged in the pursuit of problems that do not admit of easy solution - a counted few whose publications though they do not serve as stories, add an invaluable capital to the store of literature.

One of such publications, is that which forms the heading of our review and which is written by our respected friend Nawab Aziz Jung Bahadur. In our researches to get an insight into the ancient modes of procedures, we have turned over hundreds and thousands of pages of history and though we may have pleased the public by superficial embelishment of ordinary facts, yet in all fairness we have to admit that what we have acquired is but fraction of the stupendous whole, and our Nawab deserves to be congratulated for having compiled a book, full of extraodinary researches, covering 166 pages bearing on accounts alone.

The Nawab has found out 417 technicalities relating to Accounts, of which a good many were quie unknown to us.

A perusal of this book gives such a perspicous insight into the modes of accounts in vogue during the time of Timur, that it apears as if all kinds of records are before us.

While commenting upon every technicality the Nawab has also discussed its origin, and for this he had to investigate various languages as these account technicalitises are an embodiment of several dialects. (18)

حوالے

۱۔ آپ بیتی ص۹۱، میر ولایت حسین، ایجوکیشنل کانفرنس، علی گڑھ، ۱۹۷۰ء

۲۔ خاتمہ منظوم فتوح الشام ص۴۳۵، سید عبدالرزاق کلامی، نول کشور لکھنؤ، ۱۹۰۰ء

۳۔ صبا، حیدرآباد، شبلی نمبر ص ۳۷

۴۔ ایضاً

۵۔ قوس حمزہ پوری ایک تعارف، ص۲۶۲-۲۷۹، ناوک حمزہ پوری، حمزہ پور گیا، ۱۹۸۲ء

۶۔ ایضاً ص۸۳-۸۴

۷۔ ایضاً ص۸۴-۸۵

۸۔ ماہنامہ ادیب الہ آباد، اگست ۱۹۱۰ء ص ۹۷

۹۔ حیات وحشت ص۴۷، ڈاکٹر وفا راشدی، مکتبہ اشاعت اردو کراچی، ۱۹۸۲ء

۱۰۔ چند رجال اہل حدیث، ص۳۵-۳۶، ابو علی اثری، ندوۃ المحدثین، گجرانوالہ، ۱۹۸۶ء

۱۱۔ ایضاً

۱۲۔ باقیات شبلی ص۸۷، مشتاق حسین، آزاد کتاب گھر دہلی، ۱۹۶۴ء

۱۳۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ علی گڑھ، اکتوبر ۱۹۰۳ء ص ۸

۱۴۔ رہنمایان ہند ص آخر، نارائن پرشاد ورما، انجمن ترقی اردو دہلی، ۱۹۰۴ء

۱۵۔ الفہرست ص۳، مولوی محمد سجاد مرزا بیگ، نظام دکن پریس، حیدرآباد، ۱۹۲۳ء

۱۶۔ خطوط مشاہیر ص۲۷-۲۸، مولانا عبدالماجد دریابادی، تاج کمپنی لاہور، ۱۹۴۵ء

۱۷۔ حیدرآباد کے شاعر حصہ دوم، ص۱۷، آندھرا پردیش ساہتیہ اکادمی حیدرآباد، ۱۹۶۲ء

۱۸۔ یادگار رولا، ص۲۹، برق موسوی، مکتبہ سعدی، حیدرآباد، ۱۹۴۱ء

ooo

[۱٦]

علامہ شبلی کے نو دریافت خطوط

علامہ شبلیؒ [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کے خطوط کی دریافت کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔گذشتہ دنوں حیات شبلی کے بعض تحقیق طلب پہلوؤں کی تلاش میں برادر گرامی ڈاکٹر سلمان سلطان صاحب رکن مجلس انتظامیہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ جو علامہ شبلی کے فرزند حامد حسن نعمانی [۱۸۸۰-۱۹۴۲ء] کے حقیقی نواسے ہیں، گفتگو کی تو انہوں نے اپنے پھوپھی زاد بھائی اور خالو کیپٹن سہیل سلطان صاحب مقیم کراچی سے رابطہ کا مشورہ دیا اور رابطہ نمبر بھی فراہم کیا۔ چنانچہ میں نے ان کو یکم دسمبر ۲۰۱۸ء کو خط لکھا۔ پانچ دن بعد انہوں نے انتہائی خوشی خوشی جواب لکھا۔تاخیر سے جواب دینے پر خرابی صحت کا عذر پیش کرتے ہوئے معذرت کی اور جلد ہی متعلقہ مواد فراہم کرنے کا وعدہ کیا اور پھر دوسرے ہی دن انہوں نے علامہ شبلی کے ۲۵/غیر مطبوعہ خطوط فراہم کئے جو علامہ شبلی نے میر ولایت حسین [۱۸٦۲-۱۹۴۹ء]، پروفیسر محمد زماں مہدی، مولوی محمد اسحاق وکیل [م:۱۲/اگست ۱۹۱۴ء] اور حامد حسن نعمانی [۱۸۸۰-۱۹۴۲ء] کو لکھے تھے۔دو دن بعد انہیں کے نام مزید ۱۱/خطوط بھیجے۔علامہ شبلی کی ایک اور حامد حسن نعمانی کی دو نایاب تصویریں بھی ارسال کیں۔۱۱۸/سال کا عرصہ گذر جانے کی وجہ سے خطوط ناصاف تھے۔دوبارہ ان خطوط کو انہوں نے اسکین کرا کے بھیجا اور اس سلسلہ میں فون پر دو تین بار گفتگو کی۔آخری گفتگو ۲۰/دسمبر کو ہوئی۔۲۳/دسمبر ۲۰۱۸ء کو میں نے ان کو میل کیا مگر کوئی جواب نہیں آیا بلکہ محض دس منٹ بعد ڈاکٹر سلمان سلطان صاحب کا فون آیا اور انہوں نے یہ روح فرسا خبر سنائی کہ بھائی جان یعنی کیپٹن سہیل سلطان آج [۲۳/دسمبر ۲۰۱۸ء] صبح اللہ کو پیارے ہوگئے۔اناللہ وانا الیہ راجعون۔آج ۷/دن بعد حامد حسن نعمانی کی دوسری بیٹی اور ڈاکٹر سلمان سلطان صاحب کی والدہ تحسین جہاں نے بھی [۹/جنوری ۲۰۱۹ء] داغ

مفارقت دیا۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون.

کیپٹن سہیل سلطان مرحوم نے حامد حسن نعمانی کی زندگی کے بعض واقعات بھی بتائے، بعض تاریخوں کی تعیین کی اور بہت سے گھریلو حالات وہ جمع کر کے بھیجنے والے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان کی اہلیہ اور علامہ شبلی کی حقیقی پوتی مومنہ سہیل اور ان کی بڑی بہن محسنہ سلطانہ کو جو نسل شبلی کی یادگاریں ہیں، باقی رکھے اور صحت وتندرستی عطا فرمائے۔

علامہ شبلی کے یہ نو دریافت خطوط گھریلو اور ذاتی قسم کے ہیں اور ان میں سوائے چند ایک کے کوئی قابل ذکر بات نہیں ہے۔ تاہم ان کی اہمیت کا کوئی منکر نہیں ہوسکتا۔ ان سے بہت سے ذاتی حالات کی وضاحت ہوتی ہے۔ اکثر و بیشتر خطوط سے حیات شبلی کے بعض گوشے اور واضح ہو کر سامنے آتے ہیں۔ متعدد تاریخوں کی بھی تعیین ہوتی ہے اور سب سے بڑھ کر حامد حسن نعمانی کی طالب علمانہ زندگی کے نشیب وفراز اور اس سلسلہ میں علامہ شبلی کی فکرمندی سے آگاہی ہوتی ہے۔ علامہ شبلی کی متعدد مصروفیات کا بھی علم ہوتا ہے اور خاص طور پر علی گڑھ سے علاحدگی کے فوراً بعد کی زندگی اور بعض دیگر واقعات سامنے آتے ہیں اور اگر کچھ بھی نہ ہوتا تب بھی ان کی اس اہمیت سے کہ یہ علامہ شبلی کے قلم کے حروف ہیں ان کی افادیت سے کون انکار کرے گا۔

نو دریافت کل خطوط کی تعداد ۳۶؍ ہے۔ اس میں آدھا خط میر ولایت حسین، ۳؍خط پروفیسر زماں مہدی، ۳؍خط محمد اسحاق ایڈوکیٹ اور بقیہ انتیس خطوط حامد حسن نعمانی کے نام ہیں۔ ذیل میں مکتوب الیہ کے مختصر تعارف کے ساتھ ان خطوط کو پیش کیا جاتا ہے۔ یہاں یہ واضح کر دینا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ یہ خطوط بغیر کسی القاب وآداب کے لکھے گئے ہیں۔ محض ایک خط میں حامد حسن کو ''عزیزی'' لکھا ہے۔ باقی تمام خطوط اس سے بھی عاری ہیں اور یہ تمام خطوط پوسٹ کارڈ پر لکھے گئے ہیں۔

۱۔ میر ولایت حسین

میر ولایت حسین [۱۸۶۲-۱۹۴۹ء] علامہ شبلی کے علی گڑھ کے دوستوں میں تھے، ریواڑی کے رہنے والے تھے۔ وہیں ۱۸۶۲ء میں پیدا ہوئے۔ ۱۸۸۱ء میں دہلی سے انٹرنس پاس کر کے علی گڑھ آئے اور فرسٹ ایر میں داخل ہوئے۔ بی اے پاس کر کے یہیں ملازمت اختیار

کر لی۔ سکنڈ ماسٹر اور ہیڈ ماسٹر رہے۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور ڈیوٹی شاپ کے بھی ذمہ دار رہے۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ اور علی گڑھ کے بعض دوسرے رسائل میں مضامین بھی لکھے۔ ۱۹۲۰ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے۔ قیام علی گڑھ میں رہا۔ ۸؍جولائی ۱۹۴۹ء کو یہیں وفات پائی۔ انہوں نے آپ بیتی بھی لکھی ہے جس میں خود سے زیادہ ایم.اے.او کالج کی تاریخ قلم بند کی ہے۔ اس میں علامہ شبلی کا متعدد مقامات پر ذکر کیا ہے۔ راقم کی کتاب ''شبلی خودنوشتوں میں'' میں علامہ شبلی کے حوالہ سے اس کا تجزیہ شامل ہے۔ [ص۳۳-۴۳]

علی گڑھ سے وحیدالدین سلیم [۱۸۶۹-۱۹۲۸ء] نے جو ماہنامہ معارف جاری کیا تھا اس کے جاری کرنے کا اولاً منصوبہ علامہ شبلی اور میر ولایت حسین نے بنایا تھا مگر بوجوہ نہ نکال سکے۔

مئی ۱۸۹۸ء میں علامہ شبلی ایم اے او کالج علی گڑھ سے مستعفی ہوئے۔ اس سے پہلے ان کے اکلوتے فرزند حامد حسن نعمانی کالج میں داخل ہو چکے تھے۔ حامد حسن نعمانی کے نام علامہ شبلی نے جو خطوط اعظم گڑھ اور بعض دوسرے شہروں سے علی گڑھ لکھے ہیں، بیشتر انہیں میر ولایت حسین کی معرفت لکھے گئے ہیں۔ متعدد خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ حامد حسن نعمانی گویا ان کی سرپرستی میں تھے اور جب کوئی ضرورت پیش آتی تو وہ میر صاحب ہی سے رجوع کرتے تھے۔ ان کے نام کا محض آدھ خط دریافت ہوا ہے:

> ''حامد کو غالباً آپ نے روپئے دے دیئے ہوں گے۔ وہ اب کہاں ہیں، اگر وہیں ہوں تو یہ کارڈ ان کو دکھا دیجئے گا۔
>
> روپئے تم کو میر ولایت حسین صاحب نے دے دیئے ہوں گے، مطلع کرو کہ تعطیل کب ہوگی اور تم کہاں جاؤ گے۔ لکھنو سے تم نے اپنے مصارف میں (پانچ روپئے) بوٹ کے لئے اور دس روپئے کپڑے کے لئے حساب میں لیا تھا۔ کیا اتنے دنوں میں بوٹ اور کپڑے پھٹ گئے۔'' شبلی نعمانی
>
> ۱۳؍جون [۱۹۰۰ء] اعظم گڑھ

۲۔ پروفیسر زماں مہدی

یہ کون صاحب تھے معلوم نہ ہوسکا۔ غالباً وہ علی گڑھ کالج میں پروفیسر تھے۔ حامد حسن

نعمانی کے متعدد خطوط ان کی معرفت بھیجے گئے ہیں۔ ان کے نام خطوط سے بھی اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ شبلی سے ان کے گہرے مراسم تھے۔ حامد حسن نعمانی کے علی گڑھ میں ایک سر پرست یہ بھی تھے۔سنہ ۱۹۰۰ء میں ان کے مفرور ہونے پر جو خطوط لکھے گئے ہیں انہی کے نام ہیں۔ ان کے نام درج ذیل تین خطوط دریافت ہوئے ہیں:

[۱]

''آپ کا خط آیا۔ نہایت تسلی ہوئی۔

آپ کی توجہ سے اگر عزیز مذکور(۱) کسی کام [کے] قابل ہو گئے تو آپ میرے ساتھ وہ احسان کریں گے جو کبھی کسی نے نہیں کیا ہوگا۔ والتسلیم

شبلی

الہ آباد۔ ۲؍مارچ ۱۹۰۰ء

---

[۲]

دربھنگہ تک حامد کا پتہ لگا۔ لیکن اب وہاں بھی نہیں ہے۔ آپ کو کچھ معلوم ہوا تو لکھئے۔ ہم لوگوں کا کھانا پینا چھوٹ گیا ہے۔ میری حالت موت سے بدتر ہے (۲) اس کے ساتھی صادق علی (۳) کا خاص وطن کہاں ہے۔ کچھ سہارا ملے تو میں خود جا کر ڈھونڈوں۔

خدا کے لئے میری مدد کیجئے۔ ہمارے تمام خاندان میں حامد ہی صرف ایک لڑکا ہے، (۴) آپ کے نام اس کا خط کس مضمون کا تھا۔ والسلام

شبلی

اعظم گڑھ

۱۶؍اپریل ۱۹۰۰ء

[پ،ن] ۱۰؍اپریل سے وہ دربھنگا سے بھی مفقود ہے۔

---

[۳]

''اقبال (۵) سے اتنا اور پوچھ کر اطلاع دو کہ سب سے پہلا خط جو میں نے ان کے خط کے جواب میں لکھا تھا اور جس میں لکھا تھا کہ مجھ کو معلوم نہیں حامد کیوں ناراض ہیں اور مجھ کو ہر طرح ان کی خوشی منظور ہے۔ اس کے مضمون سے اقبال نے حامد کو مطلع کیا تھا یا نہیں اور کیا تھا تو کس تاریخ تک۔ بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ حامد نے انتظار کر کے جب دیکھا کہ کسی نے خبر نہ لی تو مایوس اور غضب ناک ہو کر کہیں نکل گیا۔''

شبلی

۲۱/اپریل ۱۹۰۰ء

۳۔ محمد اسحاق وکیل ہائی کورٹ الٰہ آباد

یہ علامہ شبلی کے منجھلے بھائی تھے۔ موضع بندول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد علی گڑھ گئے اور بی.اے کیا، پھر وکالت کا امتحان پاس کر کے الٰہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت کا آغاز کیا، جس میں بڑی شہرت و ناموری حاصل کی۔ جوانی میں ۱۲/اگست ۱۹۱۴ء کو یکا یک انتقال کیا۔ یہ علامہ شبلی کے دست و باز و تھے۔ علامہ شبلی بھی انہیں بہت عزیز رکھتے تھے۔ تمام گھریلو اور زمیندارانہ ذمہ داریاں انہیں کے سر تھیں۔ یہ علامہ شبلی کے بڑے معین و مددگار تھے۔ نیشنل اسکول کے ذمہ دار بھی یہی تھے۔ اسے وہ بہت ترقی دینے کا عزم رکھتے تھے۔ یہی نہیں وہ اعظم گڑھ کے تمام بڑے قصبات میں نیشنل اسکول قائم کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے ایک رقم [پانچ سو روپئے] بھی مختص کر لی تھی۔ افسوس ان کی بے وقت موت سے ان کے ارمان ادھورے رہ گئے۔ علامہ شبلی کو ان کی موت سے سخت صدمہ پہنچا اور ان کا بڑا دلدوز مرثیہ لکھا۔ ان کے پوتے احمد اسحاق نعمانی کے بقول وہ خود بھی اسی صدمے میں چل بسے۔

علامہ شبلی سے ان کی مسلسل خط و کتابت بھی رہی۔ مکاتیب شبلی میں ان کے نام علامہ شبلی کے ۲۶/خطوط شامل ہیں۔ درج ذیل تین خطوط نو دریافت ہیں:

[ا]

''ہاں ڈاکٹر کی دوا سے کچھ فائدہ ہے۔ چانول تم سے بھیجتے نہ بنا۔ اپنا کام ہوتا

تو پھر جگہ سے بندوبست کر لیتے۔ میرے لئے پانچ چھ روپے کا بندوبست نہ ہو سکا۔ میرے نزدیک تو بہت ضرور ہے کہ تم تعطیل میں کھنڈا (۶) جا کر رہو، کیوں کہ میاں شبلی (۷) کے انتقال سے وہ گھر بالکل ویران ہو گیا۔ ایسے وقت میں لوگ دشمن کی دلدہی کرتے ہیں اور تمہاری تو بہر حال سسرال ہے، آگے تمہاری رائے۔ وہاں سے سمیع کے پاس آتے جاتے رہنا۔''

شبلی نعمانی

اعظم گڑھ۔

۲۰/اپریل [۱۹۰۰ء]

---

[۲]

''طاعون کی کیا حالت ہے۔

کیا کتابوں کا ملنا ممکن نہیں۔

گرمی کی شدت سے مجھ کو وہاں آنے کی ہمت نہیں ہوتی ہے۔

حامد کہاں ہیں۔ کیا یہاں آ نہیں سکتے۔

شبلی

۷/اپریل ۱۹۰۶ء

---

[۳]

میں مختار نامہ لکھ تو دوں، لیکن کارروائی مجھ کو نہیں آتی۔ ایک دن کے لئے ہی تم آجاتے تو بہتر تھا، کیا تم وہاں سیٹل ہو؟ تو کبھی میں وہاں آؤں، کیا کانفرنس میں نہ آؤ گے، اب کہ تو بڑی چہل پہل ہے۔ آغا خان (۸) بھی آتے ہیں۔''

شبلی

۲۴/دسمبر ۱۹۱۲ء

۴۔ حامد حسن نعمانی:

علامہ شبلی کے اکلوتے فرزند ۱۸۸۰ء میں بندول میں پیدا ہوئے۔ کچھ دن نیشنل اسکول اعظم گڑھ میں زیر تعلیم رہے۔۱۲ر نومبر ۱۸۹۹ء کو ایم .اے .او. کالج علی گڑھ میں داخل ہوئے۔ ۱۹۰۲ء میں ایف.اے پاس کیا۔ ۱۹۰۵ء میں تحصیل داری کا امتحان پاس کر کے تحصیل دار مقرر ہوئے۔ دیوگاؤں میں پہلا تقرر ہوا۔ پھر جونپور بعد ازاں ضلع بستی کی تحصیل ڈومریا گنج کے تحصیل دار رہے۔ کچھ دن گورکھپور میں بھی تحصیلداری کے فرائض انجام دیئے۔حسن کارکارکردگی کی وجہ سے میڈل ملے۔ پولو کھیلنے کے بڑے شوقین تھے۔ گورکھپور میں ایک پولوگراؤنڈ بھی ان سے منسوب تھا۔ایک مرتبہ بڑا انعام حاصل کیا۔اس زمانہ میں علامہ شبلی ندوہ سے وابستہ تھے۔ایک محفل میں کسی نے ان کے انعام حاصل کرنے کا فخریہ ذکر کیا تو علامہ شبلی نے کہا کہ یہ تعریف کسی نٹ کے بیٹے کی ہوسکتی ہے،شبلی کے بیٹے کی نہیں۔[مولانا عبدالباری ندوی،سرگذشت ص۱۵]

وہ عمر میں مولانا سید سلیمان ندوی سے دو تین سال بڑے تھے۔ باوجود اس کے انہیں بھائی صاحب کہا کرتے تھے اور ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔ اعزہ و اقربا کو دارالمصنفین کے معاملات میں دخل دینے،حتیٰ کہ وہاں جانے سے بھی منع کرتے تھے اور کہتے تھے کہ بھائی صاحب [سید صاحب] اس کے اصل وارث ہیں اور وہ ابا کی یادگار کو بہت ترقی دے رہے ہیں۔خود سید صاحب انہیں بہت قریب رکھتے تھے۔ جب انہوں نے دفعتاً انتقال کیا تو سید صاحب بھی بے قرار ہوئے اور معارف میں ان کا ماتم کیا۔

حامد حسن نعمانی نے ۲۰ر مارچ ۱۹۴۲ء کو جون پور میں جہاں وہ کسی ذاتی کام سے گئے ہوئے تھے، دفعتاً انتقال کیا۔ وہاں سے جنازہ اعظم گڑھ لایا گیا اور شبلی منزل میں پہلوئے شبلی میں دفن کئے گئے۔

کیپٹن سہیل سلطان سے ان کے نام کے ۲۹ر غیر مطبوعہ خطوط ملے ہیں۔ان میں بیشتر ان کی علی گڑھ کی زمانہ طالب علمی میں لکھے گئے ہیں۔ان کی طالب علمانہ زندگی کے ساتھ بعض اور بہت سی دیگر باتیں بھی معلوم ہوتی ہیں۔ مثلاً علامہ شبلی کی معرکۃ الآراء کتاب الفاروق کی جلد سازی علی گڑھ میں احسان علی نامی شخص کے ہاتھوں ہوئی جو بالائے قلعہ رہتا تھا۔علامہ شبلی نے

فارسی کی جونصابی کتابیں [انٹرنس کورس، ایف.اے کورس اور بی.اے فارسی کورس فارسی] الٰہ آباد یونیورسٹی کے لئے تیار کی تھیں وہ ڈیوٹی شاپ جس کے ذمہ دار میر ولایت حسین تھے سے فروخت ہوتی تھیں۔اس وقت علی گڑھ میں طلبہ کے اخراجات ۱۹؍روپئے تھے۔جیب خرچ ۵؍روپیہ میں پورا ہوجاتا تھا۔بعض دیگر ذاتی حالات بھی سامنے آتے ہیں۔بعض واقعات کی تاریخوں کی تصحیح وتعیین بھی ہوتی ہے۔

بعض خطوط پر تاریخیں نہیں تھیں اور بعض پر سنہ،ان کی تاریخوں کی تعیین پوسٹ کارڈ پر لگی مہروں سے کی گئی ہے اور انہیں بریکیٹ میں درج کیا گیا ہے۔

مکاتیب شبلی حصہ اول سے نوادرات شبلی کے باب مکتوبات تک علامہ شبلی کے کل ۱۱۱۵ خطوط مدون ومرتب ہوکر شائع ہو چکے ہیں۔گذشتہ دنوں دو اور خطوط معارف میں ڈاکٹر شمس بدایونی نے شائع کئے تھے۔راقم نے ایک غیر مدون خط اپنے مضمون''علامہ شبلی کی چند نادر تحریریں'' مطبوعہ معارف ہی میں شامل کیا ہے۔ایک اور خط بنام قوس حمزہ پوری راقم کے مقالہ''علامہ شبلی کی چند غیر مدون تحریریں''،مطبوعہ ماہنامہ معارف مارچ ۲۰۱۹ء میں شائع کیا ہے۔اب ان نو دریافت ۳۶ خطوط سے علامہ شبلی کے تمام دریافت خطوط کی تعداد ۱۱۵۵ ہوگئی ہے۔

حامد حسن نعمانی کے نام مکاتیب شبلی میں ایک اور مکتوبات شبلی میں دو خطوط پہلے شائع ہو چکے ہیں۔نو دریافت ۲۹؍خطوط سے ان کے نام کے خطوط کی تعداد بتیس [۳۲] ہوگئی ہے۔ نو دریافت انتیس خطوط درج ذیل ہیں:

[۱]

''کالج بند ہوگا۔اب کتابوں کی کیا ضرورت ہے؟ کیا تم نے حساب دے دیا ہے،کیا تم تعطیل میں بھی علی گڑھ رہو گے۔

کان پور میں ہفتہ سے زیادہ رہوں گا۔تم مجھ سے ملتے جاؤ۔انورگنج مکان ندوۃ العلما میرا پتہ ہے۔''

شبلی

کان پور [۵؍اگست ۱۸۹۸ء]

[۲]

معلوم ہوتا ہے تم کو میرا جواب نہیں پہنچا۔

خیر اب فوراً کانپور محلّہ انور گنج دفتر ندوۃ العلماء میں آؤ۔ خرچ راہ کسی سے قرض لے لینا۔ یہاں سب ادا کرادیا جائے گا۔

شبلی نعمانی

۱۰؍اگست [۱۸۹۸ء] کان پور

[۳]

عزیزی

تم فوراً اپنے حالات صحت سے آگاہ کرو۔ علاج میں کتنے دن صرف ہوں گے۔ علی گڑھ سے تمہارا نام خارج ہوگیا ہے اور [بارہ روپئے] بقایا کے مجھ کو ادا کرنے پڑے ہیں۔

شبلی نعمانی

اعظم گڑھ۔۴؍اکتوبر ۱۸۹۸ء

[۴]

عزیزی حامد

ایک دوست کا خط آیا کہ تم کو افاقہ نہیں ہوا یا بہت کم ہوا۔ اس لئے علاج کسی اور سے کرنا اچھا ہوگا۔ کیا یہ صحیح ہوگا۔ فوراً لکھو۔

شبلی نعمانی

اعظم گڑھ۔۲۱؍اکتوبر ۱۸۹۸ء (۹)

[۵]

وہی حال ہے۔اب ڈاکٹری علاج ہورہا ہے،جس کی وجہ سے خرچ تو البتہ سو روپیہ ماہوار بڑھ گیا ہے،لیکن ابھی تک کوئی فرق نہیں معلوم ہوتا۔

احسان علی (۱۰) نام جلد ساز بالائے قلعہ رہتا ہے ۔اس کے پاس جا کر دریافت کرو کہ الفاروق کی جلدیں کیوں باندھ کر نہیں بھیجتا۔۳رمہینہ گذر چکا ہے۔

شبلی نعمانی

۴رمئی[۱۸۹۹ء]

---

[٦]

جیسا تم دیکھ کر گئے تھے، ویسا ہی ہوں ۔اچھا ہو جاتا ہوں ، پھر بیمار پڑ جاتا ہوں،احسان علی جلد ساز بالائے قلعہ شہر میں رہتے ہیں۔ان کے پاس الفاروق جلد بندھنے کے لئے گئی ہے،اب تک نہیں آئی،تم خود جا کر دیکھو کیا حال ہے ۔تمہارا ماہوار خرچ بورڈنگ کا کیا ہے۔تعطیل میں تم کہاں رہو گے۔

تمہارے خسر صاحب نے انتقال کیا۔

شبلی نعمانی

۱۴رمئی[۱۸۹۹ء]

---

[۷]

جب تم اپریل میں نصف مہینہ بھی بورڈنگ میں نہیں رہے تو (بیس روپیہ) کیوں کر خرچ ہوا ۔بہرحال میں نے میر ولایت حسین صاحب کو لکھ دیا ہے ، وہ ضروری خرچ تم کو دے دیں گے۔

تم جون پور میں سمیع (۱۱) کے پاس رہو اور پندرہ دن کھنڈا میں قیام کرو۔

شبلی

۳۱ر مئی [۱۸۹۹ء]

---

[۸]

سوالات ذیل کا جواب لکھو۔

کس تاریخ کو کالج میں داخل ہوئے۔ بورڈنگ و کالج کا اس وقت تک کس قدر مطالبہ ہوا۔ کس قدر ادا ہوا، اب کس قدر باقی ہے، تعطیل میں کہاں پر رہو گے۔ وہاں سے خرچ ہرگز نہ لو۔

شبلی

اعظم گڑھ [۲ر جولائی ۱۸۹۹ء]

---

[۹]

علی گڑھ

تم مجھ سے کیوں پوچھتے ہو، تم جو چاہو میں اس پر راضی ہوں۔ پڑھو یا نوکری کرو یا اور جو چاہو، صرف اس قدر ہے کہ میری تنخواہ سو روپیہ ہے، اس لئے [۲۵ر روپئے] سے زیادہ میں نہیں دے سکتا۔ بے شبہ وہ اتفاقی ہی خرچ تھے جو تم کو پیش آئے لیکن یہ امر بالکل قطعی اور یقینی ہے کہ ہمیشہ ایسے ہی اتفاقی خرچ پیش آتے رہیں گے کیوں کہ...........

بہتر تو یہ ہے کہ دو ایک روز کے لئے مجھ سے مل جاؤ۔ سامنے جو بھی رائے قائم ہو سکے گی کہ تم کو کیا کرنا چاہیئے، تم نے خود ہی لکھا کہ ہاں نوکری مناسب ہے، اب اس قدر بیزار ہو۔

شبلی

اعظم گڑھ

۲۶ر جولائی [۱۸۹۹ء]

[۱۰]

خط پہنچا، محافظ ڈیوٹی (۱۲) کو میں کل خط لکھ دوں گا۔

کلکتہ جا کر جو تمہارا حرج ہوا کیا وہ کم ہے کہ تم کو پھر لاہور وغیرہ جانا چاہئے، کیا صرف کھیل کے لئے کالج میں رہنا چاہئے۔ ممکن ہے کہ افسران کالج تم کو مجبور کرتے ہوں، اگر ایسا ہے تو فوراً لکھو کہ میں تم کو معاف کرادوں۔

بوٹ کی قیمت [۸ یا ۹/روپیہ] ہوئی۔ کوٹ تم نے نیا بنوایا تھا وہ کیا ہوا۔

میری یہ حالت ہے کہ جو کچھ روپیہ تھا وہ صرف ہو گیا۔ راستہ کا خرچ بھی نہیں کہ کہیں کا قصد کروں۔ تنخواہ کا انتظار ہے۔ ادھر اپنے سرکاری کاغذات چھپوا رہا ہوں اس کی اجرت بالکل قرض پر ہے۔ اگر تم دورہ پر نہ جاؤ تو نہ تم کو کوٹ کی ضرورت ہے نہ کسی اور چیز کی۔

شبلی

الٰہ آباد۔ ۲۱/جنوری ۱۹۰۰ء

---

[۱۱]

تم نے لکھا تھا کہ میر کلن (۱۳) نے کچھ روپے دینے کے لئے کہا ہے۔ ان کے پاس چھ روپے سے زیادہ تھے، اس لئے [۵/روپیہ] جیب خرچ اس میں سے محسوب کرلو۔

کپڑوں کے لئے خرچ اس وقت بھیجوں گا، لیکن اگلے مہینہ کا خرچ میں مارچ سے پہلے نہیں بھیج سکتا۔ یعنی جب تک تنخواہ نہ آ جائے۔

میں مرزا پور گیا تھا اور بعض کام درپیش ہیں۔

میر ولایت حسین صاحب نے مطلق جواب نہیں دیا۔ تم ضرور مل کر جواب لکھواؤ اور یہ تو تم بھی لکھ بھیجو کہ انٹرنس وایف. اے کورس چھپ گیا یا نہیں۔ والسلام

شبلی

الہ آباد [غالباً فروری ۱۹۰۰ء]

---

[۱۲]

اقبال احمد کا وہ تنہا خرچ نہ تھا بلکہ مختار (۱۴) کا بھی تھا۔ تم دو کو ایک سمجھتے ہو۔

بلٹی اس قدر دیر میں آئی کہ ۱۷/روپیہ تاوان دے کر آج پتھر اتروایا گیا۔

تمہارے خرچ کی بات یہ ہے کہ [۱۹/روپئے] کالج کے مصارف ہوں گے۔ باقی [۵/روپیہ] جیب خرچ کے جایا کریں گے۔

مجھ کو بخار آتا ہے۔

شبلی

۱۳/اپریل [۱۹۰۰ء]

اعظم گڑھ

---

[۱۳]

میاں علی احمد (۱۵) پر تمہارے ہاں کے نیل کے حساب میں [۲۰۰/روپئے] باقی ہیں جس میں سے انہوں نے بابو (۱۶) کے اور میری معرفت [۱۰۰/روپئے] دیا تھا۔ سو باقی ہیں۔ اس کی نسبت اب تقاضہ ہوا تو ان کے رجسٹر حساب میں لکھا ہے کہ سو روپیہ حامد کو دیئے گئے، کیا تم نے کبھی علی احمد مرحوم سے سو روپئے لئے۔

فوراً جواب لکھو۔ شبلی

اعظم گڑھ۔ ۱۶/جون [۱۹۰۰ء]

---

[۱۴]

میں یہاں تک آ گیا۔ دو ایک روز میں الہ آباد پہنچوں گا۔

تم سب پروفیسروں سے سرٹیفکیٹ لے کر فوراً الہٰ آباد آو، وہیں سے سامان سفر ہو کر آگے بڑھیں گے۔ وہیں کپڑے بھی بنیں گے۔

البتہ اگر کوئی صورت ملازمت کی وہاں پیدا ہو رہی ہو تو ٹھہر جاؤ اور مجھ کو الہٰ آباد کے پتہ سے مطلع کرو۔

شبلی نعمانی

مرزاپور۔ ۱۶/جون [۱۹۰۰ء]

---

[۱۵]

بہت پہلے تمہارے پاس روپے بھیج دیئے گئے۔ پہنچے ہوں تو فوراً چلے آؤ۔ ورنہ اطلاع دو کہ میں دریافت کروں۔ والدعاء

شبلی نعمانی

یکم جولائی ۱۹۰۰ء الہٰ آباد

---

[۱۶]

آج حکیم عبدالولی صاحب (۱۷) نے مفصل فرد حساب دواؤں کی بھیجی۔ وہ تمہارے بیان سے بالکل مختلف ہے۔ علی گڑھ جاتے ہوئے جو تم نے علاج کیا اور مجھ سے قیمت منگوائی وہ بالکل ادا نہیں کی۔ افسوس اٹلی اگر گیا تو تم کو لے چلوں گا لیکن تیسرے درجہ میں۔

حامد!

بیماری کے زمانہ میں تم نے بڑے زور سے لکھا تھا کہ میں اپنا اعتبار ثابت کروں گا۔ کیا اس کا یہی طریقہ ہے۔

شبلی

۳۰/جولائی [۱۹۰۰ء]

[۱۷]

فوراً ایک جلد بی .اے کورس و ایک جلد ایف.اے کورس ڈیوٹی سے میرے حساب میں بنام مولوی محی الدین اسسٹنٹ پروفیسر میور کالج (۱۸) بھجوادو، بشرطیکہ یہ کتابیں بنام حکیم قنبر علی صاحب الہ آباد (۱۹) پہلے نہ جا چکی ہوں۔

شبلی۔اعظم گڑھ

۱/اکتوبر ۱۹۰۰ء

[۱۸]

خط پہنچا۔تمہارے لکھنؤ نہ جانے سے والد قبلہ بلکہ تمام لوگوں کو رنج ہوا، ممکن تھا کہ تم وہاں قیام نہ کرتے، لیکن علی گڑھ جاتے ہوئے والد قبلہ کو دیکھتے جاتے تو ان کی خاطر داری ہو جاتی۔

یہاں سے مولوی سعید (۲۰) ماموں صاحب (۲۱) میاں عثمان (۲۲) والد کے دیکھنے کے لئے جا رہے ہیں۔

میاں حمید (۲۳) کو اپنی نسبت خود کچھ معلوم نہیں، وہاں سے طلبی آئی تو کیوں نہ جائیں۔

ہاں مکان پر خوب پانی برسا، اب کچھ شکایت نہیں۔[۳۵/روپیہ] بھیج چکا ہوں۔والدعاء

شبلی۔اعظم گڑھ

۴/اکتوبر ۱۹۰۰ء

[۱۹]

تحریر کرو کہ نواب محسن الملک (۲۴) کہاں ہیں اور ان کے استعفی کا کیا فیصلہ

ہوا۔

والدعاء
شبلی۔اعظم گڑھ
۱۸/ اکتوبر ۱۹۰۰ء

---

[۲۰]

چودہ روپئے بھیجے جاتے ہیں۔اچکن ولحاف کے لئے ،توشک کا کام کمبل دے گا۔افسوس ہے کہ تم کومولوی صاحب کا اعتبار آیا کہ ان کی تجویز پر عرق کھچوانا چاہتے ہو۔

شبلی
اعظم گڑھ۔۲۴/ اکتوبر ۱۹۰۰ء

---

[۲۱]

صدافسوس!
تمہاراباپ یتیم ہوگیا۔
والد نے ۱۲/نومبر وقت صبح دنیا کورخصت کیا۔(۲۵)والدعاء
شبلی۔۱۴/نومبر ۱۹۰۰ء

---

[۲۲]

فوراًامورذیل سے مطلع کرو۔
ا۔انٹرنس کورس(۲۶)پارسال ڈیوٹی سے کس قدر فروخت ہوا۔
۲۔تقریباًہرسال کس قدرجلدیں انٹرنس کورس کی فروخت ہوتی ہیں۔
۳۔ڈیوٹی میں کس قدر نسخے انٹرنس کورس کے موجود ہیں۔
یہ سب امور مہتمم ڈیوٹی سے دریافت کر کےلکھو۔والدعاء

شبلی۔اعظم گڑھ
۳۰ر نومبر ۱۹۰۰ء

---

[۲۳]

قرضہ کی رقومات [میں] دیر ہورہی ہیں۔
والد قبلہ نے ۲۶ر ہزار قرضہ چھوڑا ہے۔
لکھنؤ کو کیا تم نے ڈیوٹی سے روپئے بھیجے ہیں اور انہوں نے قرضہ دیا جب کہ میرا روپیہ موجود تھا۔ ماریسن صاحب برات کی تاریخ کو سمجھاتے ہیں۔(۲۷)

شبلی
اعظم گڑھ۔[۳ر دسمبر ۱۹۰۰ء]

---

[۲۴]

میں نے ابتدا سے حساب نہیں پوچھا تھا، صرف یہ دریافت کر کے فوراً اطلاع دو کہ پارسال کس قدر نسخے انٹرنس کورس کے فروخت ہوئے۔
حیدرآباد سے اب تک روپئے نہیں آئے (۲۸) سخت تکلیف ہے۔ چھاؤنی (۲۹) کے تمام مصارف اب مجھ پر اور اسحاق پر ہیں۔ بالکل قرضہ سے کام چل رہا ہے اور تنخواہ آئے بھی تو اس سے کیا ہوتا ہے۔
کلکٹر صاحب نے تم کو نہ دیکھا نہ بھالا۔علم غیب پر کیوں کر لکھ دیں گے۔ اس کے علاوہ اب بی.اے بہ مشکل لئے جاتے ہیں۔انٹرنس کا کیا حساب ہے۔ تاہم تم موجود ہوتے تو کہا بھی جاتا۔ یوں کون سا طریقہ ہے۔

شبلی
۹ر دسمبر [۱۹۰۰ء] جواب طلب

---

[۲۵]

ٹسٹ کے نمبر تمہارے پرنسپل صاحب نے میرے پاس بھیجے، حساب میں ۲ نمبر ملے ہیں۔

اس حالت میں بے فائدہ شریک امتحان ہوتے ہو اور فیل ہونے کی بدنامی اٹھاتے ہو۔ یہ کہنا قسمت بھی ایک چیز ہے یہ کہنا ہے کہ قسمت سے بغیر تخم ریزی کے غلہ پیدا ہوسکتا ہے۔

اگر شریک امتحان ہونا تو [۲۲/روپئے] ماہوار خرچ کے لے کر باقی ڈیوٹی کو واپس کر دینا۔ سب رقم کا حساب مجھے بتا دینا۔ والدعاء

شبلی

اعظم گڑھ۔ ۹/دسمبر [۱۹۰۰ء]

---

[۲۶]

انشاءاللہ ۳۱/جنوری سے پہلے میں خود علی گڑھ پہنچوں گا۔

مصائب، مصارف اور تکلیفات حد سے گذر گئیں، اس لئے گھبرا کر نکلتا ہوں، علی گڑھ دو ایک روز رہ کر معلوم نہیں کہاں جاؤں۔

شبلی

اعظم گڑھ، ۲۰/جنوری ۱۹۰۱ء

---

[۲۷]

خط پہنچا، تعطیل کھلنے پر روپئے بھیج دیئے جائیں گے۔

افسوس تم پر پھر ایک روپیہ بقایہ نہ جمع ہوا۔ ضعف کی حالت میں چلنا پھرنا اور دوڑ دھوپ تم نے ترک نہ کی ہوگی، اس لئے بخار پھر آ گیا۔ تندہی سے علاج اور احتیاط کرو۔

شبلی

بھوپال۔ ۲۰/اکتوبر ۱۹۰۵ء

---

[۲۸]

۱۴/مئی کو اعظم گڑھ میں جلسہ اسلامیہ ہے، اس میں انشاءاللہ میں جاؤں گا۔ وہیں روپیہ بھی ادا کردوں گا۔ تم نے (۱۵۰/روپیہ) جو ندوہ کے لئے دینے کو کہا ہے یہ غالباً زنانہ کے زیور کی قیمت ہوگی، یا اور کوئی رقم ہے۔

تم بھی اس زمانہ میں اعظم گڑھ آؤ تو بہتر ہے۔ فاطمہ (۳۰) اب بہت بیمار رہتی ہے، اس کا علاج کرنا ضروری ہے۔ میں اعظم گڑھ بلاؤں گا اور ضرورت ہوگی تو لکھنؤ بھی لاؤں گا، اس وقت سے بھی زنانہ بلانا ہوگا۔

شبلی

لکھنو، ۲۵/اپریل ۱۹۰۹ء

---

[۲۹]

عزیزی

میں تمہارے خط کا جواب اس لئے نہ دے سکا کہ ۲/مارچ کو الٰہ آباد میں سرکاری کمیٹی میں بلایا گیا تھا اور وہاں سے وقف اولاد (۳۱) کے معاملہ میں کلکتہ جانا پڑا۔ ابھی یہاں آیا ہوں اور غالباً ایک ہفتہ تک رہنا ہو۔ ۱۵/مارچ کو پھر اسی کے لئے الٰہ آباد جانا ہے۔

شبلی

۱۰/مارچ ۱۹۱۲ء۔ لکھنؤ

تعلیقات و حواشی:

۱۔ غالباً حامد حسن نعمانی کے بارے میں لکھا گیا ہے۔

۲۔ حامد حسن نعمانی نے علامہ شبلی کے عقد ثانی یعنی دوسری ماں کے خیال سے ناراض ہو کر گھر بار چھوڑ دیا تھا۔[حیات شبلی ص ۳۵۹] پہلے دربھنگہ گئے اور پھر وہاں سے قصبہ بہار شریف جا کر خانقاہ یحیٰی منیری کے سجادہ نشین شاہ امین کے مرید ہو کر وہیں مقیم ہوئے۔ پھر اپنے پیر شاہ امین کے کہنے پر واپس آئے،(ایضاً) لیکن پھر ان کی موجودگی میں علامہ شبلی کا نکاح بھی ہوا۔

۳۔ جلد ساز احسان علی کے بارے میں معلومات نہ مل سکیں۔

۴۔ بعد میں ان کے منجھلے بھائی محمد اسحاق وکیل ہائی کورٹ کے ہاں نرینہ اولاد محمد فاروق نعمانی عرف للو بابو[۱۹۰۹-۱۹۹۷ء] پیدا ہوئے۔ احمد اسحاق نعمانی اور احمر اسحاق نعمانی ان ہی کے صاحبزادگان ہیں۔

۵۔ علامہ شبلی کے خاندانی بھتیجے اور سابق چیف جسٹس الہ آباد ہائی کورٹ۔ اس وقت طالب علم تھے اور علی گڑھ میں مقیم تھے۔

۶۔ کھنڈا ضلع الہ آباد میں محمد اسحاق وکیل ہائی کورٹ کی سسرال تھی، اسحاق صاحب کی تین شادیاں ہوئی تھیں، پہلی بندول میں، دوسری غالباً اسی کھنڈا میں اور تیسری غازی پور میں۔ اول الذکر بیویوں نے کم مدت حیات پائی۔

۷۔ غالباً محمد اسحاق وکیل کے سسر کا نام ہے۔

۸۔ آغا خاں : محتاج تعارف نہیں۔

۹۔ یہ خط اعظم گڑھ سے لکھنؤ معرفت حکیم عبدالولی صاحب (جھوائی ٹولہ) لکھا گیا ہے گویا حامد حسن صاحب اس وقت لکھنؤ میں مقیم اور زیر علاج تھے۔

۱۰۔ احسان علی، جلد ساز: تفصیل معلوم نہ ہو سکی۔

۱۱۔ مولوی محمد سمیع علامہ شبلی کے ابتدائی شاگرد اور عزیز جو موضع کنورہ گہنی ضلع اعظم گڑھ کے رہنے والے تھے، جون پور ججی میں محافظ دفتر تھے۔ علامہ شبلی نے جو مجلس موازنہ ترقی قومی بنائی تھی، اس کے ذمہ دار یہی تھے۔ ان کے نام علامہ شبلی کے ۵۹ رخطوط مکاتیب شبلی اور نوادرات شبلی میں شامل ہیں۔ نیشنل اسکول اعظم گڑھ کے بھی یہ ایک اہم ذمہ دار تھے۔ ان کے ایک بیٹے مختار احمد تھے جو الہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت کرتے تھے۔ ان کی تاریخ پیدائش اور وفات معلوم نہ ہو سکی۔ مکاتیب شبلی کے خطوط سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولوی محمد سمیع شعر و ادب کے بڑے ادا شناس تھے اور وہ علامہ شبلی کی شاعری کے بڑے مداحوں

اور قدر دانوں میں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے علامہ شبلی کے کلام اور خطوط وغیرہ کو محفوظ رکھا اور ان کی تدوین کے وقت سید صاحب کی خدمت میں پیش کیا۔

۱۲۔ ڈیوٹی: ایم.اے.کالج علی گڑھ کا بک ڈپو

۱۳۔ میر کلن: تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

۱۴۔ مختار احمد: مولوی محمد سمیع کے صاحبزادے، علی گڑھ سے تعلیم حاصل کی تھی، الہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت کرتے تھے۔ برسوں شبلی کالج انتظامیہ کے رکن رہے۔ الہ آباد میں وفات پائی۔

۱۵۔ میاں علی احمد: تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

۱۶۔ بابو: تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔

۱۷۔ حکیم عبدالولی: جھوائی ٹولہ لکھنؤ کے مشہور حکیم، علامہ شبلی کے احباب میں تھے اور معالج بھی۔ ایک بار حامد حسن کا بھی ان سے علاج کرایا۔

۱۸۔ میور کالج الہ آباد میں اسسٹنٹ پروفیسر تھے، اس کے علاوہ کچھ معلوم نہ ہوسکا۔

۱۹۔ حکیم قنبر علی: حالات معلوم نہ ہوسکے۔

۲۰۔ مولوی سعید: تفصیل معلوم نہ ہوسکی۔ غالباً بندول کے رہنے والے تھے۔

۲۱۔ ماموں : علامہ شبلی کے ماموں مولوی محمد سلیم وکیل عدالت اعظم گڑھ، جامعہ احمد یہ آرا کے فاضل اہل حدیث عالم، موضع پھریہا کے رہنے والے تھے۔

۲۲۔ عثمان: علامہ شبلی کے خاندانی بھتیجے تھے۔ علامہ شبلی نے اپنے ساتھ علی گڑھ میں رکھ کر تعلیم دلائی تھی۔ بعد میں شہر الہ آباد کے کوتوال مقرر ہوئے۔ مکاتیب شبلی میں کئی مقام پر ان کا نام آیا ہے۔ بقیہ حالات معلوم نہیں ہوسکے۔

۲۳۔ حمید: علامہ شبلی کے ماموں زاد بھائی مولانا حمید الدین فراہی [۱۸۶۴-۱۹۳۰ء] صاحب تفسیر نظام القرآن۔

۲۴۔ تحریک علی گڑھ کاروان اول کے رکن اعظم، علامہ شبلی کے خاص دوست اور جانشین سرسید نواب محسن الملک مولوی مہدی علی خاں [۱۸۳۸-۱۹۰۷ء]

۲۵۔ علامہ شبلی کے والد شیخ حبیب اللہ وکیل کورٹ اعظم گڑھ کے سانحہ انتقال کی اطلاع۔

۲۶۔ انٹرنس کورس فارسی: علامہ شبلی نے طلبائے فارسی کے لئے ایک کورس تیار کیا تھا جو تین کتابوں انٹرنس کورس، ایف.اے کورس اور بی.اے کورس فارسی پر مشتمل تھا۔ راقم نے اول الذکر دونوں کتابوں کا مطالعہ کیا ہے۔ البتہ آخر الذکر کی تفصیلات پڑھی ہیں۔ کتاب نظر سے نہیں گذری۔ ایک اطلاع کے مطابق بی اے کورس فارسی کا ایک نسخہ ڈاکٹر تحسین فراخی لاہور کے ذاتی ذخیرہ میں محفوظ ہے۔

۲۷۔ ماریسن: ایم.اے.او کالج علی گڑھ کے پرنسپل

۲۸۔ میر محبوب علی خاں، نظام حیدرآباد کے جاری کردہ وظیفہ کی ماہوار رقم۔

۲۹۔ شیخ حبیب اللہ وکیل کی دوسری اہلیہ، ان کا نام معلوم نہ ہوسکا، ان سے ایک بیٹے محمد پیدا ہوئے، جنہوں نے کلکٹری کا امتحان پاس کیا تھا، لیکن جوائن کرنے سے پہلے یکا یک وفات پائی۔ ان کی جواں مرگی سے شیخ حبیب اللہ کو سخت صدمہ پہنچا۔

۳۰۔ فاطمہ خانم (م:۱۹۰۹ء) علامہ شبلی کی بڑی صاحبزادی۔

۳۱۔ وقف علی الاولاد: علامہ شبلی کا ایک عظیم الشان کارنامہ جس میں وہ پانچ برس تک مسلسل مصروف رہے۔ ہندوستان کے تمام مشاہیر علما اور قانون دانوں سے رابطہ قائم کیا اور وقف علی الاولاد کے لئے تحریک چلائی، جس میں بالآخر وہ کامیاب ہوئے اور قانون وقف علی الاولاد منظور ہوا۔

ооо

[۱۷]

علامہ شبلی کے متعلق دو مراسلے

۱۔تراجم تصانیف شبلی

اعظم گڑھ
یکم مئی ۲۰۱۵ء

مکرمی ومحترمی پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب
مدیر معارف السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

راقم نے ۲۰۱۱ء میں ''کتابیات شبلی'' مرتب کی تھی۔اس میں علامہ شبلی کی تصانیف کے بارہ زبانوں میں ۶۳ تراجم کا ذکر کیا گیا تھا،جس کی تفصیل حسب ذیل ہے:

۱۔اردو	۴	۲۔انگریزی	۱۶
۳۔بنگالی	۳	۴۔پشتو	۷
۵۔تاجک	۱	۶۔ترکی	۴
۷۔تمل	۱	۸۔عربی	۴
۹۔فارسی	۲۰	۱۰۔کنڑ	۱
۱۱۔مراٹھی	۱	۱۲۔ملیالم	۱
میزان	۶۳		

کتابیات شبلی کی اشاعت کے بعد کئی اور تراجم دریافت ہوئے ہیں جن کی تفصیل درج ذیل ہے:

۱۔بنگالی تلخیص وترجمہ: سیرۃ النبی کی ساتوں جلدوں کی مولانا محی الدین خاں نے بنگالی زبان میں تلخیص کی ہے جو ۱۹۹۶ء میں ڈھاکہ بنگلہ دیش سے شائع ہوئی ہے۔یہ ۲۶۷

صفحات پر مشتمل ہے۔

۲۔پشتو تراجم: پشتو زبان میں علامہ شبلی کی دو کتابیں سیرۃ النعمان اور الغزالی کا ترجمہ دریافت ہوا ہے۔یہ دونوں ترجمے بشیر احمد ریان کے قلم سے ہیں اور صدیقی خپر ندویہ تولنہ کاسی روڈ کوئٹہ سے شائع ہوئے ہیں۔ان کے ملنے کے پتے درج ذیل ہیں:

۱۔صدیقی خپر ندویہ تولنہ کاسی روڈ کوئٹہ

۲۔صدیقی خپر ندویہ تولنہ ارک بازار کندھار

۳۔خیبر خپر ندویہ تولنہ جارہ میوند کابل

سیرۃ النعمان کا ترجمہ ۳۳۴ صفحات اور الغزالی کا ۲۶۱ صفحات پر مشتمل ہے۔

سیرۃ النعمان کا ایک اور پشتو ترجمہ محمد سعادت کے قلم سے ۱۳۱۵ھ میں پشاور سے شائع ہوا ہے، جو ۶۷اصفحات پر مشتمل ہے۔

۳۔ترکی تراجم: ترکی زبان میں تین کتابوں کے نئے ترجموں کا علم ہوا ہے۔سفرنامہ روم ومصروشام کے ترکی ترجمہ کو جناب یوسف قراچا نے ۲۰۰۲ء میں استانبول سے شائع کیا ہے۔ ان ہی نے الغزالی کا ترجمہ ۲۰۱۲ء میں استانبول سے شائع کیا ہے۔اس کے علاوہ سیرۃ النبی جلد اول ودوم کے ترجمے بھی فاضل مترجم نے گذشتہ سال ۲۰۱۴ء میں استانبول سے شائع کئے ہیں۔

۴۔عربی تراجم: گذشتہ برسوں میں عربی زبان میں تصانیف شبلی کے کئی ترجمے شائع ہوئے ہیں اور یہ سب کے سب مصری اسکالر جناب جلال سعید الحفناوی کے قلم سے ہیں، جس کی تفصیل یہ ہے:

۱۔علم الکلام الجدید۔الجزیرہ القاہرہ، طبع اول ۲۰۱۲ء

۲۔شعر العجم جلد اول۔المرکز القومی للترجمہ قاہرہ، ۲۰۱۳ء

۳۔الفاروق۔المشروع القومی للترجمہ قاہرہ (س ن)

۴۔سفرنامہ روم ومصروشام۔طبع اول الجزیرہ القاہرہ، ۲۰۰۲ء

اس طرح اب علامہ شبلی کی تصانیف کے تراجم کی تعداد بڑھ کر ۴۷ ہوگئی ہے۔

(معارف مئی ۲۰۱۵ء ص ۳۸۵-۳۸۶)

۲۔ جہان شبلی

معارف اپریل ۲۰۱۸ء کے شمارہ میں جہان شبلی کی قسط ہشتم شائع ہوئی ہے۔ جس میں علامہ شبلی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] کے نو دریافت دو خطوط شامل ہیں۔ ایک صدی گذر جانے کے باوجود علامہ شبلی کی تحریروں کی دریافت کا سلسلہ جاری ہے، اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جہان شبلی کس درجہ وسیع ہے۔ راقم سطور گذشتہ ڈیڑھ دہائی سے باقیات شبلی کی جمع و تدوین میں مصروف ہے اور ابتک مکتوبات شبلی، شذرات شبلی، شبلی اور جہان شبلی، مراسلات شبلی اور نوادرات شبلی، قدردانان شبلی کی خدمت میں پیش کر چکا ہے۔ مذکورہ خطوط کی دریافت اور اشاعت سے یقیناً ذخیرہ شبلیات میں اضافہ ہوا ہے، البتہ اس مضمون میں چند امور تصحیح اور توجہ طلب ہیں۔

جہان شبلی میں شامل دوسرا خط منشی محمد امین زبیری [۱۸۷۰-۱۹۵۸ء] کے نام ہے۔ محمد حمزہ فاروقی کے مضمون ''مشاہیر کے غیر مطبوعہ خطوط امین زبیری کے نام'' [مطبوعہ مجلّہ اردو ج ۸۹-۹۰، شمارہ ۱۴۱، ۲۰۱۳ء] سے نقل کیا گیا ہے۔ محمد حمزہ فاروقی نے اپنے مضمون میں جو تمہید لکھی ہے اس پر رائے زنی کرتے ہوئے جہان شبلی کے مرتب نے لکھا ہے کہ

> ''راقم الحروف مولانا شبلی کے خلاف محمد مہدی کے لکھے کسی بھی کتابچے سے لاعلم ہے۔ کتابیات شبلی میں بھی ایسے کسی کتاب یا رسالے کا مذکور نہیں۔'' (معارف اپریل ۲۰۱۸ء ص ۲۹۸)

ڈاکٹر شمس بدایونی کی یہ دونوں باتیں صحیح نہیں۔ راقم کی مرتب کردہ کتابیات شبلی میں اس رسالہ کا اندراج موجود ہے۔ ملاحظہ ہو کتابیات شبلی ص ۷۶، اندراج نمبر ۴۰۲، مطبوعہ دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۱ء۔

محمد مہدی کا رسالہ ''تذکرہ شمس العلماء مولانا شبلی'' مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہے۔ ایک نسخہ مولانا آزاد لائبریری علی گڑھ کے ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کلیکشن میں بھی ہے۔ اس کا عکس راقم کے پاس بھی ہے۔ ۶۱ رصفحات پر مشتمل یہ رسالہ بشیر پاشا سیریز کے تحت اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ سے شائع ہوا ہے۔ سنہ اشاعت ندارد، البتہ دیباچہ پر ۷ر دسمبر ۱۹۲۵ء کی تاریخ درج ہے۔

محمد حمزہ فاروقی کی یہ رائے بھی صحیح ہے کہ یہ رسالہ منشی محمد امین زبیری ہی کی کوشش کا نتیجہ

ہے۔محمد مہدی نے دیباچہ کا آغاز اس طرح کیا ہے:

''مولوی محمد امین صاحب کی فرمائش کی تعمیل میں بشیر پاشا سیریز کے لئے اس سے قبل ''تذکرہ مولانا نذیر احمد صاحب مرحوم ومغفور'' لکھا تھا اور تذکرہ ہذا بھی اسی سلسلہ کے لئے مولوی صاحب ممدوح ہی کی فرمائش سے مرتب کیا گیا ہے۔''

البتہ یہ رسالہ علامہ شبلی کے خلاف نہیں لکھا گیا ہے''۔

محمد حمزہ فاروقی نے اپنے مضمون کی تمہید میں محمد امین زبیری کے خطوط شبلی کی تدوین و اشاعت اور ان کے معاندانہ رویے کا ذکر کیا ہے۔ڈاکٹر شمس بدایونی نے اس کی تردید کی ہے اور اپنے موقف کی تائید میں اپنے ہی مقدمہ خطوط شبلی کا یہ اقتباس نقل کیا ہے:

''ان خطوط کی ترتیب کے وقت مرتبین کی نیت شبلی کی کردارکشی اور بدنامی کی نہ تھی بلکہ ایک عبقری شخصیت کی زندگی کے ایک نئے انوکھے اور کسی حد تک نامعلوم پہلو اور افکار شبلی پر اس کی نشاندہی تھی جیسا کہ دونوں دیباچوں (خطوط شبلی طبع اول ودوم) کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے۔'' (بحوالہ معارف اپریل ۲۰۱۸ء ص ۲۹۸)

ڈاکٹر خالد ندیم نے اپنی کتاب ''شبلی شکنی کی روایت اور دوسرے مضامین'' (نشریات، لاہور ۲۰۱۷ء، ص ۱۹) میں بھی یہی رائے پیش کی ہے۔

خطوط شبلی کا مقدمہ محمد امین زبیری نے بابائے اردو مولوی عبدالحق سے لکھوایا جو اس وقت [۲۶-۱۹۲۵ء] علمی حلقوں میں شبلی مخالف سمجھے جاتے تھے، چنانچہ انہوں نے مقدمہ میں بہت سی لایعنی باتوں (اکل کھرے، تنگ مزاج) کے علاوہ یہ بھی لکھا کہ:

''مولانا شبلی کی تصانیف کو ابھی سے لونی لگنی شروع ہوگئی ہے۔زمانہ کے ہاتھوں سے کوئی نہیں بچ سکتا، وہ بہت سخت مزاج ہے مگر آخری انصاف اسی کے ہاتھ ہے۔ان کی بعض کتابیں ابھی سے لوگ بھولتے جاتے ہیں اور کچھ مدت کے بعد صرف کتاب خانوں میں نظر آئیں گی''۔(خطوط شبلی طبع اول ص ۲۶، بھوپال)

اس صریح شبلی شکنی اور اس کی اشاعت کے باوجود منشی امین زبیری کی نیت کو کم ازکم صاف قرار دینا قرین انصاف نہیں معلوم ہوتا۔حقیقت یہ ہے کہ خطوط شبلی کی اشاعت بالخصوص اس کا

مقدمہ شبلی شکنی کا نقطہ آغاز ہے۔ بعد کے ادوار میں محمد امین زبیری جو مضامین اور کتابیں لکھیں وہ سب شبلی شکنی کا حصہ ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ بعد میں دوسرے اہل قلم نے جو مخالفانہ کتابیں لکھیں اور شبلی کی کردارکشی کے مرتکب ہوئے، ان سب کا بنیادی ماخذ بابائے اردو کا مقدمہ اور محمد امین زبیری ہی کی تحریریں ہیں۔

یہاں یہ ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ خطوط شبلی کا مقدمہ جس زمانہ [۲۶-۱۹۲۵ء] میں لکھا گیا، حافظ محمود خاں شیرانی کا سلسلہ مضامین تنقید شعرالعجم تین سال پہلے سے جاری تھا اور دو سال بعد تک جاری رہا۔ یہ سلسلہ مضامین خود بابائے اردو کی زیرنگرانی ان کے رسالہ ''اردو'' میں شائع ہو رہا تھا۔ اس کے باوجود امین زبیری نے مقدمہ لکھنے کے لئے مولانا حبیب الرحمٰن شروانی، مولانا عبدالماجد دریابادی اور مولانا سید سلیمان ندوی کے بجائے بابائے اردو کا انتخاب کیا، پھر یہ کیسے تسلیم کرلیا جائے کہ ان کی نیت صاف تھی۔ ہاں یہ تعجب خیز بات ضرور ہے کہ علامہ شبلی سے منشی امین زبیری کے جس زمانہ میں روابط قائم ہوئے علامہ کی ساری توجہ شعرالعجم سے ہٹ کر سیرۃ النبی کی طرف ہو چکی تھی اور وہ یہ عزم کر چکے تھے کہ ''اگر مر نہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو دنیا کو ایک ایسی کتاب دے جاؤں گا، جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہو سکتی''۔ اور اسی پاکیزہ کام کی تکمیل کے لئے انہوں نے ''محبی'' امین زبیری کو بار بار خطوط لکھے اور بیگم سلطان جہاں کی ''زرافشانی'' سے نہ صرف سیرۃ النبی سیرالصحابہ بلکہ دوسرے علمی کاموں کی انجام دہی کا خواب دیکھا۔ شبلی کی دردمندی، دل سوزی اور ان کے عظیم الشان علمی، ادبی اور تاریخی کارنامے امین زبیری کو خطوط شبلی کے مقابلہ میں کیوں کر نظر نہیں آئے اور جس طرح انہوں نے کئی ارباب کمال کی سوانح عمریاں لکھیں علامہ شبلی کی سوانح عمری اور ان کے ہمہ جہت کارناموں کا تذکرہ کیوں نہیں لکھا۔ واضح رہے کہ خطوط شبلی کی اشاعت کا اہتمام اس وقت کیا گیا جب علامہ شبلی کی حیات و خدمات پر کوئی مستقل کتاب شائع نہیں ہوئی تھی۔

[معارف مئی ۲۰۱۸ء ص ۳۷۳-۳۷۵]

○○○

[۱۸]

مطالعہ شبلی کے چند زاویے

علامہ شبلی [۱۸۵۷-۱۹۱۴ء] ایک صدی سے ہماری نہ صرف علمی وادبی بلکہ ذہنی اور فکری تاریخ کا بنیادی حصہ ہیں اور غالباً یہی سبب ہے کہ ان کی عظمت کا سارا زمانہ معترف ہے:

آپ بے بہرہ ہے جو معتقد میر نہیں

علامہ شبلی عبقری اور یگانہ روزگار شخص تھے۔ ان کا شمار ان اشخاص میں ہوتا ہے جو ماضی سے بخوبی آگاہ اور مستقبل پر دانشورانہ نگاہ رکھتے تھے۔ ان کا دائرہ کار بھی متنوع اور کثیر الجہات ہے۔ انہوں نے جو علمی وفکری سرمایہ یادگار چھوڑا ہے، وہ ایک صدی سے علم وادب کے مختلف میدانوں میں ملت کی رہبری ورہنمائی کر رہا ہے اور یقین ہے آئندہ بھی اس کی افادیت میں کمی واقع نہ ہوگی۔

گذشتہ ایک صدی سے شبلی اور افکار شبلی کا بھی مسلسل مطالعہ وجائزہ پیش کیا جارہا ہے اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ مکمل شبلی کی بازیافت کے لئے انفرادی کوششوں کے ساتھ ہند و پاک کی جامعات میں بھی تحقیقی مقالات کا ایک سلسلہ قائم ہے۔ اس طرح اب ہماری علمی وادبی تاریخ میں ایک بڑا ذخیرہ مطالعات شبلی پر جمع ہوگیا ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ شبلی شناسی اب ایک مستقل موضوع تحقیق وتصنیف کا درجہ حاصل کر چکی ہے۔ اس لئے ضروری ہوگیا ہے کہ شبلی شناسی کے تشنہ تحقیق و تصنیف پہلوؤں کی وضاحت کی جائے اور یہ دکھایا جائے کہ مطالعہ شبلی کے نئے زاویے کیا ہیں اور کیا کیا ہو سکتے ہیں۔

[۱]

علامہ شبلی کی سوانح عمری پر جانشین شبلی مولانا سید سلیمان ندوی [۱۸۸۴-۱۹۵۳ء] کی معرکۃ الآرا تصنیف ''حیات شبلی'' ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی، جسے مطالعہ شبلی میں سنگ میل قرار دیا

جاتا ہے۔ ہماری ادبی تاریخ میں خواجہ الطاف حسین حالی [۱۸۳۷-۱۹۱۴ء] کی ''حیات جاوید'' کے بعد غالباً ''حیات شبلی'' سے بہتر، مبسوط اور جامع سوانح عمری اب تک نہیں لکھی گئی۔ اہل نظر نے علی العموم اس کا اعتراف کیا ہے۔ سوانح شبلی کا ایک اہم ماخذ شبلی کے بزرگ اور معاصر اہل قلم کے مضامین و مقالات بھی ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے ان کا بڑی حد تک حیات شبلی میں احاطہ کرلیا ہے۔ ان تحریروں کا ایک مجموعہ ''شبلی شناسی کے اولین نقوش'' کے نام سے ممتاز ادیب و نقاد ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی نے مرتب کیا ہے۔ جسے شبلی صدی [۲۰۱۴ء] کے موقع پر دارالمصنّفین اعظم گڑھ نے شائع کیا۔ اس میں کئی ایسی تحریریں شامل ہیں جو حیات شبلی کے زمانہ تصنیف میں سید صاحب کے دسترس میں نہیں تھیں۔ اسی طرح بعد کے اہل قلم نے سوانح شبلی کے متعلق جو نئ معلومات پیش کی ہیں یا حیات شبلی میں جو اضافے ہوئے ہیں، ان کی نشاندہی اور تجزیہ بہر حال باقی ہے۔ کمال ہے سو برس بعد بھی علامہ شبلی کی فکر و نظر کے نئے جلوے نگاہوں کو خیرہ کر رہے ہیں۔

علامہ شبلی نے اپنی خودنوشت تو نہیں لکھی مگر ان کی متعدد تحریروں میں اور خاص طور پر مکاتیب میں ان کے حالات و واقعات اور افکار و خیالات بڑی حد تک آ گئے ہیں۔ انہیں ممتاز ادیب و نقاد ڈاکٹر خالد ندیم (صدر شعبہ اردو، سرگودھا یونیورسٹی) نے ''شبلی کی آپ بیتی'' کے عنوان سے نہایت سلیقہ سے جمع کر دیا ہے۔ اس سے سوانح شبلی کا ایک نیا اور اصلی منظر نامہ سامنے آتا ہے اور خاص طور پر ان کے علمی انہاک اور مسلسل جستجوئے علم و تحقیق کا اندازہ ہوتا ہے۔ بلاشبہ یہ بڑا اہم اور وقیع کام ہے۔ شبلی کی وفات کے سو سال بعد یہ ایک اہم کتاب دارالمصنّفین سے شائع ہوئی ہے۔ یقینی طور پر اسے شبلی شناسی میں ایک اضافہ قرار دیا جاسکتا ہے۔

[۲]

علامہ شبلی ایک بڑے سوانح نگار تھے۔ انہوں نے المامون، سیرۃ النعمان، الفاروق، الغزالی اور سوانح مولانا روم جیسی بلند پایہ سوانح عمریاں لکھیں، جنہوں نے ایک زمانہ کو متاثر کیا۔ ان کے اثر سے مسلمان برطانوی عہد میں احساس کمتری سے باہر آئے اور اپنے اسلاف کے قابل فخر کارناموں نے ان کا سر فخر سے بلند کیا۔ عہد حاضر میں ہندو احیا پرستی کے ذریعہ پھر اسی طرح کا حملہ مسلمانوں کے مذہب اور ان کی تہذیب و ثقافت پر ہے۔ اس کے سد باب کے لئے علامہ شبلی

کے افکار ونظریات اوران کی تصنیفات اوران کا سلسلہ ہیروز آف اسلام کس درجہ معاون ہوسکتا ہے،اس کا تجزیہ بھی ضروری ہے۔

[۳]

تصانیف شبلی کے مطالعہ وتجزیہ پر خاصا علمی وتحقیقی کام ہوا ہے اورعہد شبلی سے اب تک مستقل کتابوں کے علاوہ سیکڑوں مضامین ومقالات سپرد قلم ہوئے ہیں۔کتابیات شبلی میں ''تنقید و تجزیہ تصانیف شبلی'' کےعنوان سے اس طرح کے مضامین ومقالات کی ایک طویل فہرست درج کی گئی ہے۔جن کی تعداد ا۳۷ رہے۔راقم کی کتاب'' آثار شبلی''اسی موضوع پر ہے،جس میں علامہ شبلی کی تمام دستیاب تحریروں کا مطالعہ وتجزیہ یکجا پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہےاور جس میں تمام معلوم تحریروں کا احاطہ کیا گیا ہے۔نوادر شبلی پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔باوجوداس کےاس موضوع پر کام کی بہرحال اب بھی گنجائش باقی ہے۔

[۴]

علامہ شبلی کی تحریروں کی جمع وترتیب وتدوین اوران کے مرتبین ومحققین کا مطالعہ وتجزیہ بھی ایک اہم موضوع مطالعہ ہوسکتا ہے۔علامہ سید سلیمان ندوی نے اپنے استاذ کی نہ صرف غیر مطبوعہ کتابوں سیرۃ النبیؐ اورشعرالعجم کی پانچویں جلد کومرتب کر کے شائع کیا بلکہ ان کے تمام دستیاب مقالات کوآٹھ جلدوں میں موضوعات کےتحت مرتب کر کے شائع کیا۔خطوط وخطبات،اردواور فارسی کلیات کی جمع وترتیب اوراشاعت بھی سید صاحب کے کارنامے ہیں۔مشتاق حسین کی مرتبہ باقیات شبلی اورراقم کی مرتبہ کتابیں مکتوبات شبلی،شذرات شبلی،مراسلات شبلی اورنوادرات شبلی اسی جمع وترتیب کا حصہ ہیں۔ان کا مطالعہ وتجزیہ بھی شبلی شناسی کا ایک اہم موضوع قرار دیا جاسکتا ہے۔

[۵]

اکتوبر ۲۰۱۷ء میں نوادرات شبلی شائع ہوئی۔علامہ کی یہ تحریریں راقم کوگذشتہ دس سالوں میں مطالعہ شبلی کے دوران کتب ورسائل میں ملی تھیں اورراقم انہیں ایک مجموعہ کے لئے حفاظت سے یکجا کررہا تھا۔اس میں علامہ شبلی کی متنوع تحریریں مقالات،خطبات،خطوط اور تقدیم وتقاریظ شامل ہیں۔ان نودریافت تحریروں کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔خیال تھا کہ شاید اب برسوں علامہ

شبلی کی نئی تحریریں دستیاب نہ ہوں گی مگر مجموعہ ابھی شائع ہوا ہی تھا کہ نواب محسن الملک، محمد امین زبیری، سکھ دیال سنگھ اور قوس حمزہ پوری کے نام ایک ایک خط اور دریافت ہو گئے۔ چند ماہ بعد مولوی محمد اسحاق وکیل ہائی کورٹ الہ آباد، میر ولایت حسین، پروفیسر زماں مہدی اور خلف شبلی حامد حسن نعمانی کے نام مزید ۳۶ خطوط دریافت ہوئے۔ ان نو دریافت خطوط کا مطالعہ بہر حال ضروری ہے۔ ان سے احوال وافکار شبلی کے تجزیے میں بعض نئے پہلو سامنے آئیں گے۔

[۲]

افکار شبلی کے مطالعہ کا آغاز ان کی زندگی ہی میں ہو گیا تھا اور ہنوز یہ سلسلہ جاری ہے۔ چونکہ علامہ شبلی ہشت پہل اور کثیر الاطراف شخص ہیں اور مختلف موضوعات پر ایک واضح نقطۂ نظر رکھنے والے مفکر ہیں، اس لئے ان کے مطالعہ و تجزیے پر اہل قلم کی خاصی توجہ رہی ہے۔ چنانچہ ان کی فکر و نظر کے مطالعہ پر سیکڑوں مضامین و مقالات اور کئی اہم کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی کی کتاب شبلی ایک دبستان، اختر وقار عظیم کی کتاب شبلی بحیثیت مورخ، عبداللطیف اعظمی کی کتاب مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں، شیخ محمد اکرام کی کتاب یادگار شبلی، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی کی کتاب شبلی کی علمی و ادبی خدمات، پروفیسر سعود عالم قاسمی کی کتاب ''علامہ شبلی نعمانی کی قرآن فہمی''، ڈاکٹر شاداب عالم کی کتاب تنقیدی مباحث اور شبلی کا نظام نقد اور راقم کی کتاب آثار شبلی اس موضوع پر اہم کتابیں تسلیم کی جاتی ہیں۔ لیکن یہ اس قدر اہم اور وسیع موضوع ہے کہ ان چند کتابوں سے اس کا حق ادا نہیں ہوتا۔ مزید کام کی ابھی بہت گنجائش باقی ہے۔ خاص طور پر تعلیمی، تنقیدی، سوانحی، تاریخی، سیاسی اور فلسفیانہ موضوعات پر معاملہ مضامین سے آگے نہیں بڑھ سکا ہے۔ یہ موضوعات مستقل کتاب چاہتے ہیں۔ علامہ شبلی کی تحریروں کے جائزے میں ان کی تصنیفات و تالیفات نیز مجموعہ مقالات کے چند ہی موضوع اہل قلم کے پیش نظر رہے، تمام موضوعات کا احاطہ نہیں کیا گیا۔ مقالات سے استفادہ کیا جاتا رہا ہے، مگر علامہ شبلی کے مقالات میں بہت تنوع ہے۔ فلسفیانہ مقالات تو سرے سے نظر انداز ہو گئے۔ وجہ جو بھی ہو لیکن یہ ایک بنیادی کمی رہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بحیثیت فلسفی علامہ شبلی کا درجہ متعین نہیں کیا جا سکا، یہ کام فلسفہ کے ماہرین کا تھا۔ کسی یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ نے بھی اس کی طرف توجہ نہیں کی۔

[۷]

علامہ شبلی کے مقالات کی آٹھ جلدوں میں جمع وترتیب کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ان کی ترتیب اپنے زمانہ کے لحاظ سے بہت عمدہ تھی، یعنی موضوعات کے اعتبار سے مقالات جمع کئے گئے تھے۔ ان سے خاطر خواہ استفادہ بھی کیا گیا اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے، لیکن اب نئے حالات کا تقاضہ ہے کہ انہیں از سر نو ایڈٹ کیا جائے۔تصحیح متن کے علاوہ حواشی اور تراجم اور اشاریہ و کتابیات کے ساتھ شائع کیا جائے۔ان موضوعات پر بعد میں علامہ شبلی کے جو مقالات وخطبات دستیاب ہوئے ہیں بطور ضمیمہ ان کا اضافہ بھی ضروری ہے۔مقالات کی کئی جلدوں میں دیباچہ بھی شامل نہیں ہے جس کی ضرورت سے کون انکار کر سکتا ہے۔

مقالات کے جائزے پر مشتمل ایک کتاب ''شبلی نعمانی کے مقالات کا تنقیدی جائزہ'' از عبدالرحیم انصاری، پی ایچ ڈی کا مقالہ شائع ہو چکا ہے۔مگر اس کی حیثیت تعارف سے زیادہ کی نہیں، اس لئے یہ کام بہر حال باقی ہے۔

سرسید نے ایم اے او کالج میں صیغہ تصحیح اغلاط تاریخی قائم کیا اور علامہ شبلی کو اس کا سکریٹری بنایا۔ چنانچہ علامہ شبلی نے کئی اہم تاریخی اغلاط کی تصحیح کا فریضہ انجام دیا۔ کتب خانہ اسکندریہ، الجزیہ، حقوق الذمیین اور مضامین عالمگیر وغیرہ اسی سلسلہ کے تحقیقی مقالات ہیں۔علامہ شبلی ندوہ آئے تو یہاں انہوں نے یہی شعبہ قائم کیا اور مولانا سید سلیمان ندوی کو اس کا سکریٹری مقرر کیا، چنانچہ سید صاحب نے تاریخ کی نصابی کتابوں کا جائزہ لے کر ان کے اغلاط کی نشاندہی کی اور اس سلسلہ کے چند تاریخی مقالات بھی لکھے۔کتب خانہ اسکندریہ اور الجزیہ پر علامہ شبلی کے مقالات کے بعد جو اعتراضات ہوئے ان کے جوابات بھی لکھے۔اس سلسلہ کے ان کے چند مقالات، مقالات سلیمان میں شامل ہیں۔ جولائی ۱۹۱۶ء میں معارف جاری ہوا تو اس میں بھی یہ سلسلہ جاری رہا، بلکہ ایک قدم آگے بڑھ کر سید صاحب نے بزم تاریخ ہند بنائی، جس کا ایک مقصد تاریخ ہند کے اغلاط کی تصحیح بھی تھا۔مگر ان کی یہ تحریک بارآور نہ ہو سکی۔آج کے حالات میں اس موضوع کی اہمیت اور بڑھ گئی ہے۔اب پرنٹ میڈیا کے ساتھ الکٹرانک میڈیا بھی اس میں شامل ہو گیا ہے جو مسلمانوں کی تاریخ وتہذیب پر آئے دن خرافات پیش کیا کرتا ہے۔ان کے مقابلہ اور تاریخی

اغلاط کی تصحیح کے لئے نہ صرف تحقیقی مقالات اور کتابوں کی ضرورت ہے بلکہ ایسے افراد کی بھی ضرورت ہے جو ان کے تشفی بخش جوابات دے سکیں۔ علامہ شبلی کے مقالہ کتب خانہ اسکندریہ سے شروع ہونے والی اس تاریخی تحریک کو نئے بال و پر دینا اور جدید حالات کے مطابق پیش کرنا بھی شبلی شناسی کا حصہ ہوگا۔

[۸]

علامہ شبلی کی شخصیت اور افکار و نظریات پر جو کتابیں لکھی گئی ہیں، ان کا مطالعہ و تجزیہ نئے حالات اور نئے تناظر میں ایک اہم موضوع تحقیق ہے۔ یہ کتابیں برطانوی ہندستان میں لکھی گئیں پھر ہندوستانی مسلمان تقسیم کی قیامت صغریٰ سے دوچار ہوئے اور برسوں لہولہان رہے اور اب بھی اس کے حصار سے باہر نہیں آسکے ہیں۔ ان حالات میں شبلی کے افکار و خیالات کا تجزیہ اور بھی ضروری ہوگیا ہے کہ وہ کہاں تک مشعل راہ ہوسکتا ہے۔

[۹]

گذشتہ سو سال میں علامہ شبلی کی ہمہ جہت شخصیت اور عظیم الشان علمی، دینی، ادبی اور تاریخی کارناموں پر تقریباً ڈیڑھ ہزار مضامین و مقالات لکھے گئے اور علم و ادب کے مختلف پہلوؤں پر لکھے گئے۔ ان مقالات کے دس سے زائد انتخابات کتابی صورت میں شائع ہوئے ہیں۔ ان میں ''شبلی نقادوں کی نظر میں (ناز صدیقی)، شبلی ادیبوں کی نظر میں (محمد واصل عثمانی)، شبلی کی علمی و ادبی خدمات (ڈاکٹر خلیق انجم)، علامہ شبلی نعمانی: معنویت کی بازیافت (ڈاکٹر شباب الدین) مقالات یوم شبلی (حافظ نذر احمد) خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شبلی صدی کی مناسبت سے بھی مقالات کے کئی مجموعے طبع ہوئے۔ ان میں مطالعات شبلی (پروفیسر اشتیاق احمد ظلی)، شبلی نعمانی شخصیت اور عصری معنویت (ڈاکٹر شہاب الدین ثاقب)، تفہیم شبلی (ڈاکٹر ارشاد نیازی)، بیاد شبلی (ڈاکٹر علاء الدین خاں) بڑی اہمیت کے حامل انتخابات ہیں۔ اس سلسلہ کو مزید وسعت دی جاسکتی ہے۔ راقم نے کتابیات شبلی میں ۲۰۱۱ء تک شائع ہونے والے مقالات کی موضوعات کے لحاظ سے فہرست درج کی ہے۔ اس سے بآسانی انتخاب کے مراحل طے کئے جاسکتے ہیں۔ یقیناً اس سے شبلی شناسی میں اضافہ ہوگا۔ ان کے سوا ایک صدی میں شبلی پر جو مقالات لکھے گئے ہیں، عہد

بہ عہد شبلی شناسی کے اس ذخیرہ کو بھی مطالعہ کا موضوع قرار دیا جا سکتا ہے، جن پر اب تک سرے سے توجہ نہیں دی گئی ہے۔

[۱۰]

علامہ شبلی اردو کے غالباً واحد مصنف ہیں جن کی بیشتر تصانیف کے جواب میں مضامین و مقالات کے علاوہ تقریباً ایک درجن کتابیں لکھی گئی ہیں۔ الفاروق کے جواب میں دو کتابیں الفرق اور سوانح عمری حضرت عمرؓ۔ شعرالعجم کے جواب میں تنقید شعرالعجم۔ سیرۃ النعمان کے جواب میں دو کتابیں حسن البیان فی مافی سیرۃ النعمان اور ریویو سیرۃ النعمان لکھی گئیں۔ موازنہ انیس و دبیر کے جواب میں تین کتابیں ردالموازنہ، المیزان اور تردیدالموازنہ لکھی گئیں۔ سیرۃ النبیؐ کے جواب میں پانچ کتابیں (البحث القوی عن سیرۃ النبیؐ، اسوۃ الرسولؐ [چار جلدیں] فتنۂ شبلی، التکمیل اور مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار) لکھی گئی ہیں۔ دیگر موضوعات پر دوسے زائد مخالفانہ کتابیں ذکر شبلی، شبلی کی رنگین زندگی اور شبلی کی حیات معاشقہ موجود ہیں۔ چند غیر جانبدارانہ مطالعے بھی شائع ہوئے ہیں، جیسے الفاروق ایک مطالعہ [پروفیسر یاسین مظہر صدیقی] شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں [سید شہاب الدین دسنوی]، موازنہ انیس و دبیر مطالعہ، محاسبہ، تقابل [ڈاکٹر ارشاد نیازی]، موازنہ انیس و دبیر کا تنقیدی جائزہ [سید ظہورالاسلام] اور شبلی شکنی کی روایت اور دوسرے مضامین [ڈاکٹر خالدندیم] وغیرہ۔ ان کتابوں کا مطالعہ اور تنقیدی جائزہ شبلی شناسی کا ایک نہایت اہم موضوع ہے۔ اس پر تحقیقی مقالہ لکھا جانا بے حد ضروری ہے۔

[۱۱]

علامہ شبلی کی اردو و فارسی شاعری پر اردو میں ایک بڑا ادبی و تنقیدی ذخیرہ موجود ہے۔ مضامین کی شکل میں بھی اور کتابوں کی شکل میں بھی۔ مگر اب علامہ شبلی کے اردو و فارسی کلیات کی تدوین نو کی ضرورت درپیش ہے۔ کلیات میں حواشی نہیں، وارد شخصیات کا تذکرہ نہیں، فرہنگ نہیں۔ یہ بہر حال ضروری امور ہیں۔ یونیورسٹی کے شعبہ اردو و فارسی میں ایم اے اور ایم فل کے لئے بھی کام کرائے جا سکتے ہیں۔ جامعات بالخصوص مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اساتذہ کو ایم اے او کالج کے لائق فخر استاذ کے لئے اتنی گنجائش تو نکالنی ہی چاہئے۔

علامہ شبلی نے اردو میں تاریخی نظموں کی طرح ڈالی۔ بعد کے شعراء نے اس کا نہ صرف تتبع کیا بلکہ اس سلسلے کو وسعت دی۔ تلامذہ شبلی، اقبال سہیل اور سید سلیمان ندوی کے علاوہ علامہ اقبال نے بھی اس میدان میں داد سخن دی بلکہ ان کے یہاں یہ ذوق اور نکھر گیا ہے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ فارسی کے سابق صدر اور ممتاز ادیب و شاعر پروفیسر ضیاء احمد بدایونی تتبع شبلی کے لئے خاص طور پر مشہور ہیں۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے تذکار سلف کے دیباچے میں لکھا ہے کہ

''مولانا شبلی مرحوم پہلے شخص تھے جنہوں نے آج سے پندرہ سال قبل اس قسم کا سلسلہ نظم اردو میں صحیح اصول پر شروع کیا اور سرور کائناتؐ، صحابہ کرام و مشاہیر تاریخ اسلام کے بیسیوں واقعات دلکش انداز میں نظم کر ڈالے۔ مرحوم کے بعد ان کے تتبع میں کہنے والے متعدد پیدا ہوئے لیکن اس طرز میں اس رسالے کے مؤلف (ضیاء احمد بدایونی) سے زیادہ کامیاب میں نے اب تک کسی کو نہیں پایا۔ انہوں نے نہ صرف نوعیت عنوانات میں بلکہ انداز بیان، نشست الفاظ، بحور نظم، مصرعوں کی ترکیب۔ غرض ہر شے میں مولانا شبلی کا چربہ اتار لیا ہے۔ اور اس کامیابی پر وہ مستحق تہنیت ہیں۔''

علامہ شبلی کی اس تاریخی اور واقعاتی شاعری کا کن کن شعراء نے تتبع کیا اور شبلی کے شاعرانہ طرز فکر کو کس قدر وسعت و ترقی دی گئی، اب تک اس کا مطالعہ بھی نہیں کیا گیا ہے۔

[۱۲]

علامہ شبلی کو ان کے عہد سے منظوم خراج عقیدت پیش کرنے کا ایک سلسلہ ہے۔ اس کا آغاز ان کے سفر روم و مصر و شام سے واپسی پر علی گڑھ کالج میں ایک تہنیتی تقریب سے ہوا تھا اور جو آج بھی جاری ہے۔ راقم نے سنہ ۲۰۱۱ء تک شائع ہونے والی منظومات، قطعات و رباعیات کو اپنی کتاب ''شبلی سخنوروں کی نظر میں'' جمع کر دیا ہے۔ بعد میں دریافت یا شائع ہونے والی منظومات کا اضافہ اور ان کی ادبی حیثیت کا تجزیہ بھی ضروری ہے۔

[۱۳]

۱۹۳۰ء میں حامد علی ندوی مدیر رسالہ خضر راہ لکھنؤ نے خضر راہ کا شبلی نمبر شائع کیا۔ اور

۲۰۰۷ء میں پروفیسر اختر الواسع نے اسلام اور عصر جدید دہلی کا شبلی نمبر شائع کیا۔اس طویل عرصہ میں اردو کے متعدد ممتاز رسائل نے خصوصی شمارے شائع کئے ہیں۔ان تمام خصوصی شماروں کا تنقیدی جائزہ راقم نے اپنی کتاب ''شبلی شناسی کے سو سال'' میں پیش کیا ہے۔۲۰۰۷ء کے بعد دسیوں رسالوں نے ''شبلی نمبر'' شائع کئے ہیں۔ان میں ماہنامہ معارف اعظم گڑھ، مجلّہ علوم اسلامیہ علی گڑھ، بازیافت لاہور، صحیفہ لاہور، خیال وفن لاہور، قومی زبان حیدرآباد اور مجلۃ الہند (عربی) وغیرہ کے خصوصی شمارے خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔شبلی صدی کے موقع پر متعدد رسالوں نے گوشے بھی شائع کئے ہیں۔ان سب کا مطالعہ وتجزیہ بھی شبلی شناسی کا ایک حصہ ہے۔

[۱۴]

علامہ شبلی اپنے وقت کے بڑے ماہر تعلیم تھے اور ان کا ایک خاص نظریہ تعلیم تھا۔تعلیمی مطالعے و جائزے کے لئے انہوں نے روم ومصر وشام کا سفر کیا۔وہاں کے مدارس اور کالجوں کا معائنہ کیا۔ان کے تعلیمی حالات کا تجزیہ کیا اور اپنی متعدد تحریروں میں ان کی اہمیت اور مضرت دونوں پر اظہار خیال کیا۔درس وتدریس میں ان کی زندگی کا بیش تر حصہ گذرا تھا۔ندوہ کا نصاب تعلیم، جامعہ عثمانیہ کا نصاب تعلیم، مختلف مکاتیب ومدارس کی تعلیمی کمیٹیوں کی رکنیت وشمولیت کی بنا پر وہ نہ صرف ہندوستان بلکہ عالم اسلام میں رائج نظام ہائے تعلیم سے بخوبی واقف ہو گئے تھے۔یہی وجہ ہے کہ انہوں نے نئے حالات میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی اور عظمت رفتہ کی بازیافت کے لئے نئے منصوبے اور نئی حکمت عملی تیار کی۔ان کو عملی جامہ پہنانے کے لئے بڑی جدوجہد کی۔ندوہ کی تعلیمی سرگرمیاں اسی سلسلہ کا حصہ ہیں۔اس موضوع پر نسبتاً بہت کم کام ہوا۔ڈاکٹر عبیداللہ فراہی کی کتاب ''علامہ شبلی کا نظریہ تعلیم'' اور مولانا طاہر مدنی کے تعلیمی سمینار کے مجموعہ مقالات کے علاوہ مستقل کتابیں نہیں لکھی گئیں۔الندوہ کے شذرات شبلی جس میں تعلیم کے موضوع پر متنوع تحریریں شامل ہیں، ان کا سرے سے مطالعہ ہی نہیں کیا گیا ہے۔ندوہ میں تعلیم کے سلسلے میں انہوں نے جو جدوجہد کی اس کا بھی منصفانہ تجزیہ اب تک سامنے نہیں آسکا ہے۔ملک میں رہ رہ کر نصاب تعلیم میں تبدیلی اور تنقید وتجزیہ کی آوازیں بلند ہوتی رہتی ہیں۔اس پس منظر میں شبلی کے تیار کردہ نصاب تعلیم، مقاصد تعلیم وغیرہ پر مستقل مقالات کی ضرورت سے کون انکار کرسکتا ہے۔

[۱۵]

علامہ شبلی ۱۶ر سال علی گڑھ کالج سے وابستہ رہے اور بقیہ زندگی بھی ان کی ۱۶ر سال رہی۔ ندوے میں انہوں نے ۹ر برس گذارے۔ ان دونوں مقامات پر ان کے بڑے عظیم الشان تعلیمی کارنامے ہیں۔ ان پر بھی خاطر خواہ کام نہیں ہوا۔ ان سے متعلق بیشتر تحریریں اختلافات کی نذر ہوگئیں۔ شبلی شکنی کی کوششوں اور اس کے عمل اور ردعمل پر اہل قلم کی توجہ زیادہ مرکوز رہی۔ یہی وجہ ہے کہ علی گڑھ اور ندوہ سے متعلق ان کے کارناموں کا مفصل جائزہ اب تک نہیں لیا جاسکا۔ مقتدیٰ خاں شروانی کا طویل مقالہ ''علامہ شبلی کا قیام علی گڑھ'' بھی موضوع کا حق ادا نہیں کرتا۔ نوجوان اہل قلم ڈاکٹر عمیر منظر نے ''شبلی، مکاتیب شبلی اور ندوہ'' کے نام سے جو کتاب مرتب کی ہے اور جس میں ندوہ سے متعلق علامہ شبلی کے خطوط ضروری حواشی کے ساتھ جمع کئے گئے ہیں۔ اس کی حیثیت محض ایک آئینہ کی ہے۔ دراصل یہ موضوعات، مستقل تحقیقی مطالعے اور کتابوں کے متقاضی ہیں۔

[۱۶]

علامہ شبلی تقریباً تین سال انجمن ترقی اردو کے سکریٹری رہے اور اردو کی ترقی کے لئے متعدد منصوبے بنائے۔ پانچ سال تک تحریک وقف علی الاولاد جاری رکھی، جس میں تمام ہندوستان کے علماء اور قانون دانوں کو شامل کر لیا تھا۔ تعطیل جمعہ اور ان کے دوسرے قومی کاموں کا بھی تعارف و تجزیہ اور اس سلسلہ کی دوسری تحریریں جو مختلف کتابوں اور ندوہ کی رودادوں میں منتشر ہیں، وہ بھی شیرازہ بندی کی منتظر ہیں۔

علامہ شبلی کا شمار اردو کے معماروں میں ہوتا ہے۔ اس حیثیت سے اردو ادب کی پیشتر تاریخوں میں ان کی کاوشوں کا ذکر ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ موازنہ، تنقید، سوانح، تذکرہ اور دوسرے ادبی موضوعات میں بھی ان کی انفرادیت کا ذکر کیا جاتا ہے اور ان پر مضامین کے علاوہ بعض مستقل کتابیں بھی لکھی گئی ہیں، مگر علامہ شبلی نے علم و ادب کے افق کو جو بلندی عطا کی اور قدما کے سرمایہ میں جو اضافہ کیا، اس کی نشاندہی بہرحال باقی ہے۔

ان تذکروں اور تحریروں میں بعض اغلاط بھی راہ پا گئے ہیں، ان کی اصلاح بھی ضروری ہے۔ ہونہار اہل قلم عزیزی ڈاکٹر شاہ نواز فیاض نے ایک مضمون ''علامہ شبلی ادبی مورخین کی نظر

میں''، لکھ کر اس کام کا آغاز کیا ہے۔ اس سلسلہ کو مزید وسعت دینے کی ضرورت ہے۔

[۱۷]

مولانا محمد فاروق چریا کوٹی سے مولانا احمد علی محدث سہارن پوری تک اساتذہ شبلی اور شبلی پر ان کے اثرات، اسی طرح مولانا ظفر علی خاں سے مولانا عبدالسلام ندوی تک تلامذہ شبلی اور ان پر علامہ شبلی کے اثرات کا مطالعہ و تذکرہ بھی اب تک قلم بند نہیں ہو سکا ہے۔ تلامذہ شبلی کی علمی و ادبی اور سیاسی کاوشوں کے پس منظر میں فکر شبلی کی توسیع و ترویج بھی ایک اہم موضوع مطالعہ ہے۔ اس پر کئی مقالے لکھے جا سکتے ہیں۔ تلامذہ کے علاوہ متاثرین اور متبعین شبلی کی کاوشوں میں فکر شبلی کے عناصر کی نشاندہی بھی اب تک اہل قلم کی کماحقہ توجہ حاصل نہیں کر سکی ہے۔

[۱۸]

جس طرح بحیثیت ماہر تعلیم علامہ شبلی کے کارناموں سے چشم پوشی برتی گئی اور کماحقہ اس کا جائزہ پیش نہیں کیا گیا، اسی طرح ان کی سیاسی بصیرت اور سیاسی خدمات پر بھی کوئی قابل ذکر کام نہیں ہوا۔ سنگ میل پبلی کیشن لاہور نے اختر وقار عظیم کی کتاب ''شبلی بحیثیت سیاست داں'' ضرور شائع کی ہے، مگر اس میں موضوع سے بہت کم سروکار رکھا گیا ہے اور دوسرے موضوعات زیادہ زیر بحث آئے ہیں۔ نتائج بھی درست نہیں نکالے گئے ہیں، اس لئے اس پر ایک بھرپور کام کی ضرورت باقی ہے۔

[۱۹]

علامہ شبلی کی کتابوں کے دنیا کی تمام اہم زبانوں میں ترجمے ہوئے ہیں اور ایک کتاب کے کئی کئی ترجمے شائع ہوئے ہیں۔ الفاروق کا تو نو زبانوں میں ترجمہ ہوا ہے۔ یہ ترجمے ایران، افغانستان، پاکستان، سعودی عرب، بیروت، دوشنبے اور ترکی وغیرہ میں ہوئے اور وہیں سے شائع ہوئے۔ یہ سلسلہ اب بھی باقی ہے۔ مصر میں جلال سعید حفناوی، ترکی میں یوسف قراچا اور ہندوستان میں ڈاکٹر اورنگ زیب اعظمی نے حال میں علامہ کی کئی کئی کتابوں کے ترجمے کئے ہیں۔ عرصہ ہوا راقم نے ایک مقالہ ''عالم اسلام میں شبلی شناسی'' میں ان کا تعارف پیش کیا تھا، مگر ضرورت ہے کہ ان کا مکمل جائزہ لیا جائے اور دیکھا جائے کہ ان تراجم کا معیار اور ان کی اہمیت کیا ہے، کن

اہل قلم نے تر جمے کئے ،اس کے اسباب کیا تھے اوران کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔

عالمی زبانوں کے علاوہ تصانیف شبلی کے تراجم علاقائی زبانوں میں بھی ہوئے ہیں، مثلاً کنڑ، تلگو، ملیالم، گجراتی اور پشتو وغیرہ، ان کا بھی احاطہ کرنے کی ضرورت ہے۔

موازنہ انیس ودبیر، الفاروق، سیرۃ النبی اور بعض دوسری تصانیف شبلی کی تلخیصات بھی ہندو پاک کے مختلف مکتبات سے شائع ہوئی ہیں۔ اردو اور انگریزی کے علاوہ ایک تلخیص بنگالی زبان میں بھی شائع ہوئی ہے جو حال میں دریافت ہوئی ہے۔ ان پر اب تک مضامین بھی نہیں لکھے گئے ہیں۔

[۲۰]

علامہ شبلی محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین اور ماہنامہ الندوہ کے مدیر رہے۔ چار سال اورینٹل کالج میگزین علی گڑھ اور نو سال الندوہ لکھنؤ کی ادارت کے فرائض انجام دئے۔ لکھنؤ سے مسلم گزٹ کے اجراء میں بھی ان کا حصہ تھا۔ لسان الصدق کی ترقی میں بھی ان کا حصہ ہے۔ الہلال میں بھی ان کی تحریریں شائع ہوئی ہیں۔ ان کے رابطہ میں زمیندار لاہور، وکیل امرت سر، دکن ریویو، ہمدرد، وغیرہ بھی تھے۔ ان میں ان کے مضامین، مراسلے، غزلیں اور خود ان سے متعلق خبریں شائع ہوئیں۔ راقم نے اپنی کتاب ''شبلی اور جہان شبلی'' میں اس موضوع پر چند مضامین و مقالات قلم بند کئے ہیں لیکن وہ نا کافی ہیں اوران کے بھر پور مطالعہ کی ضرورت باقی ہے۔ اس سے شبلی کی صحافتی خدمات کا اندازہ ہوگا۔

[۲۱]

مکاتیب شبلی کی دو جلدیں سید صاحب نے مرتب کیں۔ سو سال بعد راقم نے ایک جلد مکتوبات شبلی مرتب کی۔ مراسلات کی ایک جلد ان کے علاوہ ہے۔ ان کتب کی اشاعت کے بعد بھی علامہ کے ۵۷ سے زائد مکاتیب دریافت ہو چکے ہیں۔ افادیت کے لحاظ سے یہ خطوط اردو کے کسی مکتوب نگار سے کم اہم نہیں۔ اس لئے کلیات مکاتیب شبلی کی ضرورت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ یہ انتہائی اہم کام ہے۔ خاص طور پر مکاتیب کے متن کی تصحیح، تاریخوں کی تعیین اور زمانی ترتیب کے علاوہ مکتوب الیہ اور دیگر رجال کے سوانحی کوائف، وضاحتی حواشی اور شبلی سے ان کے

ربط وتعلقات کی تفصیل وغیرہ ایک مستقل اور بڑا تحقیقی کام ہے، جو کئی جلدوں پر مشتمل ہوگا۔

[۲۲]

علامہ شبلی نے اپنے زمانہ قیام علی گڑھ اور اس کے بعد بھی ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاسوں میں شرکت کی، بلکہ ان کی علمی زندگی کا آغاز ہی ایجوکیشنل کانفرنس کے لکھنؤ اجلاس میں مقالہ (مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم) پیش کرنے سے ہوا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس کے متعدد اجلاسوں میں نہ صرف شرکت کی بلکہ مختلف موضوعات پر قراردادیں پیش کیں، بحث و مباحثہ میں حصہ لیا اور تقریریں بھی کیں۔ ایک آدھ بار سرسید کی قرارداد کی مخالفت بھی کی اور غور وفکر کے بعد شبلی کی قرارداد منظور ہوئی۔ ایجوکیشنل کانفرنس میں ان کی حصہ داری پر بھی اب تک کوئی کام نہیں ہو سکا ہے۔ ایجوکیشنل کانفرنس نے جو کتاب ''ایجوکیشنل کانفرنس کے سو سال'' شائع کی ہے۔ وہ ایک نامکمل کتاب ہے۔ اس میں علامہ شبلی کا خاطر خواہ ذکر بھی نہیں۔ دراصل اس کی تفصیلات کانفرنس کی سالانہ رودادوں میں محفوظ ہے جو علاحدہ بھی شائع ہوئی ہیں اور علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ میں بھی۔ یہ کام دقت طلب ضرور ہے لیکن بہر حال اہمیت کا حامل ہے۔

[۲۳]

علامہ شبلی نے ملک و بیرون ملک کے متعدد سفر کئے۔ سفر روم ومصر وشام کے علاوہ، سہارن پور اور لاہور کے تعلیمی سفر، تبدیلی آب و ہوا کے لئے کشمیر کا سفر، ندوہ اور تعلیمی اجلاسوں میں شرکت اور تصنیفی سرگرمیوں کے لئے بمبئی، جنجیرہ، حیدرآباد، بھوپال، دہلی، پٹنہ، رسول پور، امرت سر، پنجاب، کلکتہ، ڈھاکہ، سرحد، پشاور اور شاہ جہاں پور وغیرہ کے سفر کئے۔ سفر کے اسباب، سرگرمیاں، تاریخوں کی تعیین، غرض علامہ شبلی کے ان اسفار اور ان کی سرگرمیوں کا اب تک سرے سے مطالعہ ہی نہیں کیا گیا۔ یہ ایک بڑا تحقیقی کام ہے۔ سفر نامہ روم ومصر وشام کے مطالعے پر مشتمل متعدد مضامین لکھے گئے ہیں، لیکن جن اہل قلم نے لکھے ان کی نظر سفر نامہ کے مشمولات سے آگے نہیں بڑھ سکی۔ سفر روم ومصر وشام ہندوستان میں کسی یونیورسٹی کے پروفیسر کا پہلا علمی و تعلیمی سفر تھا۔ اس لحاظ سے بے حد اہمیت کا حامل ہے۔ خوشی ہے کہ اس موضوع پر میکس بروس نادر امریکہ میں کام کر رہے ہیں۔ انہوں نے ان لوگوں کے بارے میں خاص طور پر تحقیقات کی ہیں جن سے علامہ شبلی نے ملاقات

کی۔ یہ افراد کس اہمیت وعظمت کے لوگ تھے، ان کے افکار ونظریات کیا تھے وغیرہ، یہ سب تفصیل امریکی اسکالر میکس بروس نے لکھی ہے مگر ان کی کتاب اب تک شائع نہیں ہوئی ہے۔

[۲۴]

علامہ شبلی کا آخری اور عظیم الشان کارنامہ سیرت نبویؐ کی تالیف وتدوین ہے۔ جو دراصل سیرت نبوی کے حوالہ سے ایک تحریک کا آغاز تھا جسے ان کے شاگرد رشید مولانا سید سلیمان ندوی نے عرصہ تک جاری رکھا۔ شبلی کی ابتدائی دو جلدوں کے علاوہ پانچ جلدیں انہیں کے قلم سے ہیں۔ اس سلسلہ نے ملک میں سیرت نگاری کا عام رجحان پیدا کیا۔ سیرت نبویؐ پر مستشرقین کے اعتراضات کے جوابات لکھنے کی مہم تیز ہوئی۔ مصادر سیرت پر بحث ونقد کا سلسلہ قائم ہوا۔ چنانچہ ہندو پاک میں متعدد کتابیں لکھی گئیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی کی خطبات مدارس اور رحمت عالم بھی اسی سلسلہ کی کاوشیں ہیں۔ سید صاحب کے بعد سیرت نبویؐ کا کام دارالمصنّفین میں آگے نہیں بڑھ سکا، تاہم اس سے ملک وبیرون ملک تصنیفات سیرت میں اضافہ ہوا۔ علامہ شبلی نے سیرت کا کام جس بلند پیمانہ پر اور عظیم الشان طریقے پر شروع کیا تھا اور جن مقاصد کے تحت شروع کیا تھا، سیرت پر متعدد بلند پایہ کتابوں کی اشاعت کے بعد بھی اس کی ضرورت باقی ہے۔ یہ ایک ایسا مقدس موضوع ہے جس کا غیر مختتم سلسلہ جاری رہنا چاہئے۔ علامہ شبلی ''سیرت اکادمی'' اسی لئے قائم کرنا چاہتے تھے۔

[۲۵]

علامہ شبلی جن اداروں سے وابستہ رہے ان میں علی گڑھ اور ندوۃ العلما کا ذکر آچکا ہے، البتہ وہ ادارے جو انہوں نے قائم کئے، مثلاً دارالمصنّفین اعظم گڑھ، نیشنل اسکول (شبلی نیشنل کالج اعظم گڑھ) اور مدرسہ عربیہ بندول بھی لائق توجہ ہیں۔ دارالمصنّفین کی تاریخ اور علمی وادبی خدمات پر کئی تحقیقی مقالے لکھے گئے ہیں، مثلاً: ۱۔ دارالمصنّفین کی ادبی خدمات۔ پروفیسر خورشید نعمانی، ۲۔ دارالمصنّفین کی تاریخ اور علمی خدمات (دو جلدیں)۔ پروفیسر خورشید نعمانی، ۳۔ دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات۔ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ۴۔ دارالمصنّفین کی عربی خدمات۔ ڈاکٹر محمد عارف عمری، ۵۔ دارالمصنّفین کے سو سال۔ مولوی کلیم صفات اصلاحی۔

البتہ شبلی نیشنل پی جی کالج اعظم گڑھ کی طرف توجہ نہ دی جا سکی ہے۔ خود کالج کے ارباب حل وعقد اور اس کے اساتذہ نے اسے کام ہی نہیں تصور کیا اور بیرونی اہل قلم کی توجہ بھی یہ ادارہ نہ حاصل کر سکا۔ حالانکہ اس کا شاندار ماضی ہے۔ ایم اے او کالج علی گڑھ کے آغاز ۱۸۷۵ء سے محض ۸؍ سال بعد ۱۸۸۳ء میں علامہ شبلی نے اس کی بنیاد رکھی تھی۔ اس لحاظ سے اسے کب کا یونیورسٹی کا درجہ مل جانا چاہئے تھا مگر افسوس کہ کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا اور یہ اب تک ممکن نہ ہو سکا۔ اس کے فیض یافتگان نے بڑی نیک نامی حاصل کی۔ بڑے بڑے عہدوں پر پہنچے، جن میں اہل قلم بھی ہیں اور اہل سیاست بھی۔ مگر انہوں نے بھی اسے فراموش کیا۔ خوشی ہے کہ شعبہ تاریخ کے استاد ڈاکٹر علاء الدین خاں نے اس کی تاریخ کی طرف توجہ کی ہے اور کم از کم مضامین لکھ کر اس کے شاندار ماضی کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول کرا رہے ہیں۔

[۲۶]

شبلی کالج کی علمی و ادبی خدمات کا ایک نمونہ کالج میگزین ہے۔ آزادی کے بعد سے وہ مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ اس کے مشمولات بھی بڑے اہم ہیں اور علم و ادب کا ایک بڑا ذخیرہ اس کے صفحات میں محفوظ ہے۔ اس کے خصوصی شماروں کو اہل علم نے خاصی توجہ کی نظر سے دیکھا ہے۔ جگر نمبر، عبدالسلام ندوی نمبر، شوکت سلطان نمبر، کبیر احمد جائسی نمبر، وغیرہ کی بڑی پذیرائی ہوئی۔ اس میگزین کا تحفظ، اشاریہ اور ادبی جائزہ بھی شبلی شناسی کا ایک حصہ ہوگا۔ کالج کے اساتذہ میں بڑے نامور اشخاص شامل رہے ہیں اور ان کی بڑی عظیم الشان خدمات ہیں۔ کم لوگوں کو معلوم ہوگا کہ انور صدیقی، پروفیسر ملک زادہ منظور احمد اور آبروئے اردو جناب شمس الرحمٰن فاروقی کا نام بھی کالج کے اساتذہ میں شامل ہے۔ میجر علی حماد عباسی بھی ایک زمانہ میں کالج کی رونق تھے۔ ان کی کتاب جدید اردو تنقید پر مغرب کے اثرات بھی بے حد اہم کاوش ہے۔ میرے استاذ ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی مرحوم [۱۹۳۶-۲۰۰۵ء] ادیب، شاعر اور نقاد تھے۔ کئی کتابیں ان کے قلم سے نکلیں۔ شعری مجموعہ ''یہ داغ داغ کہانی'' بھی شائع ہوا۔ کالج کے حوالہ سے ان کی خدمات کا مطالعہ بھی ضروری ہے۔ ان کے علاوہ دیگر اساتذہ جنہوں نے علم و ادب کی بڑی خدمات انجام دیں، ان کا تذکرہ اور ان کی ادبی و تنقیدی کاوشوں کا مطالعہ بھی ضروری ہے، اس سے شبلی اور دبستان شبلی کی

کاوشوں کا ایک مرقع سامنے آجائے گا۔شبلی نیشنل کالج کی انتظامیہ، پرنسپل اور صدر شعبہ اردو ڈاکٹر شباب الدین صاحب کی توجہ ادھر مبذول کرائی جا سکتی ہے، جن کی فعالیت نے شبلی کالج میں کتابوں کی اشاعت اور سمیناروں کے ذریعہ ایک نئی ادبی فضا پیدا کی ہے۔

ان کے علاوہ بھی شبلی شناسی کے متعدد پہلو ہیں، مثلاً اہل علم وادب کے مکاتیب میں ذکر شبلی، شبلی کے ہم عصروں کی سوانح میں ذکر شبلی اور مقدمات میں ذکر شبلی وغیرہ۔مگر مذکورہ بالا موضوعات جن کا قدرے تفصیل سے ذکر کیا گیا خاص اہمیت کے حامل ہیں۔

○○○

کتابیات

کتابیات

○ **کتب**

(آ)

۱۔ آپ بیتی، میر ولایت حسین، مسلم ایجوکیشنل پریس علی گڑھ، ۱۹۷۰ء

۲۔ آثار شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دار المصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء

۳۔ آزاد کی کہانی خود آزاد کی زبانی، مولانا ابوالکلام آزاد، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۸ء

۴۔ آغاز اسلام، ترجمہ بدء الاسلام، میمونہ سلطان شاہ بانو، مطبع سلطانی بھوپال، ۱۹۱۵ء

○ (الف)

۵۔ ابر کرم حصہ اول، آقا بیدار بخت، تاج بک ڈپو لاہور

۶۔ اختر اقبال، سلطان جہاں بیگم، مطبع مفید عام آگرہ، ۱۹۱۴ء

۷۔ ادبی آئینے، پروفیسر سید سخی احمد ہاشمی، مکتبہ شاہد کراچی، ۱۹۷۴ء

۸۔ اردو ادب میں فن سوانح نگاری، الطاف فاطمہ، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی

۹۔ اردو تنقید پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، بک امپوریم پٹنہ، ۱۹۸۳ء

۱۰۔ اردو تنقید کا ارتقاء، عبادت بریلوی، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۸۸ء

۱۱۔ اردوئے معلیٰ، مرزا غالب، مجلس ترقی ادب لاہور، ۱۹۶۹ء

۱۲۔ اسلام کی عالم گیر خدمات، علامہ شبلی نعمانی، بساط ادب لاہور

۱۳۔ اسوۃ الرسول، (اول تا سوم) فوق بلگرامی، نظامی پریس لکھنؤ

۱۴۔ افادات مہدی، مہدی افادی، علی گڑھ، ۱۹۸۵ء

۱۵۔ افکار ذاکر، اختر الواسع، بیگ احساس، مکتبہ جامعہ دہلی، ۲۰۰۵ء

۱۶۔ افکار سہیل، شوکت سلطان، علی حماد عباسی، شبلی کالج اعظم گڑھ، ۱۹۵۷ء
۱۷۔ اقبال ایک تحقیقی مطالعہ، ڈاکٹر ملک حسن اختر، اقبال اکادمی پاکستان، ۱۹۹۶ء
۱۸۔ الفہرست، محمد سجاد مرزا بیگ، نظام دکن پریس حیدرآباد، ۱۹۲۳ء
۱۹۔ اقبال، عطیہ بیگم، اقبال اکادمی کراچی، ۱۹۵۶ء
۲۰۔ اقبال اور پیروی شبلی، سید افتخار حسین شاہ، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۷۸ء
۲۱۔ اقبال اور دبستان شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء
۲۲۔ اقبال اور مشاہیر، طاہر تونسوی، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۸۱ء
۲۳۔ الفاروق، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ ۲۰۱۲ء
۲۴۔ الفاروق ایک مطالعہ، پروفیسر محمد یسین مظہر صدیقی، ادارہ علوم اسلامیہ علی گڑھ، ۲۰۰۴ء
۲۵۔ المامون، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۲ء
۲۶۔ المیزان، نظیر الحسن فوق رضوی، مطبع فیض عام علی گڑھ، ۱۹۱۴ء
۲۷۔ انجمن ترقی اردو کی کہانی، مولوی غلام ربانی، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، ۱۹۳۹ء
۲۸۔ انجمن ترقی اردو ہند تاریخ اور خدمات، ڈاکٹر محمد یونس غازی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۲۰۰۸ء
۲۹۔ اورنگ زیب عالم گیر پر ایک نظر، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۹ء

○ (ب)

۳۰۔ باقیات شبلی، مشتاق حسین، آزاد کتاب گھر دہلی، ۱۹۶۴ء
۳۱۔ بزم رفتگاں (حصہ دوم) سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مکتبہ جامعہ دہلی، ۲۰۱۱ء
۳۲۔ بیاد شبلی، ڈاکٹر علاء الدین خاں، انسٹی ٹیوٹ آف آبجیکٹیو اسٹڈیز، دہلی، ۲۰۱۷ء
۳۳۔ بیان خسرو، علامہ شبلی نعمانی، الناظر پریس، لکھنؤ۔

○ (ت)

۳۴۔ تاریخ ادب اردو، جلد چہارم، حصہ دوم، ڈاکٹر جمیل جالبی، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس دہلی
۳۵۔ تاریخ افاغنہ، سید ظہور الحسن موسوی، مہتاب پریس، دہلی۔

۳۶۔ تاریخ دربار دہلی، سید ظہور الحسن موسوی، ہلالی پریس، دہلی۔
۳۷۔ تذکرہ خواتین دکن، سید ظہور الحسن موسوی، ہلالی پریس دہلی ۱۳۳۳ھ
۳۸۔ تردید الموازنہ، حسن رضا، مطبع تصویر عالم لکھنؤ۔
۳۹۔ تفہیم شبلی، ڈاکٹر ارشاد نیازی، ایم آر پبلی کیشنز دہلی، ۲۰۱۳ء
۴۰۔ تفہیم و تعبیر، پروفیسر خالد محمود، مکتبہ جامعہ دہلی، ۲۰۱۷ء
۴۱۔ تنقیدی مباحث اور شبلی کا نظام نقد، ڈاکٹر شاداب عالم، آدم پبلشرز، دہلی، ۲۰۱۳ء
۴۲۔ تنقیدیں، پروفیسر خورشید الاسلام، انجمن ترقی اردو ہند، دہلی، ۱۹۶۴ء
۴۳۔ توبۃ النصوح، ڈپٹی نذیر احمد، مرتبہ مالک رام، مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۷۶ء

○ (ج)

۴۴۔ جہاں گیر اور تزک جہاں گیری، علامہ شبلی نعمانی، وکیل ٹریڈنگ کمپنی امرت سر

○ (چ)

۴۵۔ چند ارباب کمال، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۸۳ء
۴۶۔ چند رجال اہل حدیث، مولانا ابوعلی اثری، ندوۃ المحدثین گجرانوالہ، ۱۹۸۶ء

○ (ح)

۴۷۔ حسن البیان فیما فی سیرۃ النعمان، محمد عبدالعزیز محمدی، مطبع فاروقی، دہلی، ۱۳۱۱ھ
۴۸۔ حضرت سلطان ابوسعید ابوالخیر، مقصود احمد مجددی، شاہ جہانی پریس دہلی، ۱۹۳۱ء
۴۹۔ حیات النبی، خلاصہ عنایت اللہ، تاج کمپنی کراچی
۵۰۔ حیات النذیر، افتخار عالم مارہروی، شمسی پریس دہلی، ۱۹۱۲ء
۵۱۔ حیات جاوید، خواجہ الطاف حسین حالی، مفید عام آگرہ، ۱۹۰۳ء طبع دوم
۵۲۔ حیات جاودانی، مولوی سید امجد علی اشہری، پیسہ اخبار لاہور، ۱۹۰۸ء
۵۳۔ حیات حافظ، علامہ شبلی نعمانی، رنگین پریس دہلی، ۱۹۲۳ء
۵۴۔ حیات خسرو، علامہ شبلی نعمانی، ادبی پریس لکھنؤ ۱۹۲۲ء
۵۵۔ حیات سعدی، علامہ شبلی نعمانی، خواجہ برقی پریس لکھنؤ

۵۶۔ حیات سعدی، علامہ شبلی نعمانی، مکتبہ حمیدیہ دہلی
۵۷۔ حیات شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۵ء
۵۸۔ حیات محسن، محمد امین زبیری، مسلم یونیورسٹی پریس علی گڑھ، ۱۹۳۴ء
۵۹۔ حیات وحشت، ڈاکٹر وفا راشدی، مکتبہ اشاعت اردو کراچی، ۱۹۸۲ء
۶۰۔ حیدرآباد کے شاعر حصہ دوم، آندھرا پردیش ساہتیہ اکادمی حیدرآباد، ۱۹۶۲ء

○ (خ)

۶۱۔ خاندان زبیری کنبوی (اول و دوم) حسین احمد زبیری، علی گڑھ، ۵۰-۱۹۵۱ء
۶۲۔ خطوط سرسید، سر راس مسعود، نظامی پریس بدایوں، ۱۹۳۱ء
۶۳۔ خطوط شبلی، محمد امین زبیری، ظل السلطان بک ایجنسی بھوپال
۶۴۔ خطوط مشاہیر، مولانا عبدالماجد دریابادی، تاج کمپنی، لاہور، ۱۹۴۵ء
۶۵۔ خلاصہ موازنہ انیس و دبیر، اختر لکھنوی، صدیق بک ڈپو لکھنو

○ (د)

۶۶۔ دارالمصنّفین کی تاریخی خدمات، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ، ۲۰۰۲ء
۶۷۔ دستاویز، (مصنّفین کے اپنے قلم سے) اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ، ۲۰۱۰ء
۶۸۔ دستاویزات محسن الملک، پروفیسر اقبال حسین، سر سید اکیڈمی مسلم یونیورسٹی، ۲۰۰۷
۶۹۔ دیوان وحشت، سید رضا علی وحشت، ستارہ ہند کلکتہ، ۱۹۱۰ء
۷۰۔ ڈاکٹر ابن فرید، انتظار نعیم، ادارہ ادب اسلامی ہند دہلی، ۲۰۰۶ء

○ (ر)

۷۱۔ رپورٹ کارروائی انجمن وقف علی الاولاد، علامہ شبلی نعمانی، آسی پریس لکھنؤ، ۱۹۱۱ء
۷۲۔ ردالموازنہ، میر افضل علی، مطبع تصویر عالم لکھنؤ
۷۳۔ رقاصہ، اکبر حیدری، شاہ جہانی پریس، دہلی، ۱۹۲۵ء
۷۴۔ رہنمایان ہند، نارائن پرشاد ورما، انجمن ترقی اردو دہلی، ۱۹۰۴ء

○ (ز)

۷۵۔ زندہ رود (حیات اقبال کا وسطی دور) جاوید اقبال، شیخ غلام علی، لاہور، طبع دوم، ۱۹۸۳ء

۷۶۔ زیب النساء، علامہ شبلی نعمانی، قریشی بک ہاؤس لاہور، ۱۹۲۷ء

○ (س)

۷۷۔ سرسید اور ان کے نامور رفقا، ڈاکٹر سید عبداللہ، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۹۴ء

۷۸۔ سرسید جدید ذہن کے معمار، ڈاکٹر سعود عالم قاسمی، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۲۰۱۷ء

۷۹۔ سفر نامہ روم ومصر وشام، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۹ء

۸۰۔ سوانح فیضی، علامہ شبلی نعمانی، رنگین پریس، دہلی۔

۸۱۔ سید نجیب اشرف ندوی شخصیت اور کارنامے، سید ریاست علی تاج، حیدرآباد، ۱۹۸۱ء

۸۲۔ سیرت الفاروق یعنی خلاصہ الفاروق، قریشی بک ہاؤس امرت سر، ۱۹۴۲ء

۸۳۔ سیرۃ النعمان، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء

○ (ش)

۸۴۔ شبلی اور جہان شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء

۸۵۔ شبلی ایک دبستان، ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی، مکتبہ عارفین ڈھاکہ

۸۶۔ شبلی بحیثیت مورخ، اختر وقار عظیم، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۷۹ء

۸۷۔ شبلی سخنوروں کی نظر میں، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ ۲۰۱۲ء

۸۸۔ شبلی شکنی کی روایت اور دوسرے مضامین، ڈاکٹر خالد ندیم، نشریات لاہور، ۲۰۱۷ء

۸۹۔ شبلی شناسی کے اولین نقوش، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۶ء

۹۰۔ شبلی کا ذہنی ارتقاء، سید سخی احمد ہاشمی، مجلس یادگار ہاشمی کراچی، ۱۹۹۶ء

۹۱۔ شبلی کی آپ بیتی، ڈاکٹر خالد ندیم، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء

۹۲۔ شبلی کی علمی وادبی خدمات، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، اے.ایم. یو، علی گڑھ ۲۰۱۲ء

۹۳۔ شبلی کی علمی وادبی خدمات، ڈاکٹر خلیق انجم، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، ۱۹۹۶ء

۹۴۔ شبلی معاصرین کی نظر میں، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، اردو اکادمی لکھنؤ، ۲۰۰۵ء

۹۵۔ شبلی معاندانہ تنقید کی روشنی میں، سید شہاب الدین دسنوی، انجمن ترقی اردو ہند دہلی، ۱۹۸۶ء
۹۶۔ شبلی نعمانی شخصیت اور عصری معنویت، شہاب الدین ثاقب، مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، ۲۰۱۵ء
۹۷۔ شبلی نقادوں کی نظر میں، ناز صدیقی، الیاس ٹریڈرس حیدرآباد، ۱۹۷۶ء
۹۸۔ شذرات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۴ء
۹۹۔ شعرالعجم (اول تا پنجم) علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ

○ (ص)

۱۰۰۔ صد پارہ دل، عبدالحلیم شرر، مرتبہ سید ظہور الحسن، قومی پریس دہلی، ۱۹۱۸ء

○ (ع)

۱۰۱۔ علامہ شبلی کی قرآن فہمی، ڈاکٹر سعود عالم قاسمی، دارالنوادر لاہور، ۲۰۰۵ء
۱۰۲۔ علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۳ء
۱۰۳۔ علم الاقتصاد، علامہ اقبال، اقبال اکادمی پاکستان، طبع دوم
۱۰۴۔ علم الکلام، علامہ شبلی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۳ء

○ (ف)

۱۰۵۔ فتح مکہ، علامہ شبلی نعمانی، اسلامی پبلشنگ کمپنی لاہور
۱۰۶۔ فتوح الشام منظوم، سید عبدالرزاق کلامی، نول کشور لکھنؤ، ۱۹۰۰ء
۱۰۷۔ فکر اقبال، خلیفہ عبدالحکیم، بزم اقبال لاہور، طبع ششم، ۱۹۸۸ء
۱۰۸۔ فلسفہ تعلیم، مترجمہ خواجہ غلام الحسنین پانی پتی، ہلالی پریس، دہلی
۱۰۹۔ فہرست ممبران و وزیٹران محمڈن اینگلو اورینٹل ایجوکیشنل کانفرنس مقام امرت سر، مطبع ریاض ہند، علی گڑھ، ۱۹۰۹ء

○ (ق)

۱۱۰۔ قوس حمزہ پوری ایک تعارف، ناوک حمزہ پوری، حمزہ پور گیا، ۱۹۸۲ء

○ (ک)

۱۱۱۔ کاروان خیال، مولانا ابوالکلام آزاد، مدینہ پریس بجنور۔

۱۱۲۔ کتابیات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دار المصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۱ء
۱۱۳۔ کلام شبلی، علامہ شبلی نعمانی، کریمی پریس لاہور
۱۱۴۔ کلیات باقیات شعر اقبال، ڈاکٹر صابر کلوروی، اقبال اکادمی پاکستان، ۲۰۰۴ء
۱۱۵۔ کلیات شبلی (اردو) علامہ شبلی نعمانی، دار المصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء
۱۱۶۔ کلیات شبلی (فارسی) علامہ شبلی نعمانی دار المصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۴ء
۱۱۷۔ کلیات مکاتیب اقبال، (اول تا پنجم) سید مظفر حسین برنی، اردو اکادمی دہلی
۱۱۸۔ کیا قافلہ جاتا ہے، نصر اللہ خاں، بزم ادب کراچی، ۲۰۱۷ء

○ (گ)

۱۱۹۔ گاہے گاہے باز خواں......، ڈاکٹر شعیب اعظمی، الکتاب انٹرنیشنل دہلی، ۲۰۰۷ء

○ (ل)

۱۲۰۔ لکچرز کا مجموعہ جلد دوم، ڈپٹی نذیر احمد، مطبع مفید عام آگرہ، ۱۹۱۸ء

○ (م)

۱۲۱۔ مثنوی صبح امید، علامہ شبلی نعمانی، حقیقت پریس لکھنؤ، ۱۹۲۱ء
۱۲۲۔ مجالس محدث العصر، مولانا فیصل احمد ندوی، ادارہ احیائے کتاب وسنت لکھنؤ، ۲۰۱۸ء
۱۲۳۔ مجموعہ لکچرز واسپیچز حصہ اول، نواب محسن الملک، مرتبہ ملک فضل الدین، نول کشور پریس لاہور
۱۲۴۔ مجموعہ نظم شبلی اردو، سید ظہور الحسن موسوی، مہتاب پریس، دہلی
۱۲۵۔ مجموعہ نظم شبلی اردو، سید قربان علی بسمل، شاہ جہانی پریس دہلی، ۱۳۴۸ھ
۱۲۶۔ مراسلات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، دار المصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۶ء
۱۲۷۔ مسلمانوں کی گذشتہ تعلیم، علامہ شبلی نعمانی، قومی پریس لکھنؤ، ۱۸۸۸ء
۱۲۸۔ مشاہیر کے خطوط بنام مولانا سید سلیمان ندوی، دار المصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۲ء
۱۲۹۔ مطالعات شبلی، پروفیسر اشتیاق احمد ظلی، دار المصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۱۶ء
۱۳۰۔ مطالعات ومشاہدات، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۰ء
۱۳۱۔ مغل اور اردو، نصیر حسین خیال (مزید تفصیل درج نہیں)

۱۳۲۔ مقالات احسان، مرزا احسان احمد، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۶۸ء
۱۳۳۔ مقالات شبلی (اول تا ہشتم) علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ
۱۳۴۔ مقالات یوم شبلی، حافظ نذر احمد، مسلم اکیڈمی لاہور، ۱۹۶۸ء
۱۳۵۔ مقدمات عبدالحق، عبادت بریلوی، اعتقاد پبلشنگ ہاؤس دہلی، ۱۹۷۵ء
۱۳۶۔ مکاتیب شبلی (اول و دوم) علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ طبع جدید
۱۳۷۔ مکتوبات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ، اعظم گڑھ، ۲۰۱۲ء
۱۳۸۔ منتخبات حکیم قاآنی، شیخ جان محمد الہ بخش، لاہور ۱۹۴۱ء
۱۳۹۔ موازنہ انیس و دبیر، علامہ شبلی نعمانی، دارالمصنّفین اعظم گڑھ، ۲۰۰۴ء
۱۴۰۔ موازنہ انیس و دبیر کا تنقیدی مطالعہ، سید ظہور الاسلام، بھوپال بک ہاؤس بھوپال، ۱۹۸۶ء
۱۴۱۔ موازنہ انیس و دبیر مطالعہ، محاسبہ، تقابل، ڈاکٹر ارشاد نیازی، الائنس پبلی کیشن دہلی، ۲۰۰۰ء
۱۴۲۔ موج نسیم، وحیدہ نسیم، غضنفر اکیڈمی پاکستان کراچی، ۱۹۸۴ء
۱۴۳۔ مولانا شبلی اردو کے بہترین انشاپرداز، سعید انصاری، الناظر لکھنو
۱۴۴۔ مولانا شبلی ایک تنقیدی مطالعہ، نیر جہاں، مکتبہ جامعہ دہلی، ۱۹۹۹ء
۱۴۵۔ مولانا شبلی بحیثیت سیرت نگار، ڈاکٹر ظفر احمد صدیقی، ناشر مصنف، ۲۰۰۵ء
۱۴۶۔ مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں، عبداللطیف اعظمی، شبلی اکادمی دہلی، ۱۹۴۵ء
۱۴۷۔ میں اور میری ادبی صلاحیت، مرزا احسان احمد، معارف پریس اعظم گڑھ، ۱۹۷۱ء
۱۴۸۔ میں ہم اور ادب، ڈاکٹر ابن فرید، ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، ۱۹۷۷ء

○ (ن)

۱۴۹۔ نبوی اخلاق (پشتو) علامہ شبلی نعمانی، مترجمہ عزیز الرحمٰن سیفی، کندھار، ۲۰۰۹ء
۱۵۰۔ نذیر احمد شخصیت اور کارنامے، ڈاکٹر اشفاق احمد اعظمی، مکتبہ شاہراہ دہلی، ۱۹۷۴ء
۱۵۱۔ نواب مؤید الملک سر سید علی امام، محمد انیس الرحمٰن انیس، علامہ سید سلیمان ندوی اکیڈمی کراچی، ۱۹۸۳ء
۱۵۲۔ نوادرات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ادبی دائرہ اعظم گڑھ، ۲۰۱۷ء

○ (و)

۱۵۳۔ وفیات اہل قلم، ڈاکٹر منیر احمد سلیچ، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء

۱۵۴۔ وفیات مشاہیر اردو، بشارت علی خاں فروغ، دہلی، ۲۰۰۰ء

۱۵۵۔ وفیات معارف، ڈاکٹر سہیل شفیق، قرطاس کراچی، ۲۰۱۴ء

○ (ی)

۱۵۶۔ یاد ایام، مولانا ضیاء الحسن علوی، ادارہ انیس اردو الہ آباد، ۱۹۵۹ء

۱۵۷۔ یاد رفتگاں، مولانا سید سلیمان ندوی، دار المصنّفین اعظم گڑھ، ۱۹۹۳ء

۱۵۸۔ یاد رفتگاں (اول و دوم) ماہر القادری، مرکزی مکتبہ اسلامی دہلی،

۱۵۹۔ یادگار شبلی، شیخ محمد اکرام، ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور، ۱۹۹۴ء

۱۶۰۔ یادگار رولا، برق موسوی، مکتبہ سعدی حیدرآباد، ۱۹۴۱ء

○ **(رسائل: خصوصی شمارے)**

۱۶۱۔ ادیب، علی گڑھ، شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، مدیر ڈاکٹر ابن فرید

۱۶۲۔ سب رس، حیدرآباد، خواجہ حمید الدین شاہد نمبر، دسمبر ۲۰۰۱ء

۱۶۳۔ صبا، حیدرآباد، شبلی نمبر، ۱۹۵۸ء، مدیر سلیمان اریب

۱۶۴۔ معارف اعظم گڑھ، سلیمان نمبر، ۱۹۵۵ء، مدیر شاہ معین الدین احمد ندوی

۱۶۵۔ معارف، اعظم گڑھ، شبلی نمبر ۲۰۱۴ء، مدیر پروفیسر اشتیاق احمد ظلی

○ **(رسائل: عام شمارے)**

۱۶۶۔ ادبی دنیا، لاہور، جون ۱۹۴۶ء

۱۶۷۔ ادیب، الہ آباد، اگست ۱۹۱۰ء

۱۶۸۔ البلاغ، کلکتہ، ۱۷؍دسمبر ۱۹۱۵ء، ۲۴/دسمبر ۱۹۱۵ء

۱۶۹۔ الندوہ، لکھنؤ جون ۱۹۰۵ء، جنوری ۱۹۰۶ء، اپریل ۱۹۰۷ء، جولائی ۱۹۰۸ء، اکتوبر ۱۹۰۸ء
جولائی ۱۹۰۹ء، فروری ۱۹۱۲ء، مارچ ۱۹۱۲ء

۱۷۰۔ الوقت، گورکھپور، ۱۰؍اکتوبر ۱۸۹۴ء

۱۷۱۔ انسٹی ٹیوٹ گزٹ، علی گڑھ- اکتوبر۱۹۰۳ء، ۲۴؍جولائی ۱۹۰۷ء

۱۷۲۔ ترجمان الاسلام بنارس جنوری تا مارچ ۱۹۹۵ء

۱۷۳۔ تعمیر حیات، لکھنؤ، اگست ۲۰۱۷ء

۱۷۴۔ شاہراہ علم، اکل کوا، ستمبر ۲۰۱۷ء

۱۷۵۔ صحیفہ، لاہور، جنوری ۱۹۷۱ء

۱۷۶۔ علی گڑھ میگزین، ۱۹۵۷ء

۱۷۷۔ مباحث، لاہور، جنوری تا جون، ۲۰۱۲ء

۱۷۸۔ معارف اعظم گڑھ، جون ۱۹۱۸، اپریل ۱۹۳۷ء، جنوری ۱۹۵۰ء، اکتوبر تا دسمبر ۱۹۷۱ء،
جنوری ۱۹۷۲ء، مئی ۲۰۱۵ء، اپریل ۲۰۱۸ء، مئی ۲۰۱۸ء

ooo

اشاریہ

نقوش شبلی

ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

اشخاص

کتب ورسائل

○○○

مقامات

○○○

مصنف کی دیگر مطبوعات

۱۔ اسہل التجوید ۱۹۸۶ء
۲۔ علم الترتیل ۱۹۹۶ء
۳۔ تذکرۃ القراء ۱۹۹۶ء
۴۔ سید سلیمان ندوی بحیثیت مورخ ۲۰۰۱ء
۵۔ دار المصنّفین کی تاریخی خدمات ۲۰۰۲ء
۶۔ اشاریہ ماہنامہ الرشاد اعظم گڑھ ۲۰۰۴ء
۷۔ عظمت کے نشاں ۲۰۰۵ء
۸۔ ساحلوں کے شہر میں ۲۰۰۶ء
۹۔ شاہ معین الدین احمد ندوی ۲۰۰۷ء
۱۰۔ متعلقات شبلی ۲۰۰۸ء
۱۱۔ مطالعات ومشاہدات ۲۰۱۰ء
۱۲۔ کتابیات شبلی ۲۰۱۱ء
۱۳۔ شبلی: سخنوروں کی نظر میں ۲۰۱۲ء
۱۴۔ مکتوبات شبلی ۲۰۱۲ء
۱۵۔ کتابیں حصہ اول ۲۰۱۲ء
۱۶۔ کتابیں حصہ دوم ۲۰۱۳ء
۱۷۔ آثار شبلی ۲۰۱۳ء
۱۸۔ علامہ شبلی کے نام اہل علم کے خطوط ۲۰۱۳ء
۱۹۔ یگانہ روزگار مولانا عبدالسلام ندویؒ ۲۰۱۳ء
۲۰۔ عکس واثر ۲۰۱۳ء
۲۱۔ شبلی شناسی کے سو سال ۲۰۱۴ء
۲۲۔ کتابیات مجیب ۲۰۱۴ء
۲۳۔ شذرات شبلی ۲۰۱۴ء
۲۴۔ اقبال اور دبستان شبلی ۲۰۱۵ء
۲۵۔ قرائے عظام اوران کی علمی.... ۲۰۱۴ء
۲۶۔ شبلی اور جہان شبلی ۲۰۱۵ء
۲۷۔ مراسلات شبلی ۲۰۱۶ء
۲۸۔ محبت نامے ۲۰۱۷ء
۲۹۔ نوادرات شبلی ۲۰۱۷ء
۳۰۔ شبلی خودنوشتوں میں ۲۰۱۸ء
۳۱۔ قد اور سائے ۲۰۱۹ء
۳۲۔ علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں ۲۰۱۹ء

ترتیب، تدوین، تراجم

۱۔ اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر ۱۹۹۹ء
۲۔ موازنہ انیس ودبیر ۲۰۰۴ء
۳۔ کاروان رفتگاں ۲۰۰۸ء
۴۔ تاریخ اعظم گڑھ ۲۰۱۱ء
۵۔ اسفار مجیب ۲۰۱۴ء
۶۔ متاع رفتگاں ۲۰۱۵ء
۷۔ رحمت عالم (ہندی ترجمہ) ۲۰۰۹ء

مکتبہ دارالمصنّفین شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ

مکتبہ جامعہ۔ اردو بازار جامع مسجد، دہلی۔۶

NOQOOSH-E-SHIBLI

By

Dr. Mohammad Ilyas Azmi



شبلی کی فکری اسالیب کی بازیافت ایک عمومی مطالعہ کا مطالبہ کرتی ہے اور شبلی شناسی کی تشویق پیدا کرتی ہے۔ شبلی کے قلم کی ساحری اور دلنوازی سے بے نیازی ممکن نہیں۔ سو سال گذرنے کے باوجود شبلی کے اسالیب بیان کی پیروی ناموس ادب کی پہچان بنی ہوئی ہے۔ ہم شکر گذار ہیں کہ ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے شائقین شبلی کے لیے ایک کشادہ راہ ہموار کی ہے اور علامہ کو نئے انداز نظر سے پرکھنے میں ہماری رہبری کی ہے۔ پھر عہد حاضر میں شبلی کی باز آفرینی کے لیے ایک نشاۃ ثانیہ کا آغاز ہوا ہے اور شبلی کے افکار کی تشکیل و ترتیب نو کی طرف ذی فکر اہل قلم کی توجہ نے ہماری حیرت افزائی میں اضافہ کیا ہے۔ پوری صدی شبلی و اقبال کے تصورات اور فکر سے فیضان حاصل کرتی رہی ہے۔ یہ نئی صدی ہی نہیں بلکہ طلوع صبح محشر تک شبلی کے صدق وصفا کی یہ گذرگاہ ہماری کامرانیوں کی نشاندہی کے لیے کافی ہے۔

(پروفیسر) عبدالحق

(ماہر اقبالیات)

ADBI DAIRA

AZAMGARH

E-mail : azmi408@gmail.com

Mob : +91-9838573645

₹ 400/-